ادارہ افادات اشرفیہ دوبگّا ہردوئی روڈ لکھنؤ

آداب افتاء واستفتاء

مع

علمی وفقہی مکاتبت ومکالمت

افادات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

﴿انتخاب وترتیب﴾

محمد زید مظاہری ندوی

استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ناشر

ادارہ افادات اشرفیہ دوبگّا ہردوئی روڈ لکھنؤ

تفصیلات

نام کتاب.................. آداب افتاء واستفتاء مع علمی وفقہی مکاتبت ومکالمت
افادات.................. حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ
انتخاب وترتیب...... محمد زید مظاہری ندوی
سن اشاعت........... ۱۴۳۴ھ
صفحات.................. ۴۴۸
قیمت.................. ۲۵۰/روپئے
ویب سائٹ........... www.alislahonline.com

ملنے کے پتے

☆ دیوبند وسہارنپور کے تمام کتب خانے
☆ افادات اشرفیہ دوبگا ہردوئی روڈ لکھنؤ
☆ مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ
☆ مکتبہ رحمانیہ ہتورا، باندا، پن کوڈ: ۲۱۰۰۱
☆ مکتبۃ الفرقان نظیر آباد لکھنؤ
☆ مکتبہ اشرفیہ ۳۶، محمد علی روڈ بمبئی ۹

اجمالی فہرست

آداب افتاء واستفتاء

فہرست

آداب افتاء واستفتاء

افادات: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

باب ۱ فتاویٰ کی اہمیت ونزاکت

باب۲ آداب المفتی

فصل

فصل

فصل

باب۳ آداب الفتویٰ

فصل (۲)

فصل (۳)

فصل (۴)

فصل (۵)

فصل (۶)

فصل (۷)

فصل (۸)

فصل (۹)

فصل (۱۰)

باب ۴

فصل

باب ۵

باب ٦

مکاتبت نمبر (۲)

مکاتبت نمبر ۳

مکاتبت نمبر۴

مکاتبت نمبر۵ دو فرعی مسئلوں سے متعلق

باب ۷ علمی وفقہی مکالمت

باب ۸ آداب استفتاء

فصل (۱)

فصل (۲)

فصل (۳)

ضمیمہ آداب المستفتی

از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے علوم ومعارف اور تحقیقات وافادات کے متعلق علامہ سید سلیمان ندویؒ کا اظہار خیال اور حضرت تھانویؒ کی علامہ سید سلیمان ندویؒ کو وصیت

علامہ سید سلیمان ندوی اپنے آخری سفر تھانہ بھون کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا مسعود عالم ندوی کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

حضرت مولانا تھانویؒ کی خدمت میں ۱۱ر جولائی کو رخصت ہوکر بھوپال روانہ ہوا، چلتے وقت ارشاد ہوا جاؤ خدا کے سپرد کیا، ۔۔۔۔۔اور ارشاد ہوا کہ میری کتابوں کے اقتباسات رسالوں اور کتابوں کی صورت میں شائع کرو، یہ گویا میری آئندہ تکمیل کی راہ بتائی گئی۔ (مکاتیب سید سلیمان ص ۱۴۶)

حضرت عارف باللہ جناب ڈاکٹر عبدالحئی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی آخری ملاقات میں علامہ سید سلیمان ندویؒ سے ارشاد فرمایا تھا: میری تصانیف سے انتخابات شائع کرتے رہنا۔

(مآثر حکیم الامت ص ۱۶۵)

علامہ سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

بڑی ضرورت تھی کہ اس اصلاح وتجدید کے خاکے کو جس کو ایک مصلحِ وقت اپنی تصنیفات ورسائل میں سپرد کر گیا ہے اور جن پر زبان کی کہنگی اور طریقِ ادا کی قدامت کا پردہ پڑا ہے، ان کو موجودہ زمانہ کے مذاق اور تقریر وتحریر کے نئے انداز کی روشنی میں اجاگر کیا جائے۔ (مقدمہ تجدید کامل ص ۳۳)

رائے عالی

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

فاضل عزیز مولوی محمد زید مظاہری ندوی مدرس جامعہ عربیہ ہتورا (بارك الله فی حیاته وفی افادته) نے جو حضرت حکیم الامت کے افادات وارشادات اور تحقیقات ونظریات کو مختلف عنوانوں اور موضوعات کے ماتحت اس طرح جمع کر رہے ہیں کہ حضرت کے علوم وافادات کا ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) تیار ہوتا جارہا ہے......

ان خصوصیات اور افادیت کی بنا پر عزیز گرامی قدر مولوی محمد زید مظاہری ندوی نہ صرف تھانوی اور دیوبندی حلقہ کی طرف سے بلکہ تمام سلیم الطبع اور صحیح الفکر حق شناسوں اور قدر دانوں کی طرف سے بھی شکریہ اور دعاء کے مستحق ہیں۔

اور اسی کے ساتھ اور اس سے کچھ زیادہ ہی داعی الی اللہ اور عالم ربانی مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی سرپرست جامعہ عربیہ ہتورا باندہ (یوپی) اس سے زیادہ شکریہ اور دعاء کے مستحق ہیں جن کی سرپرستی اور نگرانی، ہمت افزائی اور قدر دانی کے سایہ میں ایسے مفید اور قابل قدر کام اور ان کے زیر اہتمام دانش گاہ اور تربیت گاہ میں انجام پارہے ہیں۔ اطال الله بقائه وعمم نفعه جزاه الله خيرا.

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلی ۱۷/ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ

دعائیہ کلمات

عارف باللہ حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ
بانی جامعہ عربیہ ہتورا باندہ (یوپی)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

حکیم الامت حضرت مولانا ومقتدانا الشاہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بزمانۂ طالب علمی اکابر امت نے اس کا اندازہ لگالیا تھا کہ آگے چل کر مسند ارشاد پر متمکن ہوکر مرجع خلائق ہوں گے اور ہر عام وخاص ان کے فیوض وبرکات سے متمتع ہوں گے۔ چنانچہ حضرت اقدس کے کارہائے نمایاں نے اساطین امت کے اس خیال کی تصدیق کی، کہنے والے نے سچ کہا ہے۔ ’’قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید‘‘

خداوند قدوس نے حضرت والا کو تجدید اور احیاء سنت کے جس اعلیٰ مقام پر فائز فرمایا تھا اس کی اس دور میں نظیر نہیں۔

آج بھی مخلوق حضرت کی تصنیفات وارشادات عالیہ اور مواعظ حسنہ سے فیضیاب ہورہی ہے، حضرت کے علوم ومعارف کے سلسلہ میں مختلف عنوان سے ہندو پاک میں کام ہورہا ہے، لیکن بجاطور پر کہا جاسکتا ہے کہ اللہ پاک نے محض اپنے فضل سے عزیزی مولوی مفتی محمد زید سلمہ مدرس جامعہ عربیہ ہتورا کو جس نرالے انداز سے کام کی توفیق عطا فرمائی اس جامعیت کے ساتھ ابھی تک کام نہیں ہوا تھا اس سلسلہ کی تین درجن سے زائد ان کی تصانیف ہیں۔ بارگاہ ایزدی میں دعا ہے کہ اس کو قبولیت تامہ عطا فرمائے اور مزید توفیق نصیب فرمائے۔

احقر صدیق احمد غفرلہ

خادم جامعہ عربیہ ہتورا باندہ (یوپی)

مبارک سلسلہ اور سلیقے کا کام

رائے عالی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا مفتی محمد زید صاحب مظاہری ندوی کو اللہ تعالیٰ نے بزرگوں سے تعلق اور ان کے ملفوظات وہدایات کو ان کی افادیت کے پیش نظر مرتب کرنے اور جمع کرنے سے خصوصی دلچسپی عطاء فرمائی ہے، چنانچہ انہوں نے بزرگوں کے افادات کو مختلف رسالوں اور کتابوں کی صورت میں جمع کیا ہے اور یہ کام اس سلیقہ سے کیا ہے کہ اس میں تحقیقی وعلمی انداز بھی پایا جاتا ہے اور دینی وتربیتی مقصد بھی پورا ہوتا ہے۔

ہم کو مسرت ہے کہ مولانا مفتی محمد زید صاحب جنہوں نے حضرت تھانویؒ کے ملفوظات اور اصلاح وارشاد کے سلسلے میں مختلف نوعیّتوں کی وضاحت پر مشتمل مضامین کو علیحدہ علیحدہ شائع کرنے کا ایک مبارک سلسلہ شروع کیا ہے۔

مولانا زید صاحب نے دینی افادات کا، اصلاح دین کا حامل بہت مفید لٹریچر جمع کردیا ہے، اصلاح باطن ودرستگیٔ احوال کے لئے یہ انتخاب اور لٹریچر انشاء اللہ مفید ثابت ہوگا۔

مفتی محمد زید صاحب کی یہ علمی کوششیں قابل ستائش ہیں جو ایک طرف تو ایک اچھا علمی کام ہے اور دوسری طرف اس کی دینی واخلاقی افادیت ہے۔

محمد رابع حسنی

ایک بڑا اور قابل مبارک باد کام

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ قاضی شریعت امارت شرعیہ بہار

حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ تجدید وحکمت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں تفقہ فی الدین کی دولت عطاء فرمائی تھی، وہ علوم اجتماعی میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے، افراد اور جماعتوں کے مسائل وامراض اور اسلام کی روشنی میں ان کے علاج میں ان کی کوئی نظیر نہیں رکھتا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اپنی دقت نظر، فکر عمیق، تفقہ، مسائل حاضرہ اور جدید حوادثات ومشکلات پر اپنی اصولی نظر، نیز جامعیت کے اعتبار سے انتہائی ممتاز شخصیت رہے ہیں، مختلف موضوعات پر ان کے تحقیقی افادات ان کی ہزاروں صفحات پر مشتمل تحریروں میں بکھرے ہوئے ہیں، ضرورت تھی کہ ان افادات کو موضوعات کے مطابق جمع کر دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے یہ قیمتی خدمت عزیز گرامی قدر مولانا محمد زید صاحب کے مقدر میں رکھی تھی، انہوں نے مخدوم گرامی حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحب دامت برکاتہم کی سرپرستی میں اس عظیم کام کو انجام دینا شروع کیا۔

مجھے موصوف کی صلاحیتوں کا اندازہ فقہ اکیڈمی کے سیمیناروں میں ہوا، اور مجھے یہ توقع قائم ہوئی کہ موصوف کچھ بڑا کام انجام دیں گے، الحمد للہ کہ مولانا موصوف اس توقع پر پورے اترے، اور انہوں نے حضرت تھانویؒ کے افادات کے متعدد مجموعے مختلف موضوعات پر مرتب فرمائے، میں مولانا محمد زید صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں اور یہ امید کرتا ہوں کہ تحقیقی کام کرنے والے ادارے اس مجموعہ (اسلامی حکومت ودستور مملکت عقل ونقل کی روشنی میں) کا خلاصہ عربی انگریزی میں بھی منتقل کریں گے جس سے اس کا فائدہ عام ہوگا۔ انشاء اللہ۔ مجاہد الاسلام قاسمی ۱۰ محرم ۱۴۱۷ھ

جدت وقدامت کا سنگم

اظہار خیال

حضرت مولانا سید سلمان صاحب حسینی ندوی دامت برکاتہم

عمید کلیۃ الدعوہ والاعلام، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا محمد زید مظاہری ندوی کی جدت وقدامت نے انہیں دوآتشہ بنادیا ہے، یعنی طرز قدیم کے بزرگوں کے ایک ایک ملفوظ کی تحقیق وترتیب جدید میں مصروف ہیں، اور جدید وسائل کتابت وطباعت سے کام لے کر اپنی تصنیفی خدمات کو انہوں نے تحقیقی مقام تک بھی پہونچادیا ہے، اور دیدہ زیب بھی بنادیا ہے۔

مولانا مفتی محمد زید مظاہری ندوی کا تعارف ہی اہل علم میں حضرت تھانویؒ کی نسبت سے ہے، اس میں شک نہیں کہ تھانویؒ علوم ومعارف کی نسبت سے وہ کسی ''متخصص'' اور ''ڈاکٹر'' سے کم نہیں، یقیناً تھانویؒ علوم کی ترتیب وتحقیق پر انہیں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری ملنی چاہئے۔

مولانا مفتی محمد زید مظاہری ندوی ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کہاں کہاں سے تنکے جمع کر کے ایک آشیانہ تیار کردیا۔

اللہ تعالیٰ اس سعی سعد کو قبولیت سے نوازے، اور مرتب کو علمی موتیوں کی تلاش میں کامیابیوں سے ہمیشہ بہرہ ور فرمائے۔ آمین۔

سلمان حسینی ندوی

علمی وتحقیقی کام

واقعہ یہ ہے کہ آپ کی توجہ اس قدر مفید بلکہ نہایت اہم کام کی طرف مبذول ہوئی ہے کہ اس کے لئے خداوندی رہنمائی اور ذکاوت نافعہ کے بغیر آمادگی نہیں ہوسکتی تھی یہ محض اللہ کا فضل ہے، ہوسکتا ہے کہ ناواقف کی نظر میں یہ کام اتنا اہم نہ ہو جتنا فی نفسہ ہے لیکن حقیقۃً کسی بڑے تحقیقی وعلمی کام سے کم اہم نہیں۔

(حضرت مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی دامت برکاتہم)

مشکل ترین کام، ترتیب نہیں تصنیف

تمہاری کتابوں کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی یہ آسان کام نہیں ہزاروں صفحات کا مطالعہ کرنا، ان کا فن اور موضوع مقرر کرنا، پھر ان کی ترتیب دینا بہت مشکل کام ہے، یہ کتابیں محض تمہاری ترتیب نہیں بلکہ تصنیف ہیں، اللہ کا شکر ادا کرو۔

(حضرت مولانا محمد یونس صاحب مدظلہ العالی شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور)

اہم اور نافع کام

اہم اور نافع کام کی توفیق آپ کو منجانب اللہ ملی، مسرت ہے، بارک اللہ وتقبل اللہ۔ (خود بھی) منتفع ہوا، طلبہ اور اہل علم کو یہ مضامین سنائے گئے۔

(محی السنہ حضرت مولانا الشاہ ابرار الحق صاحب مدظلہٗ العالی)

(چشمۂ فیض) مجھے خوشی ہے کہ جناب مولانا زید صاحب مجدہم نے محنت شاقہ برداشت کر کے بکھرے ہوئے مضامین کو موضوع وار عناوین کے تحت جمع کر دیا ہے اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو خاص طور پر طلباء اور اہل مدارس کو اس چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کی توفیق عطاء فرمائے۔ (مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمۃ الکتاب

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی تصانیف اور آپ کے ملفوظات ومواعظ رشد وہدایت کا گنجینہ، حکمت ومعرفت کا خزینہ، طالبین دین کے لیے ایک نعمت عظمیٰ، شریعت کی روح اور طریقت کی جان ہیں، جن سے خلق اللہ کو بڑا فائدہ پہنچا، ان کے مطالعہ سے ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔

امت محمدیہ میں یہ شرف کسی خطیب کو حاصل نہیں کہ اس کے تمام تر مواعظ وملفوظات قلمبند ومحفوظ ہوں، یہ خصوصیت حکیم الامت ہی کو حاصل ہے اور یہ حضرتؒ کی کرامات میں سے ہے کہ تصنیفات کی طرح من وعن آپ کے مواعظ وملفوظات بھی محفوظ ہیں۔

بفضلہٖ تعالیٰ مجھے بچپن ہی سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات خصوصاً مواعظ وملفوظات کے دیکھنے اوران سے مستفید ہونے کی سعادت نصیب ہوئی، میری نظر جب ان بکھرئے ہوئے گراں قدر موتیوں پر پڑی، اسی وقت ایک خیال مسلط ہوگیا کہ کیوں نہ ان جواہرات کی روشنی سے امت کو روشناس کرایا جائے۔

تصانیف تو چونکہ موضوع وارعناوین کے تحت ایک خاص انداز پر مرتب ہوتی ہیں جن میں مضامین تلاش کرنا آسان ہوتا ہے مگر مواعظ وملفوظات کا انداز اس سے مختلف ہوتا ہے ان میں مضامین منتشر اور بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، عنوانات ندارد، موضوعِ سخن بدلتا رہتا ہے، ذہن میں آیا کہ کیوں نہ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو یکجا کرکے ہر موتی کو اپنی صنف میں لاحق کرکے ایک قلعہ تعمیر کیا جائے اور مواعظ و

ملفوظات کوفن وار عنوانات کے تحت ترتیب دے دیا جائے تاکہ استفادہ کی راہ آسان ہو سکے، اللہ کا نام لے کر حبیب الامت عارف باللہ حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب باندویؒ کی زیرنگرانی کام شروع کر دیا، الحمدللہ مختلف موضوعات سے متعلق متعدد مجموعے تیار ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں، پیش نظر رسالہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں حضرت تھانویؒ کے ان علمی وفقہی مضامین کو مرتب کیا گیا ہے جو اصولی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کا تعلق خاص طور پر اہل علم وار باب افتاء اور علمی وتحقیقی اور تصنیفی کام کرنے والوں سے ہے۔

بلاشبہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی یہ علمی وفقہی تحقیقات جن کو احقر نے حضرت تھانویؒ کی سینکڑوں تصانیف، فتاویٰ اور ملفوظات و مواعظ سے چن چن کر جمع کیا ہے، جن میں بہت سے ایسے فقہی نادر اصول بھی ہیں جن کی ایک فقیہ ومفتی کو قدم قدم پر ضرورت پیش آ سکتی ہے، مثلاً فقہ کی تعریف، فقیہ ومفتی کے اوصاف جن سے اس کو متصف ہونا ضروری ہے، قیاس ورائے کا فرق، تقلید صحابی کی اہمیت، اور قول صحابی کی حجیت، اجتہاد وتقلید کی بابت قول محقق اور قول معتدل، اتباعِ سنت نبوی کے درجے، سنت وبدعت کی حکیمانہ تشریح، اقسام واحکام، رسم والتزام سے متعلق اصولی مباحث، فتویٰ نویسی کے ضروری آداب، تصنیف وتالیف کے ضروری اصول اور طریقۂ کار، اہم اصطلاحات کی تعریفات خصوصاً کفر واسلام، نفاق وایمان کی تعریف اور تکفیرِ مسلم کی بابت ضروری احتیاط اور اس کے حدود نیز اس کے علاوہ دیگر اہم دینی وفقہی اور اصولی مباحث احقر نے اللہ کی توفیق سے جمع کئے ہیں۔

احقر کا تأثر وتجربہ یہ ہے کہ کسی فقیہ ومفتی ومصنف اور علمی وتحقیقی کام کرنے والے کے لیے ان مباحث سے واقفیت اشد ضروری ہے، اس کے بغیر وہ قدم قدم پر

لغزشیں کھا سکتا ہے، اوران مباحث سے واقفیت کے بعد وہ حدود پر قائم رہ سکتا ہے۔

بلاشبہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے یہ علمی وفقہی مضامین ایسے ہیں کہ ان کے مطالعہ سے تفقہ پیدا ہوتا ہے، جدید مسائل کے حل کرنے میں بھی رہنمائی ملتی ہے، جس درجہ کے اجتہاد کی ضرورت ہے وہ اجتہادی شان اور فقہی بصیرت بھی ان کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔

ہر چند کہ دور جدید میں مشائخ اور مفتیوں کی کمی نہیں ہے، جگہ جگہ مشائخ موجود، دارالافتاء قائم ہیں، نااہلیت کے باوجود ہر شخص اجتہاد کرنے، مسائل میں رائے زنی کرنے اور فتویٰ لکھنے کو تیار بیٹھا ہے، خواتین کے لیے بھی تربیت افتاء کے ادارے قائم ہیں، لیکن مشاہدہ ہے کہ بڑی تعداد مفتیوں اور مفتیات کی ایسی بھی ہے جن کو فقہ سے مس نہیں، فقہی بصیرت نہیں، مطالعہ محدود، صلاحیت ناقص، استعداد کمزور، شان فقاہت سے عاری، نتیجتاً ضلوا فاضلوا کا مصداق ہیں۔

احقر نے ان مضامین کو اسی غرض سے جمع کیا ہے تاکہ اس نوع کے علمی وفقہی اور افتاء کا کام کرنے والوں میں جو نقائص وخامیاں رہ جاتی ہیں ان کی تلافی کسی درجہ میں حضرت تھانویؒ کے ان مضامین سے ہوسکے، احقر نے اس نوع کے مضامین کو چار کتابوں میں جمع کیا ہے۔ (۱) فقہ حنفی کے اصول وضوابط مع احکام السنہ والبدعہ (۲) آداب افتاء واستفتاء (۳) اجتہاد وتقلید کا آخری فیصلہ (۴) مسئلۂ تکفیر (۵) آداب تصنیف وتالیف مع آداب خط وکتابت، وصحافت۔

اب سے تقریباً ۲۰ سال قبل یہ تینوں کتابیں شائع ہوئی تھیں الحمدللہ اہل علم اور ارباب افتاء نے اس کی قدر فرمائی، افتاء کی تربیت حاصل کرنے والوں کے مطالعۂ نصاب میں داخل کی گئیں اوران کے پڑھنے کی ہدایت اور تاکید کی گئی، اس سے احقر کو حوصلہ ملا، اس عرصہ میں احقر کو مزید علمی تحقیقات دوران مطالعہ ملیں، ان اضافات کو بھی

تیسری اشاعت میں کتاب کے اخیر میں بے ربط لاحق کر دیا گیا تھا، بیس سال قبل ہاتھ کی کتابت اور طباعت کی وجہ سے اس میں بہت سے نقائص بھی رہ گئے تھے، اس مرتبہ الحمد للہ کمپیوٹر سے کتابت کرا کر ان اضافات کو بھی اپنے اپنے مقام پر لاحق کر دیا گیا، نقائص کو بھی دور کر دیا گیا، اس طرح یہ دو کتابیں (فقہ حنفی کے اصول وضوابط مع احکام السنہ والبدعہ اور آداب افتاء واستفتاء مع آداب تصنیف وتالیف) منظر عام پر آ رہی ہیں۔

آداب افتاء و استفتاء میں چند اضافے بھی کئے گئے ہیں مثلاً حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی علمی وفقہی مراسلت ومکالمت جو بعض اکابر فقہاء یا عقلاء اور وکلاء سے ہوئی جن کے مطالعہ سے فقہی بصیرت اور شان تفقہ پیدا ہونے میں مدد ملتی ہے۔

تصنیفی وتالیفی کام کرنے والوں اور مفتیان کرام کے لیے ان کتابوں کا بار بار مطالعہ انشاء اللہ ضرور ان کی صلاحیت میں نکھار پیدا کرے گا اور قدم قدم پر مفید ومعین اور رہنما ثابت ہوگا، اللہ تعالیٰ محض اپنے کرم سے اس معمولی کوشش کو قبول فرمائے اور اہل علم وارباب افتاء کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین☆

محمد زید مظاہری ندوی غفرلہ

استاذ حدیث وفقہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۶؍رمضان ۱۴۳۲ھ

☆ کوئی صاحب علم جو عربی ادب میں مہارت رکھتے ہوں ان کتابوں کی تعریب کر دیں تو انشاء اللہ بڑا علمی اور مفید کارنامہ ہوگا، عرب علماء بھی اکابر علماء ہند کی ان علمی وفقہی تحقیقات سے مستفید ہو سکیں گے۔ وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

آداب افتاء واستفتاء

مع

علمی وفقہی مکاتبت ومکالمت

افادات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب وترتیب

محمد زید مظاہری ندوی

استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العٰلمین

اللھم صل علیٰ سیدنا ومولانا محمد

وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدالمرسلین
محمدوعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین

باب ۱

فتاویٰ کی اہمیت ونزاکت

مسائل فقہیہ کا معاملہ بہت نازک ہے

فقہ کا فن بڑا ہی نازک ہے میں اتنا کسی چیز سے نہیں ڈرتا جتنا اس سے ڈرتا ہوں جب کوئی مسئلہ یا فتوی سامنے آتا ہے دور دور کے احتمالات ذہن میں آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ میں اب فتاوی میں دوسروں کا حوالہ دیتا ہوں اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ بعضے اسی کے اندر زیادہ بے باک ہیں حالانکہ اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے [1]

فرمایا: آج کل مسائل فقہی میں لوگ بہت دلیر ہیں، سب سے زیادہ مجھ کو فقہ ہی میں بولتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے مسائل کا بہت نازک معاملہ ہے اس میں ہرگز ہر شخص کو دخل نہ دینا چاہئے [2]

اعمال کا درجہ متعین کرنا بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے

فرمایا: اعمال کا درجہ متعین کرنا بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے حضرات فقہاء نے بہت احتیاط کی ہے۔ جہاں ضروری ہوتا ہے متعین بھی فرماتے ہیں جہاں بچ سکتے ہیں بچنا چاہئے مثلاً احب إلی فرمادیا امام محمد اکثر اکرہ فرماتے ہیں اور بقدر ضرورت تو یہ بھی گویا فتویٰ ہی ہے جو سمجھنے والے تھے سمجھ گئے مکروہ تحریمی اس کو قرار دیا۔ [3]

[1] الافاضات الیومیہ ص ۲۵۸ ج جزء ثانی [2] الافاضات ۹۴/۱۔ [3] حسن العزیز ۱۶۸/۱۔

عالم اور مفتی کی ذمہ داری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ سائل کو ضرور جواب دو، بشرطیکہ وہ عمل کے لئے سوال کرے، یا جن علوم کا حاصل کرنا شرعاً فرض ہے ان میں محض علم کے لئے نہ کہ بحث کے لئے (دریافت کرے) چنانچہ ارشاد ہے:

من سئل عن علم علمه ثم كتمه ألجم يوم القيامة بلجام من النار[1]

جس شخص سے کوئی ایسی علمی بات پوچھی جائے جس کو وہ جانتا ہو لیکن وہ اس کو چھپائے تو اس کو دوزخ کی لگام ڈالی جائے گی۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح جواب دینے کی بھی تاکید اور اس کے خلاف پر وعید فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے:

من أُفتي بغير علم كان اثمه' على من افتاه (ابوداؤد، مشکوٰۃ ص ۳۵)

(جس شخص کو بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا اس کا گناہ اسی پر ہوگا جس نے فتویٰ دیا ہے)

(مستفتی کی ذمہ داری ہے کہ) ایک مرتبہ سوال کرنے سے جواب نہ ملے تو خاموش نہ بیٹھ رہے، بلکہ اسی عالم سے یا اور کسی عالم سے پھر دریافت کرے، البتہ اگر یہ کوشش کرتا رہا اور (مفتی کی طرف سے) جواب نہ ملا، یا غلط ملا تو اس (سائل) کو گناہ نہ ہوگا، بلکہ دونوں صورتوں میں مفتی کے ذمہ گناہ رہا جیسا کہ دونوں حدیثیں ابھی گذریں، اسی کی طرف اشارہ کرنے کے واسطے (حدیث پاک میں) لفظ سوال فرمایا لفظ **علم** نہیں فرمایا۔

اگر کسی سائل نے مسئلہ پوچھا لیکن مسئول عنہ (مفتی) نے جواب نہ دیا یا غلط جواب دیا (تو اس کا ذمہ دار مفتی ہے) پس اگر (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم **شفاء العی السوال** کے بجائے **شفاء العی العلم** فرماتے) تو شفا ہونے کا حکم ان صورتوں کو شامل نہ ہوتا بلکہ شفاء کی صرف ایک ہی صورت ہوتی یعنی جب کہ مسئول عنہ (مفتی) جواب دے اور

---

[1] ابوداؤد، ترمذی، مشکوٰۃ ص ۳۴

صحیح جواب دے اور اب یعنی لفظ السوال ارشاد فرمانے میں تینوں صورتوں کو یہ حکم شفاء شامل ہو گیا، پس خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ سائل ہر حال میں شفاء یابوں میں داخل ہو گیا۔[1]

مسائل میں غلطیوں کے ذمہ دار اہل فتاوی ہیں

فرمایا جن مسائل کی غلطی دقیق ہے اس میں عوام الناس تو معذور ہوں گے ان کو کچھ گناہ نہ ہوگا اہل فتویٰ کی گردن نپے گی، یہی حدیث سے معلوم ہوتا ہے **من افتی بغیر علم فانما اثمه علی من افتاه** ۔اس حصر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عوام کو کچھ گناہ نہ ہوگا۔[2]

مسئلہ کا جواب دینا بہت مشکل کام ہے

فرمایا کہ میں بڑا ڈرتا ہوں مسئلہ بتلانے سے کانپتا ہوں، اس قدر کوئی کام مشکل نہیں معلوم ہوتا جس قدر مسائل کا بتلانا مشکل معلوم ہوتا ہے اور آج کل لوگوں کو اسی میں زیادہ جرأت ہے۔[3]

مسئلہ بتلاتے اور فتوی دیتے وقت کس چیز کا استحضار ضروری ہے

فرمایا کہ ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب مجھ سے کوئی مسئلہ دریافت کرتا ہے تو اس کے جواب کے قبل میں یہ تصور کرتا ہوں کہ اگر قیامت کا میدان ہو وہاں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کر کے مجھ سے یہ سوال کیا جاتا تو میں کیا جواب دے سکتا ہوں اور اس وقت جو جواب دوں گا تو اس جواب کی دلیل بھی مجھ سے پوچھی جائے گی، کہ یہ کہاں سے کہا، جب یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ اگر دلیل پوچھی گئی تو اپنے جواب کی دلیل بھی حق

---

[1] وعظ شفاء العی ص ۲۳۰، ۲۳۱ [2] کلمة الحق ص: ۱۲۱ [3] الافاضات الیومیه

تعالیٰ کے سامنے دے سکوں گا اس وقت جواب دیتا ہوں ورنہ جواب ہی نہیں دیتا، بہت عجیب مراقبہ ہے مجھ کو پسند آیا۔[1]

جج ووکلاء اور اہل فتویٰ وعلماء کا فرق

اس استحضار حساب کی وجہ سے علماء وغیر علماء میں بہت فرق ہے کیا آپ نے کسی بیرسٹر یا وکیل کو یہ بھی دیکھا ہے کہ اس نے اپنی کسی غلطی کا اعلان کیا ہو حالانکہ کیا ان سے غلطی ہی نہیں ہوتی، ضرور ہوتی ہے لیکن کہیں آپ نے دیکھا ہے کہ کسی نے اپنی غلطی کو شائع کیا ہو کہ اس کی غلطی سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے اور میں ایسے علماء آپ کو دکھلاتا ہوں جنہوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ فلاں مسئلہ میں ہم سے غلطی ہوگئی ہے ہم اس سے رجوع کرتے ہیں کیونکہ امت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہے، اگر وہ ایسا نہ کریں تو امت گمراہ ہو جائے اور یہ اس کے ذمہ دار اور اللہ تعالیٰ کے یہاں مؤاخذہ دار ہوں۔[2]

ضروری دستور العمل

الحمدللہ میرے یہاں ایک سلسلہ ہے ''ترجیح الراجح'' کا جس میں جتنی غلطیاں مجھ سے ہوتی ہیں، ان کو وقتاً فوقتاً سال کے ختم پر شائع کرتا رہتا ہوں، اگر کوئی بچہ بھی متنبہ کردے اور مجھے اطمینان ہو جائے کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی ہے تو بلا تامل تسلیم کر لیتا ہوں اور اپنی رائے سے رجوع کر لیتا ہوں۔☆

لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ مزاج میں استقلال نہیں کبھی کچھ فتوی دیتے ہیں کبھی کچھ اور کیا یہ اچھا ہوتا کہ جہل پر جما رہتا؟ اور اگر غلطی معلوم ہو جائے پھر بھی وہی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکتے رہنا چاہئے تا کہ امت گمراہ ہو؟۔[3]

---

[1] کلمة الحق ص ۴۶ [2] وعظ شفاء العی ملحقہ تدبیر توکل ص ۲۳۰ [3] الافاضات الیومیہ ۱۰/۵۹۔
☆ تفصیل کے لئے دیکھئے ص ۱۸۷ تا ص ۲۰۴

باب۲

آداب المفتی

مفتی کے بعض اوصاف وشرائط

یہ بھی ضروری ہے کہ فتویٰ دینے والا ایسا شخص ہو جس نے کسی ماہر استاد سے فن حاصل کیا ہو اور اہل بصیرت اس کو فقہ میں مہارت تامہ حاصل ہونے پر شہادت دیتے ہوں۔

لما قال الشامی فی عقود رسم المفتی فان المتقدمین شرطوا فی المفتی الا جتہاد وھذا مفقود فی زماننا فلا اقل من ان یشترط فیه معرفة المسائل بشروطھا وقیودھا التی کثیرا ما یسقطونھا ولا یصرحون بھا اعتمادا علیٰ فھم المتفقھة، وکذالابدمن معرفة عرف زمانه واحوال اھله والتخریج فی ذالک علیٰ استاذ ماھر[1]

یعنی متقدمین نے مفتی ہونے کے لئے اجتہاد کی شرط لگائی ہے اور یہ زمانہ میں مفقود ہے پس کم از کم اس میں یہ شرط تو ضرور رہے گی کہ مسائل سے ان کی شروط وقیود سمیت واقف ہو جن کو فقہاء اکثر چھوڑ دیتے ہیں اور اہل فن کے فہم پر بھروسہ کی وجہ سے بالتصریح بیان نہیں کرتے۔[2]

اس شرط کی اہمیت اس درجہ کیوں؟

وجہ یہ ہے کہ بعض مسائل ذی اجزاء ہوتے ہیں اور ان اجزاء میں سے کوئی

---

[1] عقود رسم المفتی ص۴۶ [2] الحیلة الناجزة ص۴۶

جز وکسی باب سے تعلق رکھتا ہے اور کوئی کسی باب سے، اب اگر سب کو ایک جگہ لکھا جاوے تو کتاب کی ترتیب میں فرق آتا ہے اور جو غرض ہے ترتیب سے یعنی مسئلہ کے نکالنے میں سہولت ہو وہ فوت ہوتی ہے، اس واسطے وہ اجزاء الگ الگ بابوں میں لکھنے پڑتے ہیں، اب ظاہر ہے کہ جس کی نظر کل بابوں پر نہ ہو وہ اس مسئلہ کو صحیح طور پر کیسے حل کر سکتا ہے، یہ ایسی بات ہے کہ جاہل تو جاہل اس میں کچے پکے مولویوں کو بھی دھوکہ لگ جاتا ہے اور اکثر دھوکہ کھانے کی وجہ یہی ہوتی ہے۔

میں اس کی مثال میں ایک مسئلہ پیش کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ فقہ میں کنایاتِ طلاق کے باب میں لکھا ہے کہ لفظ اختاری بھی کنایات میں سے ہے اور کنایات کا حکم یہ ہے کہ اگر ان کے ساتھ نیت طلاق کی ہو تو طلاق بائن ہو جاتی ہے، کنایات کے باب میں تو اتنا ہی مذکور ہے کہ اختاری بھی کنایات میں سے ہے، تو حسب قاعدہ مذکورہ ظاہرا حکم اس کا یہ ہوگا کہ اگر اس لفظ کو خاوند نے بہ نیت طلاق کہا تو طلاق بائن ہو جائے گی لیکن اس میں ایک شرط بھی ہے جو باب التفویض میں مذکور ہے وہ یہ کہ صرف اختاری کہہ دینے سے طلاق نہ ہوگی بلکہ اس میں شرط یہ ہے کہ اس کے جواب میں عورت بھی یہ کہے کہ اخترت تب طلاق ہوگی اور یہ جزو ''باب تفویض الطلاق'' میں لکھا ہے، مطلب یہ ہے کہ اختاری طلاق کا لفظ ہے مگر ایقاع کا نہیں بلکہ تفویض کا یعنی اگر تو چاہے تو طلاق لے لے، تو اگر خاوند نے اس نیت سے کہا ہے اور اس کو منظور یہ ہے کہ عورت اگر چاہے تو طلاق لے سکتی ہے تب تو یہ تفویضِ طلاق ہوگی اور اگر عورت نے کچھ نہ کہا تو کچھ بھی نہیں، اب دیکھئے کہ جس کی نظر تمام ابواب پر نہ ہو اور صرف باب کنایات ہی دیکھا ہو اس سے جب یہ مسئلہ پوچھا جاوے گا کہ کسی نے اپنی عورت سے اختاری بہ نیت طلاق کہہ دیا ہے تو فوراً کہہ دے گا کہ طلاق بائن ہوگئی، اب نتیجہ کیا ہوگا کہ عدت گذرنے کے بعد یہی مفتی صاحب اس

عورت کو دوسرے کے لئے حلال کریں گے کیونکہ اب اس میں کیا شبہ ہے جب طلاق ہوگئی اور عدت بھی گذر گئی تو نکاح جس سے چاہے کرسکتی ہے، حالانکہ نفس الامر میں حکم یہ ہے کہ اگر خاوند نے یہ لفظ تفویض طلاق کے لئے کہا ہے اور عورت نے اس کے بعد **اخترت نفسی** نہیں کہا تو اس سے کچھ بھی نہیں ہوا، نہ طلاق ہوئی نہ خاوند کے نکاح سے خارج ہوئی نہ دوسرے سے نکاح کرسکتی ہے، اوران مفتی صاحب نے اس کو دوسرے کے لئے حلال کردیا تو یہ حرام کو حلال کرنا ہوا اور پہلے خاوند کے نکاح سے باہر کریں گے اوراس عورت کواس پر حرام کہیں گے یہ تحریم حلال ہوئی، ذرا سے لفظ **اختـــاری** کے حکم میں فقہ پر پورا عبور نہ ہونے کی وجہ سے ایسی غلطی ہوئی، ایسی نظیریں بکثرت ہیں، بعض بعض مسائل کو کئی کئی باب میں دیکھنا پڑتا ہے کوئی جزو کہیں ملتا ہے اور کوئی جزو کہیں۔

ایک مسئلہ اٹھارہ سال سے عدالت میں پیش تھا اور طے نہیں ہوتا تھا منصف (جج) صاحب حیران ہوگئے تھے بالآخر منصف صاحب نے اس کو دیوبند بھیجا، مولانا استادنا نے اس کو میرے سپرد کیا مجھے بہت ابواب میں دیکھنا پڑا، تب اس کا جواب لکھا گیا، جب جواب عدالت میں پہنچا تو ایک دن میں منصف نے فیصلہ کردیا اور پہلے وہی منصف پریشان ہوگیا تھا اور کوئی فیصلہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔[1]

فتوی لکھنے کا اہل کون شخص ہے؟

فتویٰ لکھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے چاہے کتابیں بھی ختم ہوچکی ہوں ہاں اپنے بزرگوں کے سامنے کسی نے یہ کام کیا ہو اوران بزرگوں نے پسند بھی کیا ہو اس کو البتہ جائز ہے، یوں پھر بھی کوئی لغزش یا غلطی ہوجائے کبھی کبھار وہ اور بات ہے، وہ

---

[1] وعظ ''الصالحون'' ملحقہ اصلاح اعمال ص ۷۰

بشریت ہے تو یہ شخص اہل ہے فتویٰ لکھنے کا، جیسے مطب کرنے کا وہی اہل ہوتا ہے جس نے کسی ماہر اور تجربہ کار طبیب کے مطب میں نسخے لکھ لکھ کر مریضوں کا علاج کیا ہو اوراس کے علاج کو اس طبیب نے پسند کیا ہو اسکے نسخے جواب طبیبوں کو دکھلائے جاتے ہیں تو اگر کوئی معاند نہ ہوگا تو وہ کہے گا کہ با قاعدہ نسخہ ہے[1]

مفتی کے واسطے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے زمانہ کے عرف اور اہل زمانہ کے احوال سے بخوبی واقف ہو اور کسی ماہر استاد سے فتویٰ دینے کا طریقہ بھی حاصل کیا ہو[2]

اردوداں طبقے وکلاء اور عقلاء کو فقہ وفتویٰ کی محض اردو کی کتابوں کو دیکھ کر فتویٰ دینے کی اجازت کیوں نہیں؟

آج کل وکلاء بھی ہدایہ کا امتحان دیتے ہیں، ہدایہ کا تو کیا دیتے ہدایہ کے ترجمہ کا امتحان دیتے ہیں، آج کل ہر علم وفن کے ترجمے ہوگئے ہیں منجملہ ان کے فقہ بھی ہے، ہدایہ کا بھی ترجمہ ہوگیا ہے، مگر ترجمہ کی خوبی سنئے! میں پھر مکرر کہتا ہوں کہ ترجموں سے کام نہیں چل سکتا کام اگر چلتا ہے تو علماء کی جوتیاں سیدھی کرنے (یعنی شاگردی اختیار کرنے) سے چلتا ہے، اب ترجمہ کی خوبی کا ایک واقعہ سنئے!

ایک شخص نے اپنی بی بی کو تین طلاق دیدی اس کا حکم مشہور ہے کہ طلاق مغلظ ہوجاتی ہے اور اب کوئی صورت رجوع کی یا دوبارہ نکاح کی باقی نہیں رہتی سوائے اس کے کہ حلالہ کیا جاوے جس کو کوئی گوارا نہیں کرتا لیکن اس عورت کے گھر والے سر تھے کہ ہم تو اس کو اسی شوہر کی بی بی بنائیں گے۔

میرے پاس مسئلہ پوچھنے آئے میں نے کہا: اب وہ بالکل حرام ہے کوئی صورت باقی نہیں (سوائے حلالہ کے) جب وہ مولویوں سے مایوس ہوئے تو

[1] رمضان فی رمضان ص: ۳۲۹، ملحقہ فضائل صوم وصلوۃ۔ [2] الحیلۃ الناجزہ ص ۴۶

خود کتابیں دیکھنا شروع کیں، جوئندہ یابندہ مسئلہ مل گیا ان کی خواہش کے موافق، ایک کتاب مل گئی، وہ ترجمہ ہے کسی کتاب کا ایک مسٹر کا کیا ہوا، سنئے گا تو معلوم ہوگا کہ اس میں کیا گت بنی مسئلہ کی۔

اندھے کی کھیر والا قصہ ہوگیا کہ ایک مادرزاد نابینا تھے لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے ایک دن ایک لڑکے نے کہا حافظ جی آج ہمارے یہاں آپ کی دعوت ہے، کہا کیا کھلاؤ گے؟ کہا کھیر کہا کھیر کیسی ہوتی ہے؟ کہا سفید کہنے لگے سفید کس کو کہتے ہیں؟ کہا جیسے بگلا پوچھا بگلا، کیسا ہوتا ہے؟ لڑکے نے ہاتھ کھڑا کرکے اور پونچے کو جھکا کر اس کی شکل بنا کر بتایا کہ بگلا ایسا ہوتا ہے، حافظ جی نے ٹٹولا تو ہاتھ کھڑا ہوا اور ٹیڑھا معلوم ہوا، کہا میں دعوت قبول نہیں کرتا، ٹیڑھی کھیر کیسے کھاؤں گا، یہ حلق میں کیسے اترے گی، دیکھئے کھیر کی شرح کی گئی سفیدی اور سفید کی بگلے سے اور بگلے کی ٹیڑھے ہاتھ سے تو نوبت کہاں تک پہنچ گئی کہ حافظ جی کھیر سے ڈر گئے کہ ایسی ٹیڑھی کھیر کیسے کھائی جائے گی، کیا گت بنی کھیر کی، یہی گت بنی ہے دین کی آج کل کے ترجموں سے۔

غرض وہ حضرت وہ ترجمہ لے کر میرے پاس آئے کہ اس میں ایک فصل اس بیان میں تھی کہ فلاں فلاں شخص کی طلاق نہیں پڑتی منجملہ ان کے اس میں لکھا تھا کہ متعجب کی طلاق نہیں پڑتی پھر اس شخص کو جس نے طلاق دی تھی تعجب بنانے کیلئے ایک واقعہ بیان کیا کہ طلاق کی بناء یہ ہوئی ہے کہ میاں بی بی اور ماں میں کسی بات پر جھگڑا ہوا ماں نے میاں سے شکایت کی اس کو بی بی کی اس خلافِ توقع حرکت پر تعجب ہوا اور تعجب کی حالت میں طلاق دے دی تو تعجب کی حالت میں طلاق دی گئی اور کتاب کھول کر دکھائی کہ بحالت تعجب طلاق واقع نہیں ہوتی، میں نے کہا یہ مسئلہ بالکل غلط لکھا ہے اور لطف یہ کہ حوالہ بھی فقہ کی کتابوں کا دیا ہوا ہے، پھر میں نے غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ حوالہ تو

صحیح ہے مگر ترجمہ میں غلطی ہوئی، ساری خرابی ترجمہ کی ہے، اصل کتاب میں یہ ہے کہ مدہوش کی طلاق نہیں پڑتی، مدہوش اس متحیر کو کہتے ہیں جس کو اتنا ہوش نہ ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں مثلاً سرسام میں بیہوش ہو یا نیند میں ہو اور ہوش حواس ایسے خراب ہو گئے ہوں کہ مطلق تمیز نہ ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، مترجم نے مدہوش کا ترجمہ کہیں متحیر دیکھا اور متحیر کا ترجمہ متعجب سے کر دیا اس سے مسئلہ کچھ سے کچھ ہو گیا، یہ بالکل اسی کی نظیر ہوئی یا نہیں کہ کھیر کی شرح کی گئی سفیدی اور سفیدی کی بگلے سے اور بگلے کی ٹیڑھے ہاتھ سے، نتیجہ یہ ہوا کہ کھیر ٹیڑھی ہوگئی، یہ ان ترجموں کی حالت ہے جو بڑی لیاقت والوں کے کئے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کے ترجموں کا تو کیا پوچھنا ہے جو اتنی لیاقت بھی نہیں رکھتے، اب فرمایئے کہ جو لوگ بطور خود کتاب بینی کا شوق رکھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں یا نہیں وہ تو ایسے ہی فتوے دیں گے کہ تین طلاق کے بعد بھی عورت حلال ہے یہ دین ہوا یا بے دینی؟ اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ تحلیل حرام کی نوبت آ گئی اس طرح تو جس چیز کو چاہو حلال کرلو اور جس چیز کو چاہو حرام، یہ دین ہوا یا لونڈوں کا کھیل؟ [1]

سرکاری اسکول کے سند یافتہ مولوی فاضل بھی اس کام کے اہل نہیں

چونکہ اس زمانہ میں فتنہ وفساد کا دور دورہ ہے اور ہر شخص علم ولیاقت کا مدعی ہے اس لئے علماء کے انتخاب میں نہایت احتیاط اور کامل غور وخوض کی ضرورت ہے، وہ لوگ جو محض کہیں سرکاری اسکول کے سند یافتہ ہو کر مولوی یا مولوی فاضل وغیرہ کہلاتے ہیں یا اردو فارسی کے رسائل دیکھ کر عوام میں مولوی مشہور ہو جاتے ہیں وہ اس کام کے لئے کافی نہیں [2]

---

[1] وعظ الصالحون ص ۷۰ ملحقہ اصلاح اعمال [2] الحیلۃ الناجزۃ ص ۲۸

ایسے مولویوں کا بھی فتویٰ معتبر نہیں جن کو فقہ میں عبور حاصل نہ ہو

فتویٰ وہی شخص دے سکتا ہے جو فقہ پر پورا حاوی ہو، علم کا کمال جب ہوتا ہے جب آدمی فن کا محیط ہو، اور یہ بات بڑی مشق سے اور علماء کے پاس رہنے سے اور ملکہ تامہ اور ذوق صحیح پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

صاحبو! کوئی علم ایسا نہیں جو بدون احاطہ آجاوے، کسی فن کی دوچار باتیں جاننے سے کوئی اس فن کا عالم نہیں کہا جاسکتا اور اس فن کے بارہ میں اس کی تحقیق مستند نہیں کہی جاسکتی اور ایسے آدمی کی تحقیق پر عمل کرنا اس فن پر عمل کرنا نہیں کہا جاسکتا، دیکھئے! اردو کی ایک کتاب طب کی دیکھ لینے سے آدمی طبیب نہیں کہلایا جاسکتا اور طب کے بارہ میں اس کی تحقیق مستند نہیں ہوسکتی اور اس کی تحقیق پر عمل کرنے سے علاج کرنے کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا، جس شخص نے ایسے طبیب سے علاج کرایا ہو اور اس کو آرام نہ ہوا ہو اس کو کوئی یوں نہیں کہے گا کہ اس نے علاج تو بہت کرالیا اب اس کی تقدیر ہے، اس کو ہر شخص یہی کہے گا کہ میاں باقاعدہ علاج کراؤ، کسی طبیب کے پاس جاؤ، اپنی جان کے کیوں دشمن ہوئے ہو یہ بھی کوئی علاج ہے؟ اسی طرح فقہ بھی ایک علم ہے اس کی ایک آدھ کتاب پڑھ لینے یا دیکھ لینے سے کوئی فقیہ نہیں ہوسکتا اور نہ اس کا فتویٰ معتبر ہوسکتا ہے اور نہ اس سے فتویٰ پوچھ کر عمل کرنے سے کوئی مؤاخذہ سے بری ہوسکتا ہے، ایسا نام کا فقیہ (زبردست) فاش غلطیاں کرے گا، مگر اب تو یہ حالت ہے کہ فتویٰ پوچھنے والے مفتی کا ماہر ہونا تو کیا دیکھتے وہ تو یہ بھی نہیں دیکھتے کہ جس سے فتویٰ پوچھ رہے ہیں اس نے فقہی کتابیں بھی پڑھی ہیں یا نہیں، بس اتنا سن لیا کہ یہ بھی مدرسہ میں رہتے ہیں، بس ان سے فتویٰ پوچھنا شروع کردیا، منشا اس کا دین کے طرف سے لاپروائی ہے کہ جو الٹا سیدھا چاہا کرلیا، اور ضابطے کی کارروائی کرنے کے لئے ایک پڑھے لکھے سے پوچھ بھی لیا۔ (وعظ الصالحون ملحقہ اصلاح اعمال ص ۷۰)

اردو داں پڑھی لکھی ایک عورت کے فتوے کا حال

کانپور میں ایک لوہار تھے، انہوں نے قربانی کے لئے ایک ایسا بکرا تجویز کیا کہ جس میں سب ہی عیب تھے، ایک شخص نے کہا کہ میاں ایسا جانور کیوں ذبح کرتے ہو؟ لوہار بولا واہ صاحب ہماری بیوی صاحبہ کا فتویٰ ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے، اس شخص نے کہا ذرا ہم کو بھی دکھلاؤ، آپ کی بیوی نے کہاں سے فتویٰ دیا ہے، لوہار گھر گیا اور بیوی سے ذکر کیا کہ حضور کے فتوے کو بعض لوگ نہیں مانتے، ذرا انہیں بھی قائل کردو، وہ اتفاق سے اردو پڑھی ہوئی تھی، اس نے فوراً اردو کا شرح وقایہ نکال کر دکھلایا کہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ جس جانور کے تہائی سے کم دم، کان، ناک وغیرہ کٹی ہوں وہ جائز ہے، اس بکری میں چونکہ ہر چیز تہائی سے کم کٹی ہوئی ہے، اور یہ عیب مؤثر نہیں لہٰذا جائز ہے، اس شخص نے کہا کہ بھائی ہم شرح وقایہ تو سمجھتے نہیں علماء کے پاس چلو اور یہ جانور ان کو دکھلا لو پھر وہ جو حکم دیں اس پر عمل کرو، لوہار کہنے لگا کہ بس صاحب ہم کو تو ہماری بیوی کا فتویٰ کافی ہے، کسی عالم کو دکھلانے کی ضرورت نہیں، بس اس لوہار کو قربانی کا صرف نام کرنا تھا۔[1]

---

[1] سنت ابراہیم ص ۳۶

فصل

اللہ ایسا عالم ومفتی نہ بنائے

ایسے عالم ومفتی مستحق تعزیر و مستحق قتل ہیں

(۱) آج کل تو بعضے علماء بھی ایسے ہی ہوتے ہیں ''المورٰہ''میں ایک عورت نے ایک عالم سے پوچھا کہ کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ شوہر سے بغیر طلاق کے علیحدگی ہوجائے، وہ عورت اپنے کسی آشنا سے نکاح کرنا چاہتی تھی اور شوہر طلاق نہ دیتا تھا تو اس ظالم نے کہا ہاں ایک صورت ہے کہ تو کافر ہوجا (نعوذ باللہ منہ) کفر سے بدوں طلاق ہی کے نکاح ٹوٹ جائے گا، پھر بعد عدت کے مسلمان ہوجانا اور جس سے چاہے نکاح کرلینا، مگر اس کمبخت نے کفر خرید کر بھی مسئلہ ناتمام بتلا دیا کیونکہ یہ تو مسئلہ ہے کہ ارتداد سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی حاکمِ اسلام کو یہ حکم بھی ہے کہ اس عورت کو اسلام پر اور اسی پہلے مرد سے نکاح کرنے پر مجبور کرے، ارتداد کے بعد یہ عورت مرتدہ کسی اور مرد سے نکاح نہیں کرسکتی۔

اگر کوئی عورت نکاح توڑنے کے لئے مرتد ہوجائے اس کو اسلام پر مجبور کرکے پہلے ہی شوہر کے ساتھ نکاح کرنے پر مجبور کیا جائے گا وہ کسی دوسرے سے نکاح نہیں کرسکتی پس اس عالم کا یہ کہنا غلط تھا کہ کفر کے بعد تو جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے، وہ مولوی تو فوراً ہی کافر ہوگیا کیونکہ رضا بالکفر کفر ہے خواہ اپنے کفر سے رضا ہو یا غیر کے کفر سے۔

یعنی اگر کوئی شخص اپنے لئے کفر کو پسند نہ کرے مگر دوسرے کے کافر ہونے سے راضی ہو تو خواہ دوسرا کافر ہو یا نہ ہو مگر یہ راضی ہونے والا فوراً ہی کافر ہوگیا اگر

اسلامی حکومت ہوتی اور مولوی صاحب اپنے اس فعل پر مقر ہوتے تو ان مولوی صاحب کو قتل کیا جاتا کیونکہ مرد کو ارتداد کے بعد زندہ نہیں رکھا جاتا، بلکہ اگر وہ دوبارہ اسلام لے آئے تو فبہا ورنہ تین دن کے بعد قتل کر دیا جاتا ہے، مگر عورت ارتداد کے بعد قتل نہیں کی جاتی، بلکہ اس کو قید میں رکھ کر اسلام لانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔[1]

(۲) دہلی میں ایک صاحب نے سہرہ کے جواز کا فتوی دیا اس طرح کہ سہرہ باندھنے میں کیا کیا افعال ہوتے ہیں، سہرہ سامنے لٹکتا ہے اور پھولوں کا بنا ہوا ہوتا ہے، پھول سونگھنا سنت ہے، اس میں تو کسی کو کلام نہیں، پھر اگر کسی نے ہاتھ میں لے کر سونگھنے کے بجائے الٹا لٹکا کر سونگھ لیا تو اس میں کیا قباحت لازم آئی، یوں سونگھ لیا تو کیا اور ووں سونگھ لیا تو کیا؟ ہر حال میں سنت ہی رہا، پھر کیا خرابی ہوئی سہرہ باندھنے میں بلکہ سہرہ تو عین سنت ہوا، دیکھئے دلیل باقاعدہ موجود ہے اسی طرح ہر مدعا کے لئے دلیل بنالی جاتی ہے۔[2]

(۳) ایک اور مولوی صاحب کا قصہ ہے کہ اس نے ساس کو حلال کر دیا تھا کسی شخص نے ایک عورت سے شادی کی تھی پھر ساس پر دل آ گیا، تو ایک غیر مقلد عالم کے پاس گیا اور کہا مولوی صاحب کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ ساس سے نکاح حلال ہو جائے کہا ہاں! بتلا کیا دے گا؟ اس نے کچھ سو دو سو روپئے دینا چاہا کہا اتنے میں یہ فتویٰ نہیں لکھ سکتا، واقعی ایمان فروشی بھی کرے تو دنیا کچھ تو ہو غرض ہزار پر معاملہ طے ہوا اور فتویٰ لکھا گیا، وہ فتویٰ میں نے بھی دیکھا ہے، اس میں لکھا تھا کہ ساس بیشک حرام ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ ساس کسے کہتے ہیں، ساس کہتے ہیں منکوحہ کی ماں کو اور منکوحہ وہ ہے جس سے نکاح صحیح منعقد ہوا ہو، اور اس شخص کی عورت چونکہ جاہل ہے اور جاہل عورتوں کی زبان سے اکثر کلمات کفریہ نکل جاتے ہیں اس لئے

[1] اصلاح ذات البین ملحقہ آداب انسانیت ص ۳۵۸ [2] وعظ الصالحون

ضرور ہے کہ اس کے منہ سے بھی کوئی کلمہ کفریہ نکلا ہوگا اور نکاح کے وقت اس کو کلمے پڑھائے نہیں گئے، اس لئے یہ مرتدہ ہے اور مرتدہ کے ساتھ نکاح صحیح نہیں ہوتا لہٰذا یہ عورت منکوحہ نہیں ہے تو اس کی ماں ساس بھی نہیں پس اس کی ماں سے نکاح درست ہے، رہا یہ کہ وہ منکوحہ کی ماں نہیں تو موطوءہ کی ماں تو ہے جس سے حرمت مصاہرت کا مسئلہ متعلق ہے تو یہ ابوحنیفہ کا اجتہادی مسئلہ ہے جو ہم پر حجت نہیں، حرمت مصاہرت کو اس نے غیر مقلدی کی مد میں اڑادیا، اور ساس کو منکوحہ کی تکفیر سے اڑادیا اور یہ سب ترکیبیں ہزار روپے نے سکھلائیں۔[1]

غلط مسئلہ بتانے اور غلط فتویٰ دینے والا ملعون ہے

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر لعنت کرے جو غیر اللہ کے واسطے ذبح کرے اور وہ شخص ملعون ہے جو کسی اندھے کو رستہ بچلادے (یعنی غلط راستہ بتلادے) روایت کیا اس کو مسلم اور رزین نے۔ مختصراً

فائدہ: حدیث میں راہ سے اندھے کو بچلانے (یعنی غلط راستہ بتلانے) کی ملعونیت مصرح ہے اور ظاہر ہے کہ آخرت کی راہ دنیا کی راہ سے زیادہ اہم ہے اور اس کا اعمیٰ راہ دنیا کے اعمیٰ سے زیادہ اشد واحوج الی الہدایہ ہے۔ جب اس اعمیٰ ظاہر کو راہِ ظاہر سے بچلانے والا ملعون ہے تو اعمیٰ باطن کو (غلط مسئلہ بتلاکر) راہ باطن سے بچلانے والا کس قدر ملعون ہوگا۔[2]

---

[1] وعظ اصلاح ذات البین ملحقہ آداب انسانیت ص ۳۵۸، ۳۵۷

[2] (التکشف عن مهمات التصوف ص:۳۸۲)

زَلُّ الْعَالِمِ زَلُّ الْعَالَمِ

اللہ ایسے علماء اور مفتیوں سے بچائے

ابھی حال ہی کا قصہ ہے کہ ایک صاحب اپنی ساس پر مفتوں ہو گئے اور چاہا کہ اس سے نکاح کریں ۔(چونکہ بڑے متقی تھے اس وجہ سے ناجائز تعلق رکھنا مناسب نہ جانا) ایک مولوی کے پاس گئے ایسے کم بخت نالائق کو مولوی کیسے کہوں ایسے ہی لوگوں نے تو مولویوں کو بدنام کر دیا۔ کام کے مولوی تو تھے نہیں صرف نام کے تھے اس وجہ سے کہ کچھ پڑھے لکھے تھے مگر افعال ان کے ایسے تھے کہ کسی جاہل کے بھی ویسے نہ ہوں گے چنانچہ انہوں نے ساس جیسی محرمہ علی التابید (جس کی حرمت ہمیشہ کے لئے ہوتی ہے اس) کو بھی حلال ہی کر چھوڑا جیسا ابھی معلوم ہوتا ہے، غرض اس دین فروش سے انہوں نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ ساس پر میری طبیعت آ گئی ہے اور ناجائز کام کرنا نہیں چاہتا، لہٰذا کسی طرح اس کو جائز کر کے اس سے میرا نکاح کر دو، اس نے کہا بھلا ساس سے کہیں نکاح ہو سکتا ہے، دنیا جانتی ہے کہ ساس ماں کے برابر ہے پھر اس سے نکاح کیسے ہو سکتا ہے کہا کوئی صورت بھی ہے کہنے لگے کہ ایسا مشکل کام تم ہم سے لینا چاہتے ہو جس میں بہت دماغ خرچ کرنا ہوگا مگر خیر سوچیں گے اور سوچنے کے بعد کوئی صورت نکالیں گے، مگر ایک ہزار روپیہ تم سے لیں گے چونکہ ساس کے اوپر طبیعت ان کی آئی ہوئی تھی اور اس سے نکاح کرنے کا ارادہ مصمم ہو گیا تھا لہٰذا اتنے بڑے کام کے لئے ایک ہزار روپیہ کا دیدینا کیا بڑی بات تھی منظور کر لیا، افسوس ہے کسی نے سچ کہا ہے **زَلُّ الْـعَـالِـمِ زَلُّ الْـعَـالَـمِ** (عالم کی لغزش ایک جہان کی لغزش ہے) ایک گناہ تو جاہل کا ہوتا ہے کہ وہ

اس کی ذات تک محدود ہوتا ہے کہ وہ گناہ کرے گا تو اس کا نتیجہ خود ہی بھگتے گا، دوسرے تک اس کا اثر نہیں پہنچتا اور ایک گناہ عالم کا ہوتا ہے جو متعدی ہے وہ محض اس کی ذات تک محدود نہیں ہوتا بلکہ دوسروں تک اس کا اثر پہنچتا ہے، یہ دین فروش خود تو گنہگار رہوا ہی دوسرے کو بھی ڈبویا، اور ساس کو کسی نہ کسی طریقہ سے پھیر پھار کر کے جائز کر ہی دیا اور ویسے نہیں بلکہ شرعی دلیل سے، اب وہ دلیل سنئے! ساس کی حرمتِ قطعیہ اس لفظ سے ثابت ہے وَاُمَّهَاتُ نِسَاءِكُمْ اس کے معنی ہیں کہ: تمہاری بیبیوں کی مائیں بھی تم پر حرام ہیں، بی بی کی ماں کو ساس کہتے ہیں اس سے ساس کی حرمت ثابت ہوئی اس نے اس میں ایک مقدمہ قائم کیا وہ یہ کہ ساس کہتے ہیں بی بی کی ماں کو اور بی بی کس کو کہتے ہیں؟ جس سے نکاح صحیح ہوا ہو، اب یہ دیکھنا ہے کہ بیوی سے تمہارا نکاح صحیح ہوا تھا یا نہیں سواس میں کلام ہے کیونکہ نکاح صحیح جبھی ہوتا ہے جب مرد وعورت دونوں مسلمان ہوں یا بی بی کتابیہ ہو غرض مشرک نہ ہو اور تمہاری بی بی جاہل ہے، یہ دریافت کر لیا تھا کہ وہ جاہل ہے اور یہ بھی پوچھ لیا تھا کہ نکاح کے وقت کلمہ وغیرہ نہیں پڑھایا گیا تھا، بس اب معاملہ درست ہو گیا اور گنجائش نکل آئی اس طرح سے کہ جاہل بسا اوقات کلماتِ کفر کے بک دیا کرتے ہیں پھر نکاح کے وقت کلمہ بھی نہیں پڑھایا گیا جس سے کفر کا ازالہ ہو جاتا، غرض نکاح کے وقت بی بی کا ایمان ثابت نہیں اور نکاح میں ایمان شرط ہے جب یہ شرط نہ پائی گئی تو نکاح بھی صحیح نہیں ہوا اور جب نکاح صحیح نہیں ہوا تو وہ منکوحہ بھی نہ ہوئی جب وہ منکوحہ نہ ہوئی تو اس کی ماں ساس بھی نہ ہوئی بلکہ ایک اجنبی عورت ہے لہٰذا اس سے نکاح جائز ہے ۔ دیکھئے پھیر پھار کر کے کس طرح دلیل سے اس کو جائز کر دیا۔ کتنا بڑا کام بن گیا، ایک شخص کا دل خوش ہو گیا اور اس وقت گناہ سے بھی بچ گیا، عاقبت کی خبر خدا جانے، دیکھئے حضرات یہ عالم ہیں جنہوں نے اتنا بڑا کام کیا، (بڑا تو کیا یوں کہئے کہ سڑا کام

کیا) ایسے صریح حرام کو جس کی تصریح نص قرآنی میں موجود ہے توڑ مروڑ کر حلال ہی کر کے چھوڑا اور ایسا ویسا حلال بھی نہیں بلکہ باقاعدہ قیاس مرتب کر کے دلیل قائم کر کے تب حلال کیا اور اپنے خیال کے موافق اس میں کوئی موقع اعتراض کا نہیں چھوڑا، ہاں ایک اعتراض ممکن ہے کوئی وارد کرے کہ انہوں نے اس بنا پر اس عورت کو حلال کیا کہ اس کی بیٹی سے نکاح صحیح نہیں ہوا تھا لہٰذا وہ ساس ہی نہیں ہوئی۔

لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک ام مزنیہ سے بھی نکاح حرام ہے، بی بی سے نکاح نہ ہوا نہ سہی لیکن وطی بالزنا تو ثابت ہے لہٰذا اس حالت میں بھی ساس سے نکاح حرام ہے لیکن بات یہ ہے کہ جب اس شخص نے صریح حکم کو پھیر پھار کر الٹ دیا تو اسے اس اشکال کا جواب دینا کیا مشکل ہے سیدھا سا جواب یہ ہے کہ یہ کہہ دے یہ ابوحنیفہ کی رائے ہے کہ مزنیہ کی ماں سے نکاح حرام ہے، ابوحنیفہ کی رائے ہمارے واسطے حجت نہیں۔ اس کے مقابلہ میں اور بھی رائیں ہیں، افسوس کیا ناس کیا ظالم نے دین کا، ایسے ہی نام کے مولوی دین اور اہل دین کو بدنام کرتے ہیں جہاں دو حرف آ گئے بس اپنے کو مولوی سمجھنے لگے اور فتوی دینے بیٹھ گئے۔

ابن المنصور کا کام اسی طرح تو تمام ہوا، ایک وزیر ان کا دشمن تھا اس واقعہ سے اس کو موقع مل گیا اور حکومت کے اثر سے علماء سے فتوی لے کر ان کو سولی پر چڑھا دیا، ساری دینداری وزیر کی بس اسی فتوے پر تھی، درحقیقت نکالی تو عداوت اور آڑ رکھی فتوے کی، اسی طرح یہ علماء دنیا طلب کرتے ہیں کہ خواہش تو پوری کرتے ہیں نفس کی اور آڑ رکھتے ہیں دین اور فتوے کی، خدا بچائے ایسے مولویوں سے۔[1]

---

[1] وعظ الصالحون ملحقہ اصلاح اعمال ص ۱۴۹

دارالافتاء کے ذمہ داروں کو تنبیہ

سچ بات یہ ہے کہ اس میں ذراسی کوتاہی علماء حقیقی کی بھی ہے کہ وہ ہر کس وناکس کو مولوی بنا کر اس کی دستار بندی کر دیتے ہیں اور اسے تعلیم وفتوی دینے کی اجازت دیدیتے ہیں پہلے انہیں دیکھ لینا چاہئے جس کی طینت خراب ہو اور جس میں اہلیت مقتدا بننے کی نہ ہو اس کو ہرگز ان کاموں کی اجازت نہ دیں بلکہ درسیات بھی نہ پڑھائیں صرف ضروریات دین کے موافق اس کی تعلیم کر دیں۔

بد گہر را علم وفن آموختن ☆ دادن تیغ است دست راہزن

نااہل کو علم وفن سکھانا گویا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے۔

سلف صالحین میں اس بات کا خاص اہتمام تھا کہ جس شخص کے متعلق آثار سے معلوم ہو جاتا تھا کہ اس میں حب دنیا غالب ہے تو اس کو مولویت کے درجہ تک بھی نہیں پہنچاتے تھے، ارشاد وتلقین اور فتوی نویسی کا کیا ذکر، آج کل مدارس میں بالکل اس کی احتیاط نہیں کی جاتی، اسی کے یہ نتائج ہیں کہ ایسے ایسے عالم پیدا ہوتے ہیں، دیکھئے ہر کام میں اہلیت اور طبیعت کی مناسبت دیکھی جاتی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ دین کے مقتدا بنانے کے لئے اہلیت اور مناسبت نہ دیکھی جاوے، ایسے لوگوں میں علم پڑھنے سے بجائے تحقیق کے یہ مادہ پیدا ہو جاتا ہے کہ زور تقریر سے جس مدعا کو چاہا الٹی سیدھی دلیل قائم کر کے ثابت کر دیا جیسا کہ اس فتوی دینے والے نے ساس کی حلت کو ثابت کر دیا بات بنالینا تو کچھ مشکل نہیں البتہ حق بات کو معلوم کر لینا یہ مشکل ہے وہ بلا علم حقیقی اور نور علم کے نہیں حاصل ہو سکتا اور نور علم حاصل ہونے کے لئے بڑے مجاہدات اور نفس کشی کی ضرورت ہے باقی جب ایک غرض کو سامنے رکھ لیا وہ جائز ہو یا ناجائز تو اس کے لئے بات کا بنانا کیا مشکل ہے۔[1]

---

[1] وعظ الصالحون ملحقہ اصلاح اعمال ص ۱۵۲

مولوی ہونے یا مقتدا بننے کے لئے کچھ شرطیں ہیں جن میں سے بڑی شرط یہ ہے کہ اس شخص میں حق پرستی ہو، نفس پرستی نہ ہو کہ اپنی طمع کی وجہ سے مسئلہ کو بدل دے، اسی لئے میں اہل مدارس کو رائے دیتا ہوں کہ وہ اپنی ضابطہ پوری اور کارروائی دکھلانے کی غرض سے بدطینت لوگوں کو داخل نہ کریں، طلبہ کے قلت و کثرت کی ذرا بھی پرواہ نہ کیا کریں بلکہ جس شخص کی حالت مقتدائیت کے مناسب نہ دیکھیں اس کو فوراً مدرسہ سے خارج کر دیں، کیوں کہ ہم بہت سوں کو مولوی بنانا جائز نہیں سمجھتے، آج جو علماء کا گروہ بدنام ہے یہ ان ہی طماعوں کی بدولت ہے۔

جس شخص کو اپنی بات کی پچ کرنے کا مرض ہو وہ ہرگز پڑھانے کے قابل نہیں اگر اس کے اس مرض کا علاج نہ کیا گیا اور اسی طرح سر آنکھوں پر بٹھایا گیا تو اس میں ہمیشہ کے لئے یہ عادت پختہ ہو جائے گی، کہ جو بات اس کے منھ سے نکلے گی اس کی پچ کیا کرے گا حق ناحق کی ذرا بھی پرواہ نہ کرے گا اس کا دین پر جو اثر پڑے گا وہ ظاہر ہے، پہلے اکابر علماء جس میں جاہ کا مرض دیکھتے تھے اس کو اپنے حلقۂ درس سے نکال دیتے تھے، میری رائے میں ایسے لوگوں کے لئے ایک مختصر نصاب جو ضروری مسائل واحکام کے لئے کافی ہو پڑھا کر کہہ دیا جائے کہ جاؤ دنیا کا کوئی کام سیکھو۔[1]

میں دیکھتا ہوں کہ لندن میں ایک جماعت انتخاب کنندگان کی ہے وہ جس کو جس کے قابل دیکھتے ہیں اسی کی تعلیم دیتے ہیں۔[1] سلف صالحین بھی انتخاب کر کے پڑھاتے تھے اور عجب نہیں کہ ایسے لوگوں کی وجہ سے ان کے پڑھانے والوں سے بھی باز پرس ہو جب کہ قرائن سے معلوم ہو کہ یہ ایسے ہوں گے۔[2]

[1] تعظیم العلم ص ۱۴۱ [2] دعوات عبدیت ص ۲۱۲ ج ۲۱

امت کو جاہل مولوی اور نام نہاد مفتی کے ضرر سے بچانے کا اہتمام اور حکمت عملی

بعضے (مولوی) ایسے بھی گذرے ہیں کہ قصداً تو تلبیس نہ کرتے تھے مگر علمی سرمایہ کی کمی سے بعضے امراض کے اثر سے بے اصول جواب ان سے صادر ہو جاتے تھے، ممکن ہے کہ وہ معذور ہوں مگر عوام کو ضرر تو پہونچ جاتا ہے جس سے بچانا ضروری تھا اور بچانے کی باضابطہ صورت یہی ہے کہ ان کا ابطال کیا جاوے (اور ان پر فتویٰ دینے اور مسئلہ بتانے سے پابندی لگائی جائے) مگر بعض مقامات پر اس سے فتنہ ہو جاتا ہے اس لئے ایسے موقع پر تحصیلِ مقصود کے لئے بڑی حکمت کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی حکیم بنایا تھا، اس حکمت کا ایک واقعہ ہے، مولانا کے ابتدائی وقت میں ایک بزرگ تھے مولوی سالار بخش صاحب وہ اس علاقہ میں بہت زیادہ بااثر تھے، مگر مسائل بے اصل بیان کرتے تھے، مولانا کی فراست قابلِ ملاحظہ ہے، ایک شخص مولانا سے مسئلہ پوچھنے آیا، اتفاق سے اس وقت مولوی سالار بخش صاحب گنگوہ آئے ہوئے تھے، مولانا نے اسی حکمت پر نظر فرما کر اس شخص سے فرمایا کہ بڑے مولوی صاحب آئے ہوئے ہیں ان سے مسئلہ پوچھو، ان کے سامنے میں کیا چیز ہوں، وہ شخص مولوی سالار بخش صاحب کے پاس پہونچا اور ان سے مسئلہ دریافت کیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں مولانا رشید احمد صاحب سے مسئلہ پوچھنے گیا تھا، انہوں نے یہ فرمایا کہ ہم مولوی صاحب کے سامنے کیا چیز ہیں، مولوی سالار بخش صاحب بڑے خوش ہوئے اور خوشی کے جوش میں بولے کہ واقعی وہ بڑے عالم ہیں، آج سے ہم نے یہ کام ان ہی کے سپرد کر دیا، بس مسائل ان ہی سے پوچھا کرو، ہم سے پوچھنے کی ضرورت

نہیں، حضرت مولانا گنگوہیؒ کی فراست دیکھئے کہ کتنے بڑے خلجان کو ذرا سی دیر میں رفع فرمایا، واقعی یہ حضرت مولانا ہی کا کام تھا، ان حضرات کی فراست سبحان اللہ۔[1]

ارباب افتاء ومقتدا حضرات کو زیادہ تقویٰ کا اہتمام کرنا چاہئے

حضرت نافع سے روایت ہے انہوں نے اسلم سے جو کہ معتَق (آزاد کیا ہوا غلام) حضرت عمرؓ کے تھے سنا کہ ابن عمرؓ سے بیان کررہے تھے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت طلحہؓ کے بدن پر رنگین کپڑے حالت احرام میں دیکھے، پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو گیرو ہے یا مٹی ہے، آپ نے فرمایا: تم لوگ (دین کے) پیشوا (سمجھے جاتے) ہو لوگ تمہارا اقتداء کرتے ہیں، اگر کوئی جاہل آدمی اس (لباس) کو دیکھے یوں کہے کہ طلحہ بن عبید اللہ احرام میں رنگین کپڑے پہنے ہوئے تھے، سو تم لوگ ایسے رنگین کپڑے مت پہنا کرو، روایت کیا اس کو مالک نے۔ (تیسیر ص۱۰۹)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مقتداء ہیں ان کو اور عام لوگوں کی نسبت ورع وتقویٰ میں زیادہ اہتمام مناسب اور ضروری ہے، اور صوفیہ (اسی طرح علماء ومفتیوں کا) کا مقتداء ہونا ظاہر ہے پس ان کو بھی اس کی رعایت ضروری ہے۔[2]

دنیادار مولویوں اور مفتیوں سے اعتماد اٹھ جاتا ہے

ایک روز میں راستہ میں جارہا تھا ایک بُڑھیا اپنے دروازہ میں جھانک رہی تھی، مجھ کو دیکھ کر بولی بیٹا، یہاں آنا، میں گیا تو بولی ایک مسئلہ بتادو، میں نے مسئلہ بتایا پھر کہنے لگی میں نے اس سے یعنی لکڑیوں والے مولوی صاحب سے بھی پوچھا تھا انہوں نے بھی تمہارے موافق بتلایا مگر مجھ کو یقین نہ ہوا کہ شاید اپنے مطلب کو کہتے ہوں، اب تمہارے بتلانے سے یقین ہوا، میں نے بڑی بی کو سمجھا دیا کہ علماء پر

[1] ملفوظات حکیم الامت ص۳۲۸ ج۲ قسط۳ [2] التکشف عن مہمات التصوف ص ۳۰۰

ایسا گمان جائز نہیں، یہ ہے علماء کے دنیا میں مشغول ہونے کا نتیجہ کہ مسائل میں ان کا اعتبار نہیں رہتا، ان کے دنیا میں مشغول ہونے میں خرابی یہ ہے کہ خود تم کو ان کے فتوؤں کا، ان کے وعظوں کا اعتبار نہ ہوگا۔[۱]

سنبھل کر رہئے اور اپنی عزت واعتماد اور حسن ظن برقرار رکھئے

افسوس بعض علماء کی حالت پر ہے کہ اغراض کی بدولت راہ سے بھی گر گئے، نظر سے بھی گر گئے، عوام کو ان سے بدگمانی ہونے لگی، اگر علماء اپنی آن بان کو باقی رکھتے تو ان کی بڑی قدر ہوتی اور ان پر اعتماد بھی ہوتا مگر یہ بھی پھسلنے لگے، بس ان کے پھسلنے پر زیادہ رنج ہے اس لئے کہ ان کے پھسلنے سے عوام کے گمراہ ہونے کا سخت اندیشہ ہے، اس لئے میں ہمیشہ اس کی کوشش کرتا ہوں کہ علماء سے لوگ بدظن نہ ہوں، ان کے ساتھ مربوط رہیں کہ ان کے دین کی سلامتی اسی میں منحصر ہے، اس بداعتمادی پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک بڑی بی نے مجھ سے مسئلہ پوچھا کہ زکوٰۃ کا روپیہ مدرسہ میں دینا جائز ہے؟ میں نے کہا کہ جائز ہے مگر مہتمم مدرسہ سے کہہ دیا جاوے کہ یہ زکوٰۃ کا روپیہ ہے تاکہ وہ اس کے مصرف میں صرف کردیں، وہ خوش ہوئیں اور کہا کہ مدرسہ میں جو مولوی صاحب ہیں میں نے ان سے بھی پوچھا تھا انہوں نے بھی یہی بتلایا تھا مگر مجھ کو اطمینان نہ ہوا تھا کہ شاید اپنے مدرسہ کی غرض سے بتلا دیا ہو اس لئے میں نے خیال کیا کہ آپ سے پوچھوں، بتلایئے یہ بدگمانی کس درجہ کی بات ہے، پھر جب اہل علم پر اعتماد نہ ہوگا تو مسائل کس سے پوچھیں گے، اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ علماء کو بہت سنبھل کر رہنے کی ضرورت ہے، ان جاہل صوفیوں اور درویشوں کی حرکات سے اس قدر عوام کی گمراہی کا اندیشہ نہیں ہے، جس قدر اہل علم اور علماء کے پھسل جانے سے گمراہی کا اندیشہ ہے، ان کو بہت سنبھل کر چلنے کی ضرورت ہے۔[۲]

---

[۱] التبلیغ ص ۶۹ [۲] ملفوظات حکیم الامت ص ۳۲۶ ج ۲ قسط ۳

اہل علم وارباب افتاء کوتواضع کے ساتھ اپنی خاص شان اور استغناء سے رہنا چاہئے

فرمایا: جامعہ ملیہ سے ایک صاحب کا خط آیا ہے پہلے بھی ان کا خط آیا تھا جس میں اپنے لئے تدبیر اصلاح دریافت کی تھی کہ جس سے اصلاح ہوجائے تو حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ:

اگراس تدبیر کے اندر آپ کامیابی کا وعدہ نہ سمجھیں، تو میں تدبیر بتلاسکتا ہوں، اس کی وجہ یہ فرمائی کہ کہیں بدپرہیزی تو کریں خود اور الزام آئے میرے اوپر، اور مجھ کو کیا معلوم جو بتلایا جائے اس پر عمل کریں بھی یا نہیں، وہاں سے جواب آیا کہ آپ کامیابی کے ذمہ دار نہیں، اس پر فرمایا کہ اب میں ان کو وہ تدبیر بتلا دوں گا۔

پھر فرمایا کہ مدعیوں کے ساتھ آن بان اور استغناء سے رہنا چاہئے، باقی انبیاء علیہ السلام پر اپنے کو قیاس نہیں کرنا چاہئے، انبیاء علیہم السلام پر تو تبلیغ واجب تھی ہم پر اکثر مواقع میں تبلیغ واجب نہیں مستحب ہے اور واجب کو کسی حالت میں ترک نہیں کیا جاتا، البتہ جہاں تبلیغ نہ ہوئی ہو وہاں وہی طرز اختیار کرنا چاہئے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کا تھا کہ ہمت ہو تو اگر قتل بھی ہوجائے تب بھی پروانہ کرے کیونکہ وہاں تبلیغ واجب ہے اور جہاں تبلیغ ہوگئی ہو اس جگہ تبلیغ مستحب ہے وہاں مفاسد کو گوارا نہیں کیا جاسکتا اور ان مفاسد کا حاصل یہی ہے کہ دین واہل دین کی ذلت، پس ایسے موقع پر اگر کوئی ذرا بے اعتنائی کرے فوراً چلا آنا چاہئے اب لوگ ان مراتب میں فرق ہی نہیں کرتے۔[1]

---

[1] القول الجلیل ص ۴ ملفوظ نمبر ۲

اہل علم وارباب افتاء کو چاہئے کہ تہمت اور بدنامی کے موقعوں سے بچیں اور تعلقات دنیویہ میں زیادہ مشغول نہ ہوں

علماء کے لئے مناسب یہ ہے کہ تعلقات دنیویہ میں زیادہ مشغول نہ ہوں اور یہ بات شاید اول وہلہ میں عقلاء کی سمجھ میں نہ آئے مگر میں اس کو سمجھائے دیتا ہوں، کیونکہ آج کل عقل کی بہت پرستش ہوتی ہے، جب تک کہ کوئی بات ان کے عقل میں نہ آئے، اس وقت تک اس کو قبول نہیں کرتے اور اس قسم کی باتوں کو آج کل تنزل کی تعلیم کہا جاتا ہے مگر الحمدللہ میں علماء کو کہہ رہا ہوں اور وہ اس کو تنزل نہ کہیں گے۔

تو بات یہ ہے کہ جو علماء دنیا کے کاروبار کرتے ہیں ان کی بابت معلوم ہوا ہے کہ ان معاملات کے متعلق جب وہ کوئی فتویٰ بیان کرتے ہیں تو لوگ اس کی وقعت نہیں کرتے، چنانچہ اسی کی بناء پر عوام کی زبان زد ہے کہ مولوی اپنے مطلب کے فتوے نکال لیتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ دنیوی جھگڑے ہیں، اس وجہ سے لوگوں کو ان پر اعتماد نہیں، اور یہ جھگڑے نہ ہوں تو ان کی سختی احتیاط پر محمول ہوگی اور نرمی واقفیت زمانہ پر محمول ہوگی، غرض ہر حال میں وہ محمود ہوں گے اور گو یہ محمود ہونا مقصود نہیں لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ان سے لوگوں کو فائدہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ اگر مریض کو طبیب پر اعتماد نہ ہو تو مریض گیا گذرا، پس طبیب کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اختیار سے کوئی بات ایسی نہ کرے کہ مریض کا اس پر سے اعتماد جاتا رہے، اور مریض اس سے بدگمان ہو جائے اور یہی معنی ہیں اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ التُّهَم کے (یعنی تہمت کے موقعوں سے بچو)۔

اس کو پہلے مضمون کے متعارض نہ سمجھئے کہ پہلے کہا تھا کہ کسی کا ہماری طرف سے گمان بد ہو تو ہوا کرے، کیونکہ مواضع التہم (تہمت کی جگہیں) کے بچنے کے امر میں یہ

قید ہے کہ اپنے اختیار سے کوئی کام ایسا نہ کرے کہ بدگمانی ہو اور وہاں محض اظہار حق ہی سے جو کہ مامور بہ ہے بدگمان ہوئے ہیں تو وہ ایسا ہو گیا کہ:

وَمَانَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ•

یعنی ان کفار نے ان مسلمانوں میں کوئی عیب نہیں پایا بجز اس کے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں جو کہ زبردست سزاوارِحمد ہے۔

تو وہاں وہ فعل مامور بہ اور سراسر محمود ہے اور یہاں ایسے امور ہیں کہ ضروری نہیں ہیں، ان سے بچنا ممکن ہے، پس اگر ان سے نہ بچے گا تو لازم آئے گا کہ خود اپنے آپ لوگوں کو بدگمان کیا۔

غیر ضروری کام کے لئے متہم ہونا مناسب نہیں

میں یہ نہیں کہتا کہ علماء اپنی جائدادیں تلف کر دیں بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ اس میں جو توسیع ہوتی ہے اس سے بچیں کیونکہ وہ غیر ضروری ہے، پس غیر ضروری کے لئے متہم ہونا مناسب نہیں ، یہ وجہ ہے جس کے لئے میں کہتا ہوں کہ اہل علم کے لئے تقلیل تعلقات (تعلقات میں کمی کرنا) مناسب ہے، تو یہ بھی اسی اصل کی فرع ہے کیونکہ اس میں خودغرضی کے ایہام سے بچنے کو کہا گیا ہے اور توسیعِ تعلقات کی صورت میں نصیحت کرنے سے خودغرضی کا ایہام ہوتا ہے، پس اس ایہام سے بچنا لازم ہے اور اس سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ توسیعِ تعلقات کو ترک کیا جائے نہ یہ کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر (یعنی اچھے کام کا امر کرنا اور بری باتوں سے روکنا) ہی کو ترک کر دیا جائے کیونکہ وہ تو مامور بہ ہے، پس یہ بھی اسی کی ایک فرع ہوئی، یہ طلباء کے کام کی بات ہے کیونکہ یہ پڑھ کر مقتداء بنیں گے اس وقت ان کو اس سے فائدہ ہوگا۔[1]

---

[1] اتباع المنیب ملحقہ نظام شریعت ص ۱۷۵

کسی کے مقدمہ وقضیہ میں نہ پڑنا چاہئے اور نہ ہر دعوت قبول کرنا چاہئے

(اس کی) ایک فرع یہ بھی ہے کہ اہل علم کو کبھی کسی کا فیصلہ نہ لینا چاہئے، کیونکہ اس سے بھی بدگمانی ہوتی ہے جس کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے وہ ان سے بدگمان ہوجاتا ہے اور مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے، کیونکہ ابتدا میں بعض مواقع میں مجھ سے ایسی غلطی ہوگئی ہے کہ میں نے فیصلہ لے لیا، مگر اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا، پھر مجھے تجربہ ہوگیا۔

چنانچہ پہلے پہلے جب میں وطن گیا تو لوگ اپنے فیصلے لاتے تھے، ایک مکان کا فیصلہ تھا میں نے محنت کرکے جزئیات فقہیہ تلاش کیں اور اس کے موافق فیصلہ لکھا، مگر جس کے خلاف تھا اس نے اس کو نہیں مانا، آخر وہ معاملہ سرکار میں لے گئے، میرے فضول کئی دن اس میں برباد ہوئے۔

ایک اور فیصلہ تھا کہ اس میں ایک فریق تو ایک عورت تھی اور دوسرا فریق ایک مرد تھا، اس میں بھی ایسا ہی ہوا، دو ہی مرتبہ میں مجھے تجربہ ہوگیا کہ اہل علم کو ہرگز فیصلے میں نہ پڑنا چاہئے، اس وقت سے میں نے یہ تجویز کرلی ہے کہ جو میرے پاس فیصلہ لاتا ہے اس سے کہہ دیتا ہوں کہ فیصلہ تو عمائد (یعنی علاقہ کے ذمہ دار حضرات جن کو وجاہت واقتدار حاصل ہو مثلاً چودھری، پردھان وغیرہ) کے پاس لے جاؤ، انہیں سے فیصلہ کراؤ، لیکن اگر شاید وہ مسائل اور احکام شریعت سے واقف نہ ہوں تو اس وقت یہ ہونا چاہئے کہ فریقین متفق ہوکر ایک استفتاء لکھیں جس پر دونوں کے دستخط ہوں اور اگر استفتاء کے مضمون میں فریقین کا اتفاق نہ ہو تو اس میں بھی عمائد سے رجوع کریں تاکہ وہ تنقیح کرکے استفتاء کے مضمون کو درست کریں اور جب مضمون منقح ہوجائے تو اس پر دونوں فریق دستخط کریں اور میرے پاس لائیں تو میں جواب لکھ دوں گا تاکہ یہ نہ ہو کہ ایک نے کچھ اپنے موافق لکھ کر فتویٰ حاصل کرلیا، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ پھر دونوں کو عدالت میں جاکر کھڑا ہونا پڑے اور وہ

فتوے بیکار ہو جائیں اور بدنامی بھی ہو کہ کوئی مولوی کچھ لکھتا ہے اور کوئی کچھ لکھتا ہے پس بہتر یہ ہے کہ فتویٰ تو لیں علماء سے اور اس کو نافذ کرائیں عمائدِ اہل شہر سے کیونکہ فیصلہ کرنا عمائد اور اہل اثر کا کام ہے میں نے یہ معمول اختیار کیا ہے۔

فیصلہ لینے میں ضرر یہ دیکھا کہ جب دو فریق باہم مخالف ہو کر فیصلہ کے لئے قضیہ لائیں گے تو ضروری بات ہے کہ فیصلہ ایک کے موافق ہوگا اور دوسرے کے خلاف، تو بعض اوقات تو وہ فیصلہ واقع کے موافق ہوتا ہے اور بعض مرتبہ واقع کے خلاف ہوتا ہے، کیونکہ فیصلہ کرنے والا عالم الغیب تو نہیں ہے کہ اس کو صحیح واقعات کا علم ضروری ہو، پس ممکن ہے واقعات اس فیصلہ کرنے والے سے مخفی رہیں اور معلوم نہ ہو سکیں، ہر چند کہ ایک فریق ظاہر کرتا ہے مگر دلیل نہ ہو سکنے کی وجہ سے قابل اعتبار نہیں ہوتا پس اگر فیصلہ واقعات کے خلاف ہوا تو عوام گالیاں دیتے ہیں کہ یہ کیا اندھوں کی طرح فیصلہ کیا ہے، بس معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ان کی سفارش کر دی ہے اس وجہ سے ایسا فیصلہ کر دیا، سو یہ نتیجہ ہوتا ہے اور ہارنے والے کو اس روز سے اس مقتداء سے دینی تعلق کم ہو جاتا ہے جس سے اس کا دینی ضرر ہوا، اگر فیصلہ واقعات کے خلاف ہے تب تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے اور اگر واقعات کے مطابق بھی ہو جب بھی اکثر لوگ اس فیصلہ کرنے والے کو ایک فریق کے ساتھ ضرور سمجھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں اس کا دینی اثر ہونا ممکن تھا وہاں بھی یہ لوگ اس میں کھنڈت ڈالتے ہیں اور ان کو اس کی طرف سے بدگمان کرتے ہیں۔

ایک ذرا سے فائدہ کے لئے کہ فیصلہ کرنے سے ہمارا لوگوں میں اثر ہوگا جس سے دینی کام لیں گے، بہت لوگوں کو اپنے سے بدگمان کر لیا اور ان پر جو دینی اثر ہوتا اس کو غارت کر دیا۔[1]

[1] اتباع المنیب ملحقہ نظام شریعت ص ۱۷۷

عجب نہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے یہ مشورہ دیا ہو کہ: لَاتَلِيَنَّ مَالَ يَتِيمٍ وَلَا تَقْضِيَنَّ بَيْنَ اثْنَيْنِ. (مسلم شریف)

یہ حدیث طویل کا ایک جزو ہے، اس میں یہ مضمون ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذرؓ سے فرمایا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور میں تمہارے لئے وہی پسند کرتا ہوں (جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں) اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ایک تو یتیم کے مال کا متولی نہ بننا، دوسرے تم پنچ (فیصل) نہ بننا اور اس کی وجہ یہ فرمائی کہ اِنِّیْ اَرَاکَ ضَعِیْفاً کہ تم ضعیف ہو، ان کاموں کا تحمل نہیں کر سکو گے، اور عدم تحمل کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ نازک تھے پس جب فیصلہ کرنے کے بعد کوئی مخالفت کرے گا تو پریشان ہو جائیں گے اور ان کی مخالفت اور اعتراضات کا تحمل نہ کر سکیں گے، برخلاف اس کے کہ فیصلہ کرنے والا صاحب حکومت ہو جیسے شیخین (یعنی حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کہ ان کے فیصلے کی اول تو مخالفت نہیں کی جاتی اور اگر کی جائے تو وہ مخالفت کو رفع فرما سکتے ہیں، برخلاف ایک ایسے بزرگ کے جس کو اختیارات حاصل نہ ہوں کہ وہ مخالفت کو رفع نہیں کر سکتے، پس یہ بھی اس اصل کی ایک فرع ہو سکتی ہے کہ خود غرضی کے ایہام سے بچیں۔

فقہاء نے ایسا ہی ایک جزیہ لکھا ہے کہ علماء کو گواہی دینا مناسب نہیں اور وجہ یہ لکھی ہے کہ اگر یہ کسی کی طرف سے گواہی دیں گے تو فریق مقابل کو ان سے عداوت ہو جائے گی لہٰذا ان کو گواہی دینا مناسب نہیں ہے، پس فقہاء کے اس قول سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ علماء کو فیصلہ نہ لینا چاہئے، اور فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ علماء کو مناسب نہیں کہ ہر جگہ کی دعوت قبول کر لیں، پس جب انہوں نے دیکھا کہ عوام کا علماء سے کتنا تعلق ہے اور ان کا منصب کیا ہے تو یہاں تک مشورہ دیا کہ ہر جگہ کی دعوت بھی نہ قبول کی جائے اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ لوگ دعوت کر کے حقیر سمجھتے ہیں، اور طلبہ کی دعوت تو آج کل اسی خیال پر کرتے ہیں کہ بلائیں دفع ہوں گی، تو گویا طلبہ بلاخوار ہوئے [1]

[1] اتباع المنیب ملحقہ نظام شریعت ص ۱۸۰

مقتدا اور مفتی کو تہمت اور بدنامی کے موقع سے بھی بچنا چاہئے

خواص کے جس فعل سے عوام پر اثر پڑتا ہو خواہ وہ ان کے لیے جائز ہی کیوں نہ ہو تب بھی اس کو نہ کرنا چاہئے۔

ایک بزرگ تھے ان کو ایک ظالم بادشاہ کے دربار میں بلا کر سور کا گوشت کھلانے پر مجبور کیا گیا، انہوں نے کہا میں ہرگز نہ کھاؤں گا پھر بکری کا گوشت کھلانا چاہا اور یقین دلایا کہ یہ بکری کا گوشت ہے مگر انہوں نے اس کو بھی نہ کھایا اور کہا کہ شہر میں شہرت ہو چکی ہے سور کے گوشت کھانے پر مجبور ہونے کی، لہٰذا میں جو کچھ بھی کھاؤں گا تو یہی مشہور ہوگا کہ سور کا گوشت کھایا ہے اس کا اثر عوام پر ہوگا اور برا ہوگا، دین میں فہم بڑی چیز ہے۔[1]

مقتداء دین کے لیے تعویذ وغیرہ کی اجرت لینا

قبل شفا کے لینے میں تو بدنامی ہے جو مضر دین عوام ہے اور شفا کے بعد لینے میں یہ محذور تو نہیں لیکن مقتداؤں کے لیے کچھ نامناسب معلوم ہوتا ہے پس جب تک حاجت شدید نہ ہو تحرز اولیٰ ہے۔[2]

مفتی کو محقق اور جامع ہونا چاہئے

میں کہا کرتا ہوں کہ مصلح اور مفتی میں سب چیزیں ہونا چاہئے قرآن بھی حدیث بھی، فقہ بھی، تصوف بھی، پھر انشاء اللہ تعالیٰ ایسا شخص حدود پر رہ سکتا ہے جامع نہ ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ گڑبڑی ہو ہی جاتی ہے، محقق اور جامع موقع اور محل کو دیکھتا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ وہ فقیہ بھی ہو مفسر بھی ہو۔[3]

---

[1] حسن العزیز ۳/۲۰۴ [2] امداد الفتاویٰ ۳/۴۰۴۔ [3] الافاضات الیومیہ: ۳۰۷

مفتی کو تجربہ کار ماہر اور اپنے زمانے کے عرف وحالات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے

مفتی کو بہت تجربہ کار اور فہیم ہونا چاہئے، فتوی دینا گویا امراض روحانی کا علاج ہے جب امراض جسمانی کا معالج وہی ہوسکتا ہے جو تجربہ کار ہو تو امراض روحانی کا معالج ناتجربہ کار کیسے ہوسکتا ہے[1]

فرمایا: فقہاء فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے زمانہ کے عادات واطوار سے ناواقف ہو وہ جاہل ہے۔

ایک شخص نے مجھ سے مسئلہ پوچھا کہ میری توند بڑھ گئی ہے اور زیرناف کا بدن نظر نہیں آتا، تو بال کس طرح صاف کروں میں نے کہا ہڑتال اور چونا سے صاف کرلیا کرو، وہ یہ سن کر بہت دعائیں دینے لگا اور ایک بڑے عالم کا نام لے کر کہا کہ میں نے ان سے دریافت کیا تھا انہوں نے فرمایا کہ بیوی سے صاف کرالیا کرو، میں نہایت پریشان تھا آپ نے مجھ کو بڑی پریشانی سے نجات دی، وہ بڑے بھاری عالم تھے اور ہڑتال کے خواص سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایسی غلطی کی، بھلا بیوی اس لیے ہے کہ اس سے یہ کام لیا جائے، طبیعت کس طرح گوارہ کرسکتی ہے[2]

ضرورت کی بنا پر دوسروں سے تحقیق کروانا

جس زمانہ میں کان پور میں تھا اس زمانہ میں طلسماتی انگوٹھیوں کا بہت چرچا تھا میں نے ایک ایسے شخص سے جو ہر قسم کے جلسوں میں آتے جاتے تھے کہا کہ تم ان واقعات کی تحقیق کر کے مجھ سے بیان کرو، چنانچہ تحقیق کے بعد آئے اور انہوں نے بیان کیا[3]

---

[1] مجالس الحکمت ص:۲۹ [2] الفضل العظیم ص:۲۳ و ۲۵ [3] الافاضات الیومیہ ۸/۴۰۱ قسط:۲

مفتی کو مغلوب المحبت نہیں ہونا چاہئے

عاشق کو مفتی بننا جائز نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو محبت سے مغلوب ہوتا ہے اس کا تو ہر فعل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہی کرنے کو جی چاہتا ہے، چاہے دوسرے لوگ فتنہ ہی میں مبتلا ہو جائیں اور فقیہ اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا بلکہ دلیری کے ساتھ یہ فتوے دیتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جس فعل کے اتباع سے عوام میں کسی مفسدہ کا اندیشہ ہو وہ اتباع ہی نہیں محض دعویٰ ہے اتباع کا، اس لیے وہ ممنوع ہے۔

پھر حضرت اقدس نے فرمایا کہ اگر نیت وعقیدہ ٹھیک ہو اور جوش محبت میں کیا جائے وہ اس کے لیے تو جائز ہی ہے لیکن اگر جاہلوں تک پہنچ جانے اور ان میں مفسدہ ہو جانے کی اس کو اطلاع ہو جائے تو اس کے لیے بھی ممنوع ہے۔[1]

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی شان اور ان کا خصوصی مزاج

امام صاحب کے اقوال اقرب الی الانتظام ہیں، شاہانہ احکام ہیں، پہلے ہی سے ایسا بندوبست کرتے ہیں کہ آئندہ خرابی نہ واقع ہو مثلاً کوئی عمل منقول ہو، اور لوگ اس کو اپنے درجہ سے بڑھا کر کرنے لگیں اور اعتقاد میں بھی خرابی پیدا ہو جائے تو امام صاحب اس عمل ہی کو متروک ہونے کے قابل سمجھتے ہیں، یعنی اس کو چھوڑ دینا چاہئے، نہ یہ کہ صرف اس زیادتی ہی کی اصلاح کر دی جائے جیسے سجدۂ شکر کہ گو منقول تو ہے مگر اس کو لوگ اپنی حد سے آگے بڑھانے لگے تھے اس لیے بالکل ہی روک دیا، اور یہ اس عمل میں ہے جو ضروری نہ ہو، اور جو عمل ضروری ہے تو اس میں صرف زیادتی کو حذف کیا جائے گا، امام صاحب کا مسلک صوفیہ کے مسلک سے ملتا ہوا ہے، صوفیہ اعمال باطنی میں ایسی ہی احتیاط کرتے ہیں جیسے علماء احکام ظاہرہ میں۔[2]

---

[1] الافاضات ۹/۳۹۹۔ [2] حسن العزیز ۳/۲۳۔

فقیہ اور محدث کے فتوے کا فرق

فرمایا: جس شخص پر فقہ اور فتویٰ کا رنگ غالب ہوتا ہے اس کے فتوے کا رنگ اور ہوتا ہے کہ جزئیات میں تشدد کی عادت ہوتی ہے اور جس پر حدیث کا رنگ غالب ہوتا ہے اس کے فتوے کا رنگ اس سے مختلف ہوتا ہے کہ اس میں کچھ توسع ہوتا ہے، ترکوں میں عموماً فقہ واصول فقہ کا رنگ غالب ہوتا ہے۔[1]

قاضی و مفتی اور حاکم کو مستفتی کی بدتہذیبی و بے ادبی کو برداشت کرنا چاہئے

هَلْ اَتٰـكَ نَبَـؤُا الْـخَصْمِ اِذْتَسَوَّرُوا الْمِحْرَابِ.... الىٰ قوله تعالىٰ ...وَلَاتُشْطِطْ وَاهْدِنَا اِلىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ۔(صٓ،آیت۲۲)

(ترجمہ وتشریح) بھلا آپ کو ان اہل مقدمہ کی خبر بھی پہنچی ہے جو داؤد علیہ السلام کے پاس مقدمہ لائے تھے، جب کہ وہ لوگ داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ کی دیوار پھاند کر داؤد علیہ السلام کے پاس آئے کیونکہ دروازہ میں سے پہرے داروں نے اس وجہ سے نہیں آنے دیا کہ وہ وقت خاص آپ کی عبادت کا تھا، فصلِ خصومات کا نہ تھا، تو وہ ان کے پاس بے قاعدہ طور پر آنے سے گھبرا گئے کہ کہیں یہ لوگ دشمن نہ ہوں کہ بقصد قتل تنہائی میں اس طرح آ گھسے ہوں، وہ لوگ ان سے کہنے لگے کہ آپ ڈریں نہیں ہم دوؔ اہل معاملہ ہیں کہ ایک نے دوسرے پر کچھ زیادتی کی ہے اس کے فیصلے کے لئے ہم آئے ہیں، چونکہ پہرے داروں نے دروازہ سے نہیں آنے دیا اس لئے اس طرح آنے کے مرتکب ہوئے، سو آپ ہم میں انصاف سے فیصلہ کر دیجئے، اور بے انصافی نہ کیجئے

---

[1] مجالس حکیم الامت ص:۲۳۶۔

اور ہم کو معاملہ میں سیدھی راہ بتلا دیجئے۔

ایسے بڑے جلیل القدر سلطان کے خلوت خانۂ خاص میں کسی کا بے اجازت پھر اس بے ڈھنگے پن سے آگھسنا، پھر بات چیت اس طرز سے کرنا کہ اول تو یہ کہنا کہ ڈرومت جس سے متکلم کا بڑا اور مخاطب کا چھوٹا ہونا مترشح ہوتا ہے، پھر یہ کہنا کہ انصاف سے فیصلہ کرنا اور بے انصافی مت کرنا جس سے ایہام ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ آپ سے بے انصافی کا بھی احتمال ہے، غرض ان کا مجموعۂ اقوال وافعال نہایت درجہ گستاخی ہے، پس اس میں داؤد علیہ السلام کے تحمل وصبر کا امتحان ہوگیا کہ آیا زورِ سلطنت میں ان متواتر گستاخیوں پر داروگیر کرتے ہیں او اس مقدمہ کو ملتوی کر کے ان پر دوسرا مقدمہ قائم کرتے ہیں، یا غلبۂ نورنبوت سے عفو فرماتے ہیں اور اس مقدمہ کو کمال عدل سے بلاشائبہ غیظ وغضب فیصل کرتے ہیں، چنانچہ (داؤد علیہ السلام) امتحان میں صابر ثابت ہوئے اور مقدمہ کو نہایت ٹھنڈے دل سے سماعت اور فیصل فرمایا۔[1]

(فائدہ) اہل معاملہ کے اس خلافِ تہذیب کلمہ کو داؤد علیہ السلام کو برداشت فرمانا دلیل ہے اس پر کہ حاکم اور اسی طرح مفتی اور شیخ کو ایسے امور کا تحمل کرنا چاہئے۔

نیز اس میں اس شخص کے لئے عبرت ہے جس کو اپنے تقدس پر ناز ہو جب کہ معصوم سے یہ کہا جاتا ہے کہ حد سے تجاوز نہ کیجئے تو غیر معصوم کو اپنے نفس پر وثوق کرنا کہ مجھ میں یہ احتمال نہیں کب زیبا ہے؟[2]

مفتی اور قاضی کا ایک فرق

مفتی اور قاضی میں فرق یہ ہے کہ مفتی کا جواب تو جملہ شرطیہ ہوتا ہے کہ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس کا حکم یہ ہے، اور قاضی کا فیصلہ جملہ انشائیہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ کی صورت

---

[1] بیان القرآن ص ۵ پ ۲۳ سورہ صٓ [2] بیان القرآن، مسائل السلوک ص ۴۵۹

اس طرح ہو جانا چاہئے اسی لیے مفتی صرف ایک شخص کے بیان پر فتوی دے سکتا ہے اور قاضی ایک شخص کے بیان پر فیصلہ نہیں کر سکتا بلکہ اس کو دونوں طرف کا بیان سننا ضروری ہے پھر شہادت وحلف کے بعد فیصلہ کرے، قاضی یا سلطان کو یہ جائز نہیں ہے کہ صرف مدعی کا بیان سن کر فیصلہ کرنے لگے، جب تک کہ مدعی علیہ سے دریافت نہ کرے، یک طرفہ بیان سن کر قاضی وسلطان کو قضیہ شرطیہ کے ارادہ سے بھی حکم بیان کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں احد الفریقین کی حمایت ظاہر ہوگی اور قاضی وسلطان کو فریقین میں تسویہ کا حکم ہے، بخلاف مفتی کے کہ اس کو ایک شخص کا بیان سن کر بھی فتوی دے دینا جائز ہے کیونکہ اس کا فتوی واقعہ کا فیصلہ نہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر واقعہ یوں ہی ہے تو مسئلہ یہ ہے اور اگر یوں نہیں تو جواب دوسرا ہے، آج کل لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ مفتی کے فتویٰ کو فیصلہ سمجھتے ہیں اور جب ایک واقعہ میں دو شخص استفتاء کرتے ہیں اور جواب مختلف دیا جاتا ہے تو علماء کو بدنام کرتے ہیں کہ اس کو کچھ جواب دیا، اس کو کچھ جواب دے دیا، اور یہ نہیں دیکھتے کہ سوال کرنے والوں نے سوال مختلف کیا ہے، اور مفتی کا جواب جملہ شرطیہ ہوتا ہے تو دوسوال کے بدلنے سے جواب ضرور بدلے گا، اور ہر سوال کے جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ واقعہ یہ ہے تو جواب یہ ہے اور دوسری طرح کا واقعہ ہے تو جواب دوسری طرح ہے۔[1]

قاضی اور مفتی کے منصب کا فرق

مفتی کا منصب قانون داں وکیل کا ہوتا ہے، قاضی کا نہیں ہوتا، یعنی قاضی کا حکم فیصلہ ہوتا ہے اس لئے اس پر واجب ہے کہ واقعات کی تنقیح کرے، مفتی کے ذمہ یہ نہیں، اس کے قول کا حاصل محض قانون بتلانا ہوتا ہے، وہ بھی پوچھنے پر، تمام بارسائل پر

---

[1] الارتیاب والاغتیاب ملحقہ اصلاح اعمال ص:۵۴۲

ہوتا ہے، بہ لفظ دیگر اس کا قول قضیہ شرطیہ ہوتا ہے، یعنی اگر یہ واقعہ اس طرح ہوتو اس کا قانونی حکم یہ ہے، حدیث صحیح میں تصریح ہے کہ ہند نے اپنے شوہر ابوسفیانؓ کی تنگی خرچ کی شکایت کرکے استفتاء کیا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بدون تنقیح واقعہ کے ارشاد فرمایا: **خذی (بلااذنہ کما ھو مصرح فی سؤالھا) مایکفیک وولدک بالمعروف۔**

اگر مفتی باوجود کسی قسم کی ذمہ داری نہ ہونے کے کوئی احتیاط کرے وہ تبرع ہے جو لازم نہیں۔

کبھی وہ اس تبرع یعنی احتیاط کو اختیار کرتا ہے جہاں دوسرا پہلو یعنی عدم تبرع کا قوی مفسدہ نہ ہو، اور کبھی وہ اس کو اختیار نہیں کرتا جہاں خاص احتیاط کرنے میں کوئی قوی مفسدہ ہو اور مفسدہ کا قوی وضعیف ہونا اس کے اجتہاد پر ہے اور نیک وبد ہونے کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

انشاء اور موافقت میں بھی فرق ہوتا ہے، یعنی ایک تو خود کسی قول کا دعویٰ کرنا، دوسرے کسی دوسرے کے قول کے ساتھ موافقت کرنا، اول میں زیادہ تحقیق کرتا ہے، ثانی میں تھوڑی بھی گنجائش ہوتی ہے اس میں مخالفت نہیں کرتا۔[1]

مفتی اور مجیب کی ذمہ داری

مجیب کے ذمہ واقعہ کی تحقیق نہیں، واقعہ کا اثر بیان کرنا اس کا منصب ہے، جیسے طبیب سے کسی مریض کا حال بیان کیا جاوے کہ اس کے سر میں درد ہے، اس کا کام یہ ہے کہ دردسر کا نسخہ بتلادے نہ یہ کہ کسی خاص ذریعہ سے اس کی بھی تحقیق کرے کہ کیا واقع میں اس کے سر میں درد ہے۔[2]

---

[1] حکیم الامت نقوش وتأثرات ص ۴۷۹ [2] حکیم الامت نقوش وتأثرات ص ۵۸۵

اختلافی مسائل اور فتاویٰ میں عدل وانصاف کی ضرورت

قال اللہ تعالیٰ: یَـٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُوْنُوْا قَوَّامِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی. (سورہ مائدہ پ۶)

وقال تعالیٰ: وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ الآیة (بنی اسرائیل پ۱۵)

ان آیتوں میں حکم ہے کہ کسی کے ساتھ اگر اختلاف یا خلاف بھی ہو عدل سے اس حالت میں بھی تجاوز کرنا جائز نہیں نیز بلا دلیل صحیح کوئی دعویٰ کرنا جائز نہیں، اس حکم کے تحت میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں کہ ۲۹/ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ کو ڈاک سے میرے پاس ایک صاحب کا خط جس میں کاتب صاحب کا نام اور نشان نہ لکھا تھا مع ایک حصہ نقیب اخبار کے آیا جس میں مضمون خطاب مسلم لیگ کے متعلق ایک اعتراض تھا اور اصل اعتراض کے ساتھ خط میں بہت سی بدزبانیاں اور بدگمانیاں بھی جمع کردی تھیں، اعتراض تو مجھ کو الحمد للہ کبھی ناگوار نہیں ہوتا بلکہ اگر اس کی بناء صحیح ہو تو میں اس کو رہنمائی سمجھ کر ممنون ہوتا ہوں البتہ اگر اس کی بناء فاسد ہو یا بناء کے صحیح ہوتے ہوئے لہجہ طعن وتشنیع کا ہو وہ طبعاً ضرور گراں ہوتا ہے مگر اس حالت میں بھی صحت بناء کی صورت میں اس کے جواب بالمثل کو اور فساد بناء کی صورت میں نفس جواب کو فضول سمجھ کر نظر انداز کردینے کا معمول ہے، البتہ نفس واقعہ کی تحقیق کو تدین کا مقتضا سمجھ کر ضروری سمجھتا ہوں۔[1]

مفتی کو معتدل المزاج ہونا چاہئے

کانپور میں ایک شخص نے میرے سامنے اہل بدعت کی برائی کرنا شروع کیا، میں نے ان کی طرف سے تاویلات کرنا شروع کردیں، پھر اس نے غیر مقلد کی برائیاں شروع کیں، میں نے ان کی طرف سے تاویلات کرنا شروع کردیں اس نے متحیر ہوکر

[1] افادات اشرفیہ ص۸۲

پوچھا آخر آپ کا مذہب کیا ہے؟ میں نے کہا میرا مذہب یہ آیات قرآن ہیں۔

کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ ط وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَن لَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔

ترجمہ: ''نہ بھڑکائے غصہ تم کو کسی قوم کا اس بات پر کہ نہ تم انصاف کرو بلکہ تمہیں انصاف کرنا چاہئے وہی تقویٰ کے قریب ہے۔[1]

اختلافی مسائل کی شان

مسائل بعض قطعی ہوتے ہیں ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی بعضے اجتہادی وظنی ہوتے ہیں ان میں سلف سے خلف تک شاگرد نے استاد کے ساتھ، مرید نے پیر کے ساتھ، قلیل جماعت نے کثیر جماعت کے ساتھ واحد نے متعدد کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور علماء امت نے اس پر نکیر نہیں کی اور نہ ایک نے دوسرے کو ضال اور عاصی کہا نہ کسی نے دوسرے کو اپنے ساتھ متفق ہونے پر مجبور کیا۔[2]

اختلافی مسائل میں ہمارے اکابر کا توسع

فرمایا کہ ہمارے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے مزاج میں ایسے اختلافی مسائل کے بارے میں بڑا توسع تھا، میں نے (یعنی حکیم الامتؒ نے) ان سے ایک مسئلہ پوچھا جس میں حضرت مولانا کا فتوی حضرت گنگوہی کے فتوے سے مختلف تھا، اپنی تحقیق کے مطابق مسئلہ بتلا دیا اور پھر یہ بھی فرما دیا کہ مولانا گنگوہیؒ کا فتویٰ اس کے بارے میں یہ ہے اب تمہیں اختیار ہے جس کو چاہو اختیار کرلو۔[3]

---

[1] مجالس حکیم الامت ص: ۱۲۴ [2] افادات اشرفیہ ص: ۵ [3] مجالس حکیم الامت ص ۱۲۴

شاگرد کا استاد اور مرید کا اپنے پیر کے فتوے پر اعتراض کرنا

فرمایا کہ ایک معاملہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب نے ایک فتوے لکھا، حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ کے مشہور مرید امیر شاہ خان صاحب نے اس پر کچھ اعتراض کیا اور لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا اس کے بعد خیال آیا کہ میں نے بے ادبی کی تو دوسرا خط معذرت اور معافی کے لیے لکھا۔

حضرت مولانا گنگوہی نے جواب میں تحریر فرمایا کہ مجھے آپ کا پہلا خط جس میں اعتراض تھا پسند آیا، یہ دوسرا پسند نہیں آیا کیونکہ پہلے خط میں آپ نے جو کچھ لکھا تھا وہ خالص دین کے لیے تھا اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی نیت بے ادبی کرنے کی نہیں تھی اس لیے ذرہ برابر ناگواری نہیں ہوئی۔[1]

مجتہدین کے اختلافی مسائل میں بحث وتحقیق کی زیادہ کاوش مناسب نہیں

غلو ٹھیک نہیں جس کا فتویٰ صحیح سمجھ میں آئے اس پر عمل کرو، ہم کوئی موسےٰ علیہ السلام تو ہیں نہیں جب ہم جیسے نالائق امام اعظم کے بعض فتوؤں کو غلط کہہ دیتے ہیں تو ہمارے فتوے کیا ہیں، یہ عقیدہ کہ ان سے غلطی نہیں ہوتی بہت غلو ہے۔[2]

فرمایا: جن مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے ان میں بحث وتحقیق کی زیادہ کاوش طبعاً ناگوار ہے کیونکہ سب کچھ تحقیقات کے بعد بھی انجام یہی رہتا ہے کہ اپنا مذہب صواب محتمل الخطاء اور دوسروں کا مذہب خطا متحمل الصواب ہے کتنی ہی تحقیق کرلو، کسی امام مجتہد کے مسئلہ کو بالکل غلط قرار نہیں دیا جاسکتا اسی لیے میں اس بات سے بہت گریز کرتا ہوں۔[3]

---

[1] مجالس حکیم الامت ص ۱۰۰ [2] مجالس حکیم الامت ص ۱۷۱ [3] حسن العزیز ص: ۳۷۰۔

بعض اوقات تو سوالات وشبہات کے جواب میں اسی پر قناعت کر لیتا ہوں کہ سائل سے پوچھتا ہوں کہ یہ مسئلہ قطعی ہے یا ظنی؟ ظاہر بات ہے کہ قطعی ہوتا تو محل اجتہاد نہ ہوتا، وہ کہتا ہے کہ ظنی ہے، تو میں کہہ دیتا ہوں تو پھر ظنی ہونے کا تقاضا ہی یہی ہے کہ جانب مخالف کا شبہ اس میں رہتا ہے، اگر تمہیں شبہ ہے تو ہوا کرے، اس سے تو مسئلہ کی ظنیت کی تاکید وتقویت ہوتی ہے، ایسے شبہ سے کچھ حرج نہیں ہے۔[1]

فرمایا: جب میں کانپور میں حدیث پڑھاتا تھا تو میرے دل میں فاتحہ خلف الامام پڑھنے کی ترجیح قائم ہوگئی چنانچہ اس پر عمل بھی شروع کر دیا، مگر حضرت گنگوہی کو لکھ کر بھیج دیا اس کے جواب میں حضرت نے مجھے کچھ نہیں فرمایا، مگر چند ہی روز گذرے تھے کہ پھر خود بخود دل میں ترک فاتحہ خلف الامام کی ترجیح ہوگئی اور اس کے مطابق عمل کرنے لگا، اس کی بھی اطلاع حضرت کو کر دی، حضرت نے کچھ نہیں فرمایا حضرت کو یہ معلوم تھا کہ یہ جو کچھ کرتے ہیں نیک نیتی سے کرتے ہیں۔[2]

اختلافی مسائل میں توسع کے حدود

فرمایا کہ دیانات میں تو نہیں لیکن معاملات میں جن میں ابتلاء عام ہوتا ہے دوسرے امام کے قول پر بھی اگر جواز کی گنجائش ہوتی ہے تو اس پر فتویٰ دفع حرج کے لیے دے دیتا ہوں اگر چہ ابو حنیفہؒ کے قول کے خلاف ہو اور اگر چہ مجھے اس گنجائش پر پہلے سے اطمینان تھا لیکن میں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے اس کے متعلق اجازت لے لی، میں نے دریافت کیا تھا کہ معاملات میں محل ضرورت میں دوسرے امام کے قول پر فتویٰ دینا جائز ہے؟ فرمایا کہ جائز ہے۔[3]

اور یہ توسع معاملات میں کیا گیا دیانات میں نہیں (کیونکہ اس میں کچھ اضطرار نہیں) اسی لیے جمعہ فی القریٰ میں محض ابتلاء عوام کے سبب ایسا توسع نہیں کیا۔[4]

---

[1] مجالس حکیم الامت ص ۲۷ [2] مجالس حکیم الامت ص ۷۰ [3] دعوات عبدیت ص ۱۲۴ ج ۹ [4] کلمۃ الحق ص ۷۰

مختلف فیہ مسائل میں وسعت دینی چاہیے

فرمایا: حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگوں کو جو خدا تعالیٰ سے محبت ہے وہ ان کے احسانات کی وجہ سے ہے اس واسطے ہمارے حضرت کا مسلک یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے آرام سے رہو مگر حد سے نہ نکلو، اس لیے مختلف فیہ مسائل میں وسعت دینی چاہیے، اس طرح ایک تو شریعت سے محبت ہوگی دوسرے آرام رہے گا۔[1]

چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی امر کی دوشقوں میں اختیار دیا جاتا، تو جوشق زیادہ آسان ہوتی تھی آپ اسی کو اختیار فرماتے تھے اور فطرت سلیمہ کا بھی یہی مقتضیٰ ہے۔[2]

فرمایا: محققین کا مسلک یہ ہے کہ اپنے نفس کے عمل میں تو تنگی برتے اور اعلیٰ و ادنیٰ کو عمل کے لیے اختیار کرے مگر رائے اور فتوے میں وسعت رکھے اور لوگوں کے لیے مقدور بھر آسانی (اور جواز) کو تلاش کرے۔[3]

دوسروں کے لیے تنگی اپنے اور متعلقین کے لیے سہولت نکالنا مناسب نہیں

علماء کو نہیں چاہئے کہ اپنے یا متعلقین کے لیے تو کتابوں میں سے روایتیں چھانٹ کر آسانی نکال لیں اور دوسروں کے لیے جن سے تعلق نہیں ہے دین کو تنگ کریں (بہتر طریقہ یہ ہے) کہ دوسرے کے عیب میں تو حتی الامکان فقہ سے گنجائش نکالیں اور اپنے نفس پر تنگی کریں، خصوصاً ان کاموں میں جن میں دین کا یا دنیا کا کوئی مفسدہ ہوجانے کا اندیشہ ہو اس (اندیشہ) کی وجہ سے بدعات مروجہ سے مطلقاً اہل علم کو روکا جاتا ہے کہ اس میں دوسروں کے بگڑنے کا اندیشہ ہے۔[4]

---

[1] انفاس عیسیٰ ص:۲۳۴ [2] دعوات عبدیت ۱۲۴/۹ [3] الافاضات ۱۱۴/۱۰ [4] کمالات اشرفیہ :ص۳۴۳ ملفوظ:۱۲۲

زیادہ کاوش اور تنگی میں نہیں پڑنا چاہئے

فرمایا: ایک بار مجھ کو عید کے روز شیر (سویاں) پکانے کے متعلق بدعت کا شبہ ہوا، میں نے حضرت مولانا یعقوب صاحب کو لکھا حضرت نے جواب میں فرمایا کہ ایسے امور میں زیادہ کاوش نہیں کرنا چاہئے، لوگ بدنام کرتے ہیں اور عید کے روز سوئیوں کے پکانے کو کوئی عبادت اور دین نہیں سمجھتا جس سے بدعت ہونے کا شبہ ہو۔

یہ جواب جو حضرت نے فرمایا، یہی میری رائے ہے کہ اس میں تنگی نہیں کرنی چاہئے، آج کل اعتدال بہت کم ہے، افراط وتفریط زیادہ ہے اگر خیال نہیں تو بڑی بڑی معصیتوں اور بدعتوں کا خیال نہیں ہوتا اور خیال ہوتا ہے تو مباح تک پر ہاتھ صاف کرنے اور اس کو معصیت میں داخل کرنے کو تیار ہیں [۱]

شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے کہ یہ جو بعض جگہ موئے مبارک کے نام سے پایا جاتا ہے اس کے متعلق زیادہ کاوش نہیں چاہئے اس سے کوئی حکم شرعی تو متعلق ہے نہیں محض زیارت سے برکت حاصل کرنا ہے سو اس کے لئے دلیل ضعیف بھی کافی ہے [۲]

(البتہ عوارض ومفاسد کے پائے جانے کی صورت میں منع کرنا ضروری ہوگا تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، اصلاح الرسوم)

مسلمانوں کے ساتھ حسن ظن کے پہلو کو غالب رکھنے اور وسعت قلبی کی ایک دقیق مثال

اس سوال کے جواب میں کہ بعض لوگ اذان کے مقابلہ میں دیگر علامات وقت مثلاً گھنٹی (سائرن وغیرہ) کو ترجیح دیتے ہیں اور اذان کے مقابلہ میں گھنٹی کی توقیر

[۱] انفاس عیسیٰ ۶۱۴ [۲] القول الجلیل ص ۳۶

کرتے ہیں ان کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب تحریر فرمایا:

''گھنٹی بجنے پر آنا اور اذان پر نہ آنا اگر گھنٹی کے احترام اور اذان کی بے حرمتی کی وجہ سے ہے تو واقعی یہ بہت قبیح و شنیع حرکت ہے، لیکن کہیں ایسا سنا گیا نہ دیکھا گیا، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ نماز کا مدار وقت پر ہے اور وقت کی علامات میں سے دیگر آلات کی طرح گھنٹی بجنا بھی ہے، لہٰذا جو شخص گھنٹی بجنے پر مسجد آتا ہے اس کا مقصد گھنٹی کی کوئی خصوصیت نہیں ہوتی بلکہ اس نے اس کی آواز کو منجملہ معرّفاتِ وقت قرار دیا ہے۔

اور مسلمانوں کے بارے میں بدگمانی کرنا خود اسلام کی بے توقیری ہے جو اذان کی بے توقیری سے بڑھی ہوئی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہٗ اتم۔[1]

توسع اور تنگی کا معیار

فتاویٰ کے اندر توسع ہونا چاہئے تاکہ حاملین کو تنگی نہ ہو مگر جہاں توسع میں اندیشہ ہو کہ لوگ اس امر کے متعلق یہ معلوم کر کے کہ جائز ہے بعض ایسی باتوں کو جائز سمجھ لیں گے جو باجماع ناجائز ہیں تو ایسے موقع پر توسع نہ کرنا چاہئے اگرچہ ایسے موقع پر توسع نہ کرنے کی وجہ سے بعض جائز باتیں پس جائیں گی۔[2]

بعض جائز امور بھی مقتداء کے لیے ناجائز ہو جاتے ہیں

فرمایا کہ بعض مرتبہ میں ایک جائز بات کی اجازت مقتداء کو بھی نہیں دیتا جس میں لوگ اس مقتداء کے فعل کی سند پکڑیں گے اور ناجائز چیز کا ارتکاب کرنے لگیں گے اور عامی شخص کو اسی بات کی اجازت دیتا ہوں کیونکہ یہاں اندیشہ نہیں ہوتا کہ لوگ اس کی اقتداء کریں گے۔[3]

---

[1] امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۶۱ سوال ۱۶۰ مختصراً ترجمہ از فارسی [2] الافاضات الیومیہ ص ۱۴۹ ج ۱

[3] الافاضات الیومیہ

عوام کی رعایت کر کے اپنے کو تہمت سے بچانا

فرمایا کہ مولانا شیخ محمد صاحب کا قرضہ ایک ہندو پر آتا تھا، مولانا نے نالش کی وہاں سے آٹھ سو روپئے کی مع سود کے ڈگری ہوگئی، مولانا کو باوجود یکہ سخت حاجت تھی مگر سود سب چھوڑ دیا جج مسلمان تھے انہوں نے کہا کہ درمختار میں تو روایت ہے (جس سے جواز کی گنجائش نکلتی ہے) مولانا نے فرمایا کہ میں درمختار کس کس کو دکھاتا پھروں گا عوام کو تو سند ہوگی۔[1]

ایک عالم ربانی کی حکایت

اس پر اپنے ہم وطن ایک عالم کی حکایت یاد آئی کہ انہوں نے کسی ہندو پر عدالت میں دعوی کیا اور جس سب جج کے یہاں دعویٰ تھا وہ بھی مولوی تھے کیونکہ پہلے یہ عہدے علماء ہی کو ملتے تھے تو سب جج نے مولوی صاحب کے موافق ڈگری کی اور مع سود کے جس کی مقدار آٹھ سو روپیہ تھی ڈگری دی، مولوی صاحب نے باوجود سخت حاجت کے سود کے لینے سے انکار کر دیا تو سب جج نے کہا کہ مولوی صاحب آپ کیوں نہیں لیتے درمختار میں تو لکھا ہے کہ:

لاربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب

مولوی صاحب نے کہا کہ میں عوام کو سمجھانے کیلئے درمختار کہاں بغل میں لئے لئے پھروں گا، مشہور تو یہی ہوگا کہ مولوی صاحب نے سود لیا۔

صاحبو! یہ علم ہے اور اس کا نام ہے تفقہ، کہ اگر کوئی چیز قاعدہ سے جائز بھی ہو مگر اس سے دین پر حرف آتا ہو تو اس کو بھی ترک کر دیا جائے، مگر آج کل عموماً اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا ہر شخص کا چندہ بے تکلف لے لیا جاتا ہے۔[2]

---

[1] الافاضات الیومیہ [2] ارضاء الحق ملحقہ تسلیم ورضا ص ۱۴۰

اہل علم وارباب فتاوی کوکسی کے معاملہ میں نہیں پڑنا چاہئے

ہر کام کے لیے خاص اصول ہیں حتی کہ علماء نے خود تبلیغ وافتاء کے لیے بھی چند شرائط بیان کئے ہیں چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ جس کے متعلق افتاء وتبلیغ وتعلیم وتربیت کا کام سپرد ہو وہ کسی کی گواہی نہ دے۔

اور ایک میں نے اضافہ کیا ہے تجربہ کی بناء پر کہ جس کے متعلق یہ کام ہوں وہ کسی کے معاملہ میں حَکَم یعنی فیصلہ کنندہ بھی نہ بنے کیونکہ ایسا کرنے سے وہ ایک جماعت میں شمار کرلیا جائے گا اور دوسری جگہ کے مسلمان اس کے فیوض وبرکات سے محروم ہوجائیں گے۔

مولویوں کو نہیں چاہئے کہ ایسے قصوں اور جھگڑوں میں پڑیں ان کو تو یہ چاہئے کہ وہ دوجگہ رہیں مسجد اور گھر، ایسے قصوں میں پڑنے سے اپنے اصلی کام سے رہ جاتے ہیں۔امام محمد سے منقول ہے کہ علماء کو کسی مقدمہ میں شہادت نہیں دینی چاہئے۔

علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ علماء کو کسی کی دعوت نہیں کھانا چاہئے یہ سب اس لیے کہ ان سب چیزوں سے تعلقات یا خصومات پیدا ہوتے ہیں اور علماء کے ساتھ سب مسلمانوں کا یکساں تعلق ہونا چاہئے۔[1]

فریقین کی رضامندی کے باوجود اہل علم وارباب افتاء کوکسی کے معاملہ میں نہیں پڑنا چاہئے

میں کسی کے فیصلہ وغیرہ میں نہیں پڑتا، اگر دونوں فریق جمع بھی ہوکر آتے ہیں تب بھی فیصلہ کرنے سے انکار کردیتا ہوں، بات یہ ہے کہ میرا تعلق لوگوں سے تعلیم و تربیت کا ہے میں اگر ایسے قصوں میں پڑوں گا تو میرے متعلق فریق بندی کا شبہ پیدا ہوجائے گا

[1] الافاضات الیومیہ ۱۹۸ج ۴۔

اور اس سے لوگوں کو دین کا نقصان پہنچے گا پھر عدم اعتماد کی وجہ سے کوئی خدمت دین کی نہ لے سکیں گے۔

دوسرے اگر فیصلہ بھی کر دوں تو ظاہر ہے کہ وہ ایک فریق کے موافق اور دوسرے کے مخالف ہوگا سو جس کے مخالف ہوا اگر وہ تسلیم نہ کرے تو میرے پاس اس کے نفاذ کا کیا ذریعہ ہے، میری کوئی حکومت تو ہے نہیں محنت بھی کی اور وقت اور دماغ بھی صرف کیا اور نتیجہ کچھ نہیں ہوا اس سے کیا فائدہ۔[1]

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت قصبہ میں ایک عالم مدرس کی ضرورت ہے، اگر حضرت مولوی صاحب سے فرما دیویں اور وہ قبول فرمالیں تو اہل قصبہ کو امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ بہت نفع ہوگا، فرمایا کہ فرمانا تو بڑی چیز ہے میں تو ایسے معاملات میں رائے بھی کسی کو نہیں دیتا بلکہ خود صاحب معاملہ کے مشورہ لینے پر بھی کہہ دیتا ہوں کہ مجھ کو آپ کے مصالح اور حالات کا کما حقہ علم نہیں میں مشورہ سے معذور ہوں آپ خود اپنے مصالح پر نظر کر کے جو اپنے لئے بہتر مناسب خیال کریں عمل کر لیں، ہاں دعا سے مجھ کو انکار نہیں، عافیت اسی میں ہے کہ کسی کے معاملات میں دخل نہ دے، ہر شخص کو آزادی رہے، البتہ شریعت کے خلاف کوئی کام نہ ہو، مولوی صاحب یہاں پر موجود ہیں ان سے خود تمام معاملات طے کر لئے جاویں، میری طرف سے بالکل آزادی ہے، میرا معمول ہے کہ اگر دونوں طرف جائز بات ہو تو کسی جانب پر مجبور نہیں کرتا بلکہ دونوں طرف آزادی دیتا ہوں حتیٰ کہ اگر کسی ایک شق میں میری بھی کوئی مصلحت ہو تب بھی اپنے مصالح پر ان کے مصالح کو ترجیح دیتا ہوں اور نہایت صفائی کے ساتھ اپنی اس تخییر کو ظاہر کر دیتا ہوں اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اپنے بزرگوں کی دعاء کی برکت سے میری کوئی بات الجھی ہوئی نہیں ہوتی، ہر بات نہایت صاف ہوتی ہے اگر مخاطب ذرا بھی فہیم ہو تو فوراً سمجھ میں آجاتی ہے۔[2]

---

[1] الافاضات الیومیہ [2] کمالات اشرفیہ ص۳۹۱ ملفوظ ۲۱۶

اہل علم وارباب فتاویٰ کوذاتی معاملات میں کیا کرنا چاہئے

ایک روز بیٹھے ہوئے اچانک خیال آیا کہ والد مرحوم نے چار شادیاں کیں تو چار دین مہر کے والد صاحب قرضدار ہوئے اوراس قرض کا اداء یا ابراء مشکوک جس کا کچھ پتہ نہیں والد صاحب نے کافی ترکہ چھوڑا تو دیون ترکہ سے متعلق ہوگئے اس ترکہ سے مجھ کو بھی حصہ پہنچا تو اسی نسبت سے دین میرے بھی ذمہ ہوگیا گواس زمانہ میں معافی مہر کا رسم غالب بلکہ عام تھی اس لیے مجھ کو تردد ہوا۔

مگر صاحب غرض ہونے کی وجہ سے اپنی رائے پر وثوق نہیں کیا بلکہ چند علماء سے تحریری بھی اور زبانی بھی استفتاء کیا جس کے جواب میں علماء کے مختلف جوابات آئے مگر یہی طے کیا کہ شبہ کی حالت میں دوسروں کا دے دینا تو چاہئے ،اپنا لینا نہیں چاہئے اگر اپنا حق ہو بھی تو معاف کردینا چاہئے اس لیے ایک عالم سے فرائض نکلوا کر اس قدر رقم جدا کردی جس قدر رقم میرے ذمہ آئی۔[1]

فصل

صحیح جواب نہ معلوم ہونے کی صورت میں بتکلف جواب دینے کی مذمت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر تو کوئی عقل مند نہیں حتیٰ کہ کفار بھی حضور ﷺ کو عاقل ہونے کو تسلیم کرتے ہیں (الغرض) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاقل ہونے میں کسی کو کچھ شبہ نہیں، مگر باوجود اس کے حضور ﷺ کی کیفیت یہ تھی کہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ خیر البقاع (بہترین جگہ) کونسی جگہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں، جبرئیل علیہ السلام سے پوچھ کر بتلاؤں گا ،حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے تو آپ

[1] الافاضات ۱۹۰/۲۔

نے ان سے دریافت فرمایا، انہوں نے کہا کہ مجھے بھی معلوم نہیں، رب العالمین سے دریافت کر کے بتلاؤں گا، پس وہ دریافت کرنے گئے اور جب واپس آئے تو فرمایا کہ اس مرتبہ مجھ کو حق تعالیٰ سے اتنا قرب ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، کل ستر ہزار پردے درمیان میں رہ گئے تھے، اور حق تعالیٰ نے فرمایا کہ خیر البقاع مساجد ہیں۔

دیکھئے باوجود اس علم وفضل کے یہ فرمادیا کہ مجھے نہیں معلوم، سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت تھی کہ جو بات معلوم نہیں ہوتی بے تکلف فرمادیتے کہ مجھے نہیں معلوم اور آپ نے صرف اسی واقعہ میں ایسا نہیں کیا بلکہ اور بہت سے امور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا ہے، خود خدا تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرماتے ہیں وَمَآاَنَامِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ کہ آپ فرمادیجئے کہ میری یہ عادت نہیں کہ جو بات مجھ کو معلوم نہ ہو اس میں تکلف کروں۔

پس عالم کی یہ شان ہونی چاہئے کہ جو بات معلوم نہ ہو بے تکلف کہہ دے کہ مجھے معلوم نہیں، اب عوام کی تو کیا شکایت علماء بھی جہل کو چھپاتے ہیں۔

کانپور میں کسی نے ایک طالب علم سے پوچھا کہ سُور کا چمڑہ پاک ہے یا ناپاک؟ مسئلہ معلوم نہ تھا اس لئے ٹالنے کے لئے کہا کہ اس مسئلہ کی تمہیں کیا ضرورت ہے؟ اس نے کہا کہ آخر مسئلوں کی مسلمان ہی کو تو ضرورت ہوتی ہے، آپ نے جواب دیا کہ یہ بہت دور کا مسئلہ ہے تم کیا سمجھو گے، اس نے کہا کہ آخر آپ بتائیے تو سہی، تب آپ نے کہا کہ قواعد سے تو پاک معلوم ہوتا ہے، غرضیکہ اتنے حیلے حوالے کئے اور پھر مسئلہ غلط بتایا، مگر یہ نہیں کہا گیا کہ مجھے نہیں معلوم۔

اور بعضے غلط مسئلہ بتلانے کی جرأت نہیں کرتے مگر سائل کو بے وقوف بنا کر اپنی جان بچاتے ہیں، چنانچہ ایک گلہری کنویں میں گر گئی تھی ایک شخص اس مسئلہ کے دریافت کرنے کے لئے ایک مولوی صاحب کے پاس گیا جو کہ بڑے معقولی تھے، انہیں خود بھی

اس کا حکم معلوم نہ تھا اور یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ مجھے معلوم نہیں، اس لئے آپ نے شقوق نکالنی شروع کیں تا کہ وہ ساکت ہوجائے، پس فرمانے لگے کہ گلہری کے گرنے میں کئی احتمال ہیں یا تو خود گری ہے یا کسی نے اس کو گرایا ہے، اگر خود گری ہے تو دو احتمال سے خالی نہیں یا تو آہستہ چل کر گری ہے یا دوڑ کر، اور اگر کسی نے اس کو گرایا ہے تو اس کی بھی دوصورتیں ہیں یا تو اس کو گرانے والا آدمی ہے یا جانور، اور ہر شق کا جدا حکم ہے (اتنا جھوٹ بولا) اب بتلاؤ کہ کونسی صورت واقع ہوئی ہے؟ اس نے کہا کہ یہ تو معلوم نہیں ،انہوں نے کہا پھر مسئلہ ویسے ہی پوچھنے چلے آئے جاؤ کام کرو۔

تو یہ بڑے متقیوں کا حال ہے، حالانکہ جناب باری تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمایا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ (میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں)

میں نے بڑے بڑے علماء کے فتوے دیکھے ہیں کہ انہوں نے جواب میں لکھ دیا ہے کہ ہمیں معلوم نہیں، اب علماء میں یہ مرض عام ہوگیا ہے کہ کسی مسئلہ میں اپنی لاعلمی کا اظہار نہیں کرتے ہیں، اس وجہ سے اب اگر کوئی کہتا بھی ہے کہ مجھے معلوم نہیں تو اس کی بات کا یقین نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے ایک مسئلہ دریافت کیا تھا، میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں، تو انہوں نے شکایت کی کہ مجھ سے خفا معلوم ہوتے ہیں، جو ایسا کہہ دیا ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ان کو یہ مسئلہ معلوم نہ ہو، تو گویا مولوی کو عالم الکل ہونا چاہئے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو یہ کیفیت تھی کہ آپ باوجود اس علم وفضل کے فرمادیتے تھے کہ مجھے معلوم نہیں، پھر اور کون عالم الکل ہوسکتا ہے۔[1]

---

[1] اتباع المنیب ملحقہ نظام شریعت ص ۲۱۲، ۲۱۳

کتنا ہی بڑا محقق اور مفتی ہو جائے لیکن لاعلمی ظاہر کرنے میں ذرا بھی عار محسوس نہ کرنا چاہئے

حضرت امام مالکؒ کتنے بڑے امام تھے ان سے کسی نے ایک جلسہ میں چالیس سوال کئے جن میں سے چھتیس پر لاادری کہا اور صرف چار کا جواب دیا، آخر خدا کا خوف بھی تو کوئی چیز ہے۔

جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے سوال کیا کہ شرّ البقاع کون سی جگہ ہے اور خیر البقاع کون سی جگہ ہے؟ کیا اتنی بات بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود نہیں فرما سکتے تھے یہ کوئی باریک بات نہ تھی کہ سب سے اچھا مقام کون ہے اور سب سے برا مقام کون ہے۔

اس کا جواب کلیات سے ہم جیسے نالائق سوچ کر دے سکتے تھے مثلاً یہ کہہ سکتے تھے کہ جہاں طاعت ہو وہ سب سے اچھا مقام ہے اور جہاں معصیت ہو وہ سب سے برا مقام ہے۔

یہ میں نے محض مثال کے طور پر کہا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس سوال کا جواب مشکل نہ تھا لیکن پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے امور میں رائے زنی کو جائز نہیں سمجھا اور فرمایا مجھے تحقیق نہیں، میں حق تعالیٰ جل شانہ سے پوچھ کر اس کا جواب دوں گا۔

چنانچہ جب حضرت جبرئیل آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے پوچھا انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ مجھے تحقیق نہیں پھر وہ حق تعالیٰ شانہ سے پوچھ کر جواب لائے اور عرض کیا کہ سب سے اچھی جگہ مسجد ہے، اور سب سے بری جگہ بازار ہے، جب سائل آیا تو اس سے بھی یہی جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل فرما دیا۔

تو صاحبو! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تو سوالات کے جوابات میں نص کا انتظار فرمائیں اور ہم لوگ اٹکل پچو جو جی میں آئے ہانک دیں، اب تک تو ہر شخص اپنے حق میں یہ گمان کرتا ہے کہ میں قانون ساز ہوں، سوالات کا جواب دینا کیا مشکل ہے۔

حالانکہ یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع تو ہر چیز میں ضروری ہے پس جیسے تحقیقات میں اتباع ہے اس میں بھی اتباع ہے کہ جو تحقیق نہ ہو کہہ دے کہ مجھے تحقیق نہیں، یہ بھی تو اتباع ہی میں داخل ہے، تو امت کو اس کی اجازت نہیں کہ چاہے تحقیق ہو یا نہ ہو ہر سوال کا کچھ نہ کچھ جواب دیدے۔[1]

آج کل ادنیٰ طالب علم سے پوچھ کر دیکھئے جو کبھی بھی کہہ دے کہ میں نہیں جانتا مجھ کو باوجود اس کے کہ کام کرتے ہوئے اتنے دن ہو گئے مگر اب تک ایسی ضرورت پڑتی ہے کہ یہ لکھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں مجھ کو شرح صدر نہیں ہوا۔[2]

سب سے آسان جواب

اگر تم سے کوئی فضول بات پوچھے جس کا جواب تم کو معلوم نہیں، تو صاف کہہ دو، ہم نہیں جانتے، میں سچ کہتا ہوں کہ اس جواب میں ایسی راحت ہے جو کسی جواب میں نہیں، مگر اس کو اتنا سستا اور عام نہ کر دینا کہ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ تم مسلمان ہو یا کافر تو وہاں بھی یہ کہو کہ ہم نہیں جانتے۔

لا اعلم کہنا (یعنی یہ کہنا کہ ہم کو اس کا جواب معلوم نہیں) یہ معمولی جواب نہیں بلکہ ایسا قیمتی جواب ہے کہ واللہ اسی کی بدولت مجھے ایک بڑے ورطۂ ہلاکت سے نجات ہوئی مجھ پر بھی ایک حالت گذری ہے جس سے کئی مہینہ تک ایک ورطۂ ظلماء (تاریکی کے گڑھے) میں مبتلا رہا، ایک جگہ مسئلہ قدر کے متعلق کچھ مضمون نظر پڑ گیا بس قیامت آ گئی اور ایمان پر خطرہ ہو گیا، پھر جب تک میں شبہات کے جوابوں میں غور کرتا رہا پریشانی

[1] الافاضات ۱۰/۵۹-۶۰ [2] جمال الجلیل ملحقہ جزاء وسزا ص:۴۸ و ۵۰۔

بڑھتی رہی، آخر کار نجات ہوئی تو اس بات سے ہوئی کہ ہم کیا جانیں ہمارا علم ہی کیا ہے ہم جانتے ہی کیا ہیں، پھر ہم اس مسئلہ میں غور ہی کیوں کریں؟ واللہ اس وقت قدر ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس امر کی کہ مسئلہ قدر میں غور نہ کرو۔

خدا ناس کرے ان ظالموں کا جو اس ارشاد کی قدر نہیں کرتے اور اسلام پر شبہ کرتے ہیں کہ مسئلہ قدر پر جو اشکالات پڑتے ہیں ان کا جواب اسلام میں ہے ہی نہیں، اس لیے غور کرنے اور گفتگو کرنے سے منع فرمادیا گیا، ارے احمق! سارے جوابوں کے بعد بھی تسلی اسی سے ہوگی کہ یوں کہہ دو کہ ہم نہیں جانتے رہے اشکالات تو لاؤ اشکالات پیش کرو ہم سب کا جواب ایسا دیں گے کہ تم لاجواب اور ساکت ہو جاؤ گے مگر تسلی نہ ہوگی۔ تسلی اور شفاء اسی سے ہوگی کہ اس میں غور فکر ترک کردو، اس وقت قدر ہوگی **وَمَآ اُوۡتِیۡتُمۡ مِنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا** کی، کہ واقعی ہمارا علم کچھ نہیں اور ہم کچھ نہیں جانتے۔

لا اعلم کہہ دینا بڑی راحت کی بات ہے اور اعلم (یعنی میں جانتا ہوں) کہنا مصیبت کو اپنے سر لینا ہے اس لیے ایک عاقل کی رائے ہے کہ حتی الامکان جواب نفی میں دیا کرو کیونکہ نفی میں جواب دینا اہون آسان ہے اور اثبات میں جواب دینا اشد (سخت) ہے، مثلاً اگر تم سے کسی نے سوال کیا کہ آپ نے کلکتہ دیکھا ہے؟ اس کے جواب میں اگر یہ کہہ دیا کہ ہاں دیکھا تو بس سوالات شروع ہو جائیں گے کہ بتلاؤ وہاں کیا کیا عجائبات ہیں، چڑیا گھر کتنا بڑا ہے اور قلعہ کیسا ہے؟ وغیرہ وغیرہ، اگر یہ کہہ دیا کہ میں نے کلکتہ نہیں دیکھا تو اس پر کوئی سوال نہیں ہوسکتا پس راحت اسی میں ہے کہ جب کوئی فضول سوال کرے تو اس کے جواب میں یا تو اپنے جاہل ہونے کا اقرار کرے یا سائل کو جاہل بنادے اگر لڑائی کا اندیشہ نہ ہو اور یہ کہہ دے کہ اس سوال کا جواب سمجھنے کے لیے تمہارا فہم نہیں، (تم نہیں سمجھ سکتے)۔[1]

بعض لوگ اس حدیث کو پیش کیا کرتے ہیں **من سئل عن علم فكتمه**

---

[1] الدوام علی الاسلام ملحقہ محاسن اسلام ص:۳۹۶۔

الجم بلجام من النار یوم القیامة اس کا حل یہ ہے کہ جو شخص کسی فتنہ پردازی کے لیے مسئلہ پوچھتا ہے وہ "**سائل عن علم**" ہے ہی نہیں بلکہ مجادل (جھگڑالو اور فسادی) ہے اور جدال جاہلوں کا شیوہ ہے اسی کی نسبت قرآن شریف میں ہے۔

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَاماً، اور وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ۔

(اور جب ان سے جہلاء گفتگو کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو لغو وفضول باتوں سے الگ رہتے ہیں)۔

جس طریقہ سے بعض علاج فی نفسہ صحیح ہوتے ہیں مگر کسی عارض کی وجہ سے موقوف رکھے جاتے ہیں مثلاً کسی کو جوع البقر (گائے جیسی بھوک) کا مرض ہو تو اس کو دوا یا غذا مزہ دار نہ دینا چاہئے کیونکہ وہ ضرور مقدار سے زیادہ کھالے گا اور نقصان ہوگا ایسے ہی بہت سے مسائل صحیح ہوتے ہیں لیکن بعض مفاسد کو مستلزم ہوتے ہیں اس وقت ان پر فتویٰ نہ دینا کتمان حق نہیں ہے بلکہ تقدم بالحفظ از مرض ہے۔ (یعنی مرض سے حفاظت کی پیشگی تدبیر ہے)۔[1]

صحیح جواب معلوم نہ ہونے کے وقت لاعلمی ظاہر کرنے کی تاکید

یہ کوئی عار کی بات نہیں، جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عالم کون ہوگا؟ آپ نے بہت سے سوالوں پر لا ادری فرمادیا اور جب وحی نازل ہوئی اس وقت بتلا دیا اور واقعی جب کل علوم کا احاطہ خاصہ ہے حق تعالیٰ شانہ کا تو بعض چیزوں کا نہ جاننا ممکن کے لوازم سے ہے تو اس لازم کا اگر اقرار کرلیا تو کون سی نئی بات ہوئی بلکہ واقع میں تو غیر معلومات عدد میں معلومات سے زیادہ ہی ہے قال اللہ تعالیٰ: **وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا** (اور تم کو تو بہت تھوڑا علم دیا ہے)۔

---

[1] مجالس الحکمت ص:۲۹۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے لوگو! جو شخص کسی بات کا علم رکھتا ہو تو اس کو چاہئے کہ بتادے اور جو نہ جانتا ہو اس کو چاہئے کہ کہہ دے کہ اللہ جاننے والا ہے کیونکہ یہ کہہ دینا بھی علم کی بات ہے۔ (بخاری)

اس حدیث میں صریح تاکید ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو کہہ دے کہ معلوم نہیں۔[1]

لاعلمی ظاہر کرنے کی بابت ضروری تنبیہ

فرمایا: جو شخص کبھی کبھی سوال کے جواب میں **لا اعلم** بھی کہہ دیتا ہو اگر چہ اس کی نیت بھی صحیح ہو، تاہم اس سے جاہ بڑھتی ہے اور سامعین سمجھتے ہیں کہ یہ جو کچھ بتلاتا ہے اسی وقت بتلاتا ہے جب کہ اس کو اطمینان ہوتا ہے باقی نفس الامر میں خواہ کچھ بھی ہو، اس لیے مناسب یہ ہے کہ بلا تکلف اس لفظ کا استعمال نہ کیا کریں اور جو معلوم نہ ہو کہہ دیا کریں، یوں نہ سمجھیں کہ اس سے ہماری سبکی ہوگی۔[2]

فتویٰ دینے میں جرأت وپیش قدمی نہ کرنا چاہئے

فرمایا: مولانا محمد قاسم صاحب فتویٰ نہیں دیتے تھے یہ فرمادیتے تھے کہ مولانا رشید احمد صاحب بہت بڑے عالم ہیں ان کے پاس لے جاؤ، مولوی محمد علی کہتے تھے کہ ایک مرتبہ بہت حضرات جمع تھے جو مسئلہ کوئی پوچھنے آتا اس سے ہر بزرگ یہی فرمادیتے کہ اس کو فلاں کے پاس لے جاؤ، وہ اس فن کو خوب جانتے ہیں وہ بتادیں گے۔[3]

فرمایا: بعضے استفتاء آتے ہیں ان پر لکھ دیتا ہوں کہ مدرسہ دیوبند یا سہارنپور سے معلوم کرلو، بعض آدمی اعتراض لکھ کر بھیجتے ہیں میں جواب ہی نہیں دیتا خواہ معترضین یہ سمجھتے ہوں کہ کچھ آتا جاتا نہیں، ہاں! سمجھ دار منصف آدمی سوال کرے تو جی چاہتا ہے جواب دینے کو؛ اس سے خطاب کر کے بھی جی خوش ہوتا ہے۔[4]

[1] اصلاح انقلاب ص۲۹۱-۲۹۲۔ [2] اشرف المعمولات ص:۲۳۔ [3] دعوات عبدیت ۲۶/۱۴۔ [4] حسن العزیز ۲/۲۰۳۔

اگر کوئی طالب آئے تو جواب سے گریز نہ کرنا چاہئے

کیونکہ طالب سے انکار کرنا یہ خداع ہے، ناجائز ہے اگر کوئی شخص کوئی سودا خریدنے جائے اور ایک دکاندار کہہ دے کہ میرے یہاں نہیں ہے تو وہ بے چارہ یوں ہی رہا، ہاں غیر طالب سے کہہ دے کہ میں کچھ نہیں ہوں اس میں کچھ حرج نہیں۔[1]

مفتی کو عوام کی چالبازیوں سے واقف ہونا چاہئے

لوگ آج کل علماء کو اپنی جنگ کی آڑ بناتے ہیں اور خود الگ رہتے ہیں، میں ان کی رگوں سے خوب واقف ہوں، جوابوں میں اس کی رعایت رکھتا ہوں اس لیے یہاں کے جوابوں سے لوگ خوش نہیں ہوتے۔

ایک خط میں بطور شکایت لکھا آیا تھا کہ یہاں کی انجمن میں اتنے عرصے سے مدزکوۃ کا روپیہ جمع ہے اگر لوگ ان سے صرف کرنے کو کہتے ہیں یا حساب مانگتے ہیں تو کوئی جواب نہیں دیتے ایسی صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟

میں سمجھ گیا کہ فتویٰ حاصل کر کے لوگوں کو دکھاتے پھریں گے اور فساد برپا کریں گے، میں نے جواب لکھا کہ ''ان انجمن والوں سے اس کا جواب لے کر کہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ سوال درج کرو، اور پھر فتویٰ حاصل کرو'' اس جواب سے بھلا کیا خوش ہوں گے۔[2]

ایک استفتاء آیا ہے کہ قبرستان میں لنگی باندھ کر جانا جائز ہے یا نہیں اور یہ نہ پوچھا کہ مسجد میں نماز کے واسطے لنگی باندھ کر جانا جائز ہے یا نہیں؟ اس سائل نے لنگی میں پردہ کم سمجھا تو اللہ میاں کے سامنے چاہے ننگے جائیں مگر قبرستان میں ننگے نہ جائیں یہ عقیدہ کی خرابی ہے۔[3]

---

[1] حسن العزیز ۱/۱۷۲۔ [2] الافاضات ۲/۱۰۔ [3] کلمۃ الحق ص:۱۷۱۔

باب۳
آداب الفتویٰ
فصل (۱)

ہر سوال کا جواب نہیں دینا چاہئے

مفتی کو ہر سوال کے جواب کے لیے فوراً نہیں تیار ہو جانا چاہئے، علماء میں فی زمانناً (یہ عادت) رائج ہے کہ ہر سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتے اور اس کو اپنا فخر جانتے ہیں۔

عوام کے سامنے دقیق مسائل بیان کرنا ایسا ہے جیسا کہ بچہ کو روپیہ پیسہ اور قیمتی اسباب پر قبضہ دے دینا، یا بچہ کے ہاتھ میں چھری چاقو دے دینا یا سر بازار گاتے پھرنا کہ ہمارے پاس اتنا مال ہے یا جو کوئی پوچھے کہ تمہارا مال کہاں رکھا ہے اس کو بتا دینا اور نہ بتانے کو جھوٹ سمجھنا۔[۱]

آج کل کی عام غلطی

(لیکن) آج کل تو ذرا سے سوال پر اپنی تحقیقات بیان کرنے لگتا ہے چنانچہ آج کل لوگوں کو یہ سبق مل گیا ہے کہ جو ملتا ہے سلطان ابن سعود کے متعلق سوال کرتا ہے کہ ان کے بارے میں آپ کا کیا اعتقاد ہے؟ اب لگے مولوی صاحب اپنی تحقیق بیان کرنے جس میں خواہ مخواہ فضول وقت ضائع ہوتا ہے۔

صاحبو! صاف یوں ہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہم کو کچھ خبر نہیں اور یہ کہہ کر اپنے کام میں لگو، اور واقعی ہندوستان کے رہنے والوں کو کیا خبر، ہمارے پاس بجز اخباروں

۱؎ مجالس الحکمت ص: ۲۸۔

کے تحقیق کا ذریعہ ہی کیا ہے۔اوراخباروں کی دیانت کا جو حال ہے سب کو معلوم ہے۔

(کچھ لوگ) سلطان کو امام وقت اور فرشتہ کہتے تھے اب اس کو شیطان سے بھی بدتر کہنے لگے،اس حالت میں کس کے بیان پر خاک اعتماد کیا جائے بس اسلم طریقہ یہی ہے کہ سکوت کیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ ہم کو تحقیق نہیں،مگر اس جواب سے شرماتے ہیں کیونکہ اس میں جہل کا اقرار ہے حالانکہ صاحب علم ہونے کے لیے ہر بات کا جاننا ضروری نہیں تو کسی ایک بات کے نہ جاننے سے آپ کا جاہل ہونا کیوں کر لازم آیا۔[1]

جواب کی دو قسمیں حاکمانہ حکیمانہ

کہیں حاکمانہ جواب مناسب ہوتا ہے اور کہیں حکیمانہ سب کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکا جاتا،عوام اسی سے بگڑ گئے،علماء کے حکیمانہ جواب ہی سے ان کا حوصلہ بڑھ گیا حتیٰ کہ اب ہر بات کی علل واسرار پوچھنے کی جرأت ہوگئی،(بعض لوگ بزرگوں کے اشعار کا نصوص سے مقابلہ کرنے لگے) حالانکہ نصوص کے مقابلہ میں سب اشعار ہیچ ہیں،بس ہم تو یہ جانتے ہیں کہ یہ خدا اور رسول کا حکم ہے اس کے سامنے کہاں کی مصلحت کہاں کی حکمت جو کوئی نصوص کا مقابلہ اشعار سے کرے اس کو ڈانٹ دینا چاہئے۔

حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنین کی دیت میں **غرۃ عبد یا امۃ** کا حکم دیا تھا مدعی علیہ نے حضور کے سامنے یہ کہا کہ **کیف اغرم من لا شرب ولا أکل ولا نطق ولا استھل ومثل ذلک بطل** یعنی ایسے بچہ کی کیا دیت جس نے نہ کھایا نہ پیا اور نہ بولا نہ چلّایا اور ایسا معاملہ تو یوں ہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

آپ نے فرمایا **أسجع کسجع الکھان** کیا واہیات ہے کاہنوں جیسی مسجع مقفی عبارت سے شریعت کا مقابلہ کرتے ہو،غرض حضور نے اس کو ڈانٹ دیا تو بعض جگہ اس کی بھی ضرورت ہے،کہیں حاکمانہ جواب مناسب ہوتا ہے اور کہیں حکیمانہ۔

[1] الدوام علی الاسلام ملحقہ محاسن اسلام ص:۲۹۴۔

ایک شخص نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ حائض سے نماز تو ساقط ہوگئی اور روزہ کی قضا لازم ہے، جواب دیا کہ وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کرو گے تو اتنے جوتے سر پر پڑیں گے کہ سر پر بال بھی نہ رہیں گے، اس جواب کی یہ وجہ نہ تھی کہ مولانا کو حکمت معلوم نہ تھی بلکہ اس کے لیے یہی جواب مناسب تھا کیوں کہ مابہ الفرق سمجھنے کی لیاقت اس میں نہیں تھی، چنانچہ اسی سوال کو دوسرے ایک فہیم نے دوسری مجلس میں پوچھا تو آپ نے اس کو مفصلاً بیان کر دیا تو ہر مخاطب کا مذاق جدا ہے ہر ایک کی حالت جدا ہے اس کی حالت کے موافق جواب دینا چاہئے۔[1]

ایسے ہی ایک اور شخص کا خط میرے پاس آیا کہ فلاں حکم میں کیا حکمت ہے، میں نے لکھا کہ سوال عن الحکمت میں کیا حکمت ہے، خدا کے حکم کی حکمت تو ممکن ہے بندہ کو معلوم نہ ہو، مگر سوال تو تمہارا فعل ہے تم کو اپنے فعل کی حکمت ضرور ہی معلوم ہوگی، مہربانی کر کے ذرا بتلاؤ تو سہی میں نے یہ خیال کیا تھا کہ اگر وہ سوال عن الحکمت کی کچھ حکمت بتلائیں گے تو میں اس کو باطل کر دوں گا۔

اسی طرح میرے پاس ایک شخص کا سوال آیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟ میں نے جواب دیا کہ اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ دارالحرب ہے تو آپ کیا کریں گے، بس اس کے بعد پھر سوال نہیں آیا۔

بات یہ ہے کہ آج کل مذاق ایسا بگڑا ہوا ہے کہ عوام تو عوام خواص کو بھی فضول سوالات کا مضر ہونا معلوم نہیں اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس سے قلب پر بھی کچھ اثر ہوتا ہے۔[2]

میرے پاس ایک خط آیا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے وہ اس کی علت دریافت کرنا چاہتے ہیں میں نے جواب میں لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے؟۔

پھر انہوں نے لکھا کہ علماء کو اتنا خشک نہ ہونا چاہئے میں نے دل میں جواب دیا

---

[1] آداب التبلیغ ص:۹۲۔ [2] جمال الجلیل جزاء وسزا ۱۴۱/۱۴۱۔

کبھلاء کو اتنا تر نہ ہونا چاہیے کہ ڈوب ہی جائیں۔[1]

مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی سے ایک نیلگر (رنگریز) نے سوال کیا کہ فلاں حافظ جی نے پوچھا ہے کہ حضرت علی ومعاویہ (رضی اللہ عنہما) میں کون حق پر ہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ بھائی تم کیا کام کرتے ہو؟ کہا: میں نیلگر (رنگریز) ہوں، فرمایا: وہ حافظ جی کیا کرتے ہیں؟ کہا جوتے بیچتے ہیں، فرمایا: جاؤ تم اپنے نیل کے مٹکے کی خبر لو اور کپڑے رنگو، اور حافظ جی سے کہو کہ جوتے بیچیں، قیامت کے دن حضرت علی جانیں اور حضرت معاویہ جانیں، ان کا قضیہ فیصلہ کے لیے تمہارے پاس نہ آئے گا اور نہ تم سے یہ سوال ہوگا کہ بتلاؤ ان دونوں میں سے کون حق پر ہے۔[2]

غرض کبھی اس قسم کے بھی جواب دینا چاہیے نرم جواب دے کر علماء نے عوام کا حوصلہ بڑھا دیا ہے۔[3]

صریح جزئیہ کے بغیر محض کلیات سے جواب نہ دینا چاہیے

جب تک کوئی جزئیہ نہ مل جائے محض کلیات سے استنباط اور تعلیل کر کے جواب دینے کی ہمت نہیں ہوتی، اس لیے کہ ہم جیسے لوگوں سے تعلیل کے اندر بھی غلطی ہو جاتی ہے۔[4]

مسئلہ کا جواب محض کلیات سے مناسب نہیں احتیاط کے خلاف ہے، ایک بار حرم کے اندر درخت لگانے کے متعلق ایک سوال آیا تھا اس موقع پر فرمایا کہ اس کا جواب تو کسی کتاب میں کیا ملے گا مگر مصلحت اس میں ہے کہ جس مسئلہ کا بھی جواب دیا جائے کتاب میں جزئیہ دیکھ کر جواب دیا جائے، ورنہ اگر محض قیاس سے جواب دیئے جائیں گے تو نہ معلوم آج کل لوگ جوابات میں کیا کیا گڑبڑ کریں گے کیونکہ علم وفہم میں کمی کی وجہ سے تحقیق کا درجہ تو ان کو حاصل نہیں اور کسی کی تقلید کرنے میں عار آئے گی تو جو کچھ

[1] آداب التبلیغ ص: ۹۲ [2] جمال الجمیل ص: ۱۴۱ [3] آداب التبلیغ ص: ۹۳۔ [4] الافاضات ۱۰/۲۔

اس کا حشر ہوگا وہ ظاہر ہے اور وہ یہ کہ گمراہی پھیلے گی ۔[1]

اگر جزئیہ نہ ملے

اور اگر جزئیہ نہ ملے تو جواب سے عذر کر دیا جائے ۔[2]

اگر کوئی جزئیہ نہ ملا تو محض کلیات سے جواب نہ دوں گا لکھدوں گا کہ دیوبند یا سہارنپور سے دریافت کرلو ۔[3]

باقی جزئیہ غیر منصوصہ میں اجتہاد کر کے عمل کرنا جائز ہے ۔[4]

صرف ایک جزئیہ دیکھنا کافی نہیں بلکہ متعدد کتابیں دیکھنا چاہئے

کبھی جزئیہ دیکھ کر جواب لکھنے سے بھی غلطی ہوجاتی ہے مگر جزئیہ دیکھ کر جواب لکھنے سے جو غلطی ہوتی ہے کہ جب ایک ہی کتاب میں جزئیہ دیکھ کر لکھ دیا جائے اس لیے اس کی بھی ضرورت ہے کہ وہ جزئیہ بھی متعدد کتب سے دیکھ کر لکھے، انشاءاللہ پھر غلطی نہ ہوگی مسئلہ کا جواب بدون متعدد کتابوں میں دیکھے ہوئے مناسب نہیں، احتیاط کے خلاف ہے ۔[5]

غایت درجہ احتیاط

☆ دہلی سے ایک فتویٰ آیا جس کے اندر یہ سوال تھا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دیدی اس کے بعد اس سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ تم نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے، اس نے کہا ہاں دیدی، اس کے بعد ایک دوسرے شخص نے پھر یہی دریافت کیا تب بھی اس نے یہی کہا کہ ہاں میں نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی، تو یہ دوسری طلاق ہوگی یا پہلی طلاق کی حکایت ہوگی؟ حضرت نے یہ فتویٰ مشاہیر حضرات

---

[1] الافاضات ص:۱۴۵۔ [2] الافاضات ص:۱۴۵ [3] القول الجلیل ص:۳۔[4] دعوات عبدیت ۱۰۴/۴۔
[5] القول الجلیل ص:۳۶، انفاس عیسیٰ ص:۴۱۸

اہل علم کو جواس وقت مجلس شریف میں موجود تھے سنایا، ان حضرات نے اپنی رائے کا اظہار فرمایا جس میں زیادہ کی رائے حکایت کی تھی تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ جی ہاں میرے جی کو بھی یہی لگتا ہے، مگر جب تک کوئی اس قسم کا جزئیہ نہ مل جائے محض کلیات سے استنباط اور تعلیل کر کے جواب دینے کی ہمت نہیں پڑتی، اس لئے کہ ہم جیسے لوگوں سے تعلیل کے اندر بھی غلطی ہوجاتی ہے جیسے کہ کبھی جزئیہ دیکھ کر جواب لکھنے سے بھی غلطی ہوجاتی ہے، مگر جزئیہ دیکھ کر لکھنے سے جو غلطی ہوتی ہے تو وہ جب ہوتی ہے کہ جب ایک ہی کتاب میں جزئیہ دیکھ کر جواب لکھ دیا جائے، تو اس لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ وہ جزئیہ بھی متعدد کتب کے اندر دیکھ کر لکھے، انشاء اللہ پھر غلطی نہ ہوگی، پھر فرمایا کہ اگر کوئی جزئیہ نہ ملا تو میں (محض کلیات سے) جواب نہ دوں گا، یہ لکھ دوں گا کہ دیوبند یا سہارنپور سے دریافت کرلو۔[1]

نہایت ضروری تنبیہ

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ ایک کتاب میں مطلق ہے اور دوسری کتاب میں مقید ہے اس لیے مسائل مہمہ میں مفتی کو لازم ہے کہ صرف ایک کتاب میں دیکھ کر فتویٰ نہ دے بلکہ مختلف کتابوں میں دیکھ کر جواب دے۔

مثلاً طلاق کے باب الکنایات میں فقہاء نے لفظ اختاری کو کنایاتِ طلاق میں بیان کیا ہے اور اس کا حکم یہ بیان کیا ہے کہ اس سے وقوع طلاق نیت کے بعد ہوتا ہے تو اس سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختاری میں بھی صرف نیت سے طلاق کا وقوع ہوجائے گا۔

لیکن اسی اختاری سے وقوع طلاق کی ایک شرط اور بھی ہے جو باب التفویض میں مذکور ہے وہ یہ کہ اختاری میں نیت کے ساتھ وقوع نہیں ہوتا بلکہ عورت جب اس

[1] القول الجلیل ص ۳۶

مجلس میں طلاق کو اختیار کرلے اس وقت وقوع ہوتا ہے اور اختیار منکوحہ کی شرط فقہاء نے باب الکنایات میں نہیں بیان کی، بلکہ یہ شرط باب التفویض میں مذکور ہے اس میں بعض علماء تک بھی غلطی کر چکے ہیں۔

چنانچہ علامہ شامی نے ایک فقیہ کی غلطی نکالی ہے، فقہ کا فن بہت دقیق ہے اسی لیے میں فقہ حنفی کے سوا کسی دوسرے مذہب کی فقہی کتاب پڑھانے کی جرأت نہیں کرتا۔[1]

امام صاحب کا قول یا جزئیہ اگر صریح حدیث کے خلاف ہو

ہم جیسے نالائق امام اعظمؒ کے بعض فتووں کو غلط کہہ دیتے ہیں۔[2]

ایک شخص نے کہا کہ اس طرح تو پھر جزئیات فقہیہ میں احتمال غلطی کا رہے گا اس پر فرمایا کہ اگر کسی اور جزئی میں بھی ہم کو معلوم ہو جائے کہ حدیث صریح منصوص کے خلاف ہے تو چھوڑ دیں گے اور یہ تقلید کے خلاف نہیں ہے۔

آخر بعض مواقع میں امام صاحب کے اقوال کو بھی تو چھوڑا گیا ہے۔ ہاں جس جگہ حدیث کے متعدد محمل ہوں وہاں جس محمل پر مجتہد نے عمل کیا ہے ہم بھی اسی پر عمل کریں گے اور اگر خود امام صاحب ہوتے اور اس وقت ان سے دریافت کیا جاتا وہ بھی یہی فرماتے تو گویا اس چھوڑنے میں بھی امام صاحب کی ہی اطاعت ہے۔[1]

راجح و مرجوح میں موازنہ کر کے مرجوح کا ترک کرنا یہ وظیفہ بھی مجتہد کا ہے، گو مجتہد مقید ہو، البتہ اگر مقلد محض کو یہ معلوم ہو جائے کہ اپنے مذہب کی کوئی دلیل ہے ہی نہیں تو اس پر بھی واجب ہے کہ اس قول کو ترک کردے۔[2]

(باقی خود) عامی کو یہ کہنے کا منصب ہی کہاں ہے کہ مجتہد کا قول حدیث کے معارض ہے، اس کو حدیث کا علم مجتہد کے برابر کب ہے؟ نیز وہ تعارض و تطبیق کو مجتہد کے برابر کیسے جان سکتا ہے؟ (حسن العزیز ص ۳۵۳ ج ۴)

[1] حسن العزیز ۲/۰۷-۲۳ [2] التبلیغ الہدیٰ والمغفرہ: ۲۳۳ [1] حسن العزیز ۲/۰۷-۲۳ [2] امداد الفتاویٰ ۴/ ۴۹۷ سوال ۵۵۵

قادر کے نزدیک قوت دلیل کا اعتبار ہوگا

جو مسئلہ ہمارے اصحاب میں مختلف فیہ ہو اس کی قواعد ترجیح میں بعد تطبیق بین الاقوال المختلفۃ یہ فیصلہ ہے کہ جو شخص قوتِ دلیل کو سمجھ سکتا ہے، وہ اس قول کو لے جو دلیلاً اقویٰ ہو۔

فی مقدمة الدرالمختار رسم المفتی.... ان المجتهد یعنی من کان اهلا للنظر فی الدلیل یتبع من الأقوال ماکان أقویٰ دلیلا والا اتبع الترتیب السابق (یعنی یفتی بقول الامام علی الاطلاق ثم بقول الثانی ثم بقول الثالث ثم بقول زفروالحسن بن زیاد)وعن هٰذا نراهم قد یرجحون قول بعض أصحابه علی قوله کمارجحوا قول زفر وحده فی سبع عشرة مسئلة فتتبع مارجحوه لانهم أهل النظر فی الدلیل[1]

تبحر عالم اگر کسی مسئلہ کو خلاف دلیل سمجھے تو اس کا سمجھنا معتبر ہوگا، ایسے حضرات کا فہم معتبر ہوسکتا ہے جیسے حضرت مولانا گنگوہیؒ حضرت مولانا قاسم صاحبؒ[2]

جدید مسائل کا قواعد کلیہ سے جواب دینے کا طریقہ

فرمایا کہ ایک صاحب کا خط آیا ہے کہ انگریزی پڑھنے کے لیے وقف کرنے پر ثواب ہوگا یا نہیں؟ میں نے جواب میں لکھ دیا کہ انگریزی پڑھنے سے کیا نیت ہے؟ اور انگریزی پڑھنے کے قواعد کیا ہیں؟ اور کورس کیا ہے؟ اور اس کی ضرورت کیا ہے؟ اب جیسا جواب دیں گے حکم اسی پر مرتب ہوگا۔

قواعد سے اگر جواب لکھتا ہوں تو اس میں یہ احتیاط کرتا ہوں کہ یہ لکھ دیتا ہوں کہ قواعد سے یہ جواب لکھا ہے جزئیہ نہیں ملا۔[3]

---

[1] امداد الفتاویٰ ۳/۱۵۶، [2] حسن العزیز ۴۱۲، [3] اشرف المعمولات ص:۳۲۔

منصوص جزئیہ کا استخراج واجتہاد جائز نہیں

جن جزئیات کو فقہاء متقدمین مستخرج کر چکے ہیں ان کا استخراج اب جائز نہیں کیونکہ ضرورت نہیں اور جزئیہ منصوصہ کا استخراج جدید اس لیے جائز نہیں کہ حضرات سلف علم میں، فراست میں، تقویٰ میں، زہد میں، جہد فی الدین میں، غرض سب باتوں میں ہم سے بڑھے ہوئے تھے تو تعارض کے وقت ان کا اجتہاد مقدم ہوگا۔

البتہ جن جزئیات کا وقوع اس زمانے میں نہیں ہوا تھا اور فقہاء نے اس کی تصریح نہیں فرمائی ایسے جزئیات کا انطباق ان کے قواعد مدوّنہ پر جائز ہے اور ایسے لوگ ہر زمانے میں موجود رہتے ہیں ورنہ شریعت کو کامل نہیں کہہ سکیں گے۔[1]

جدید مسائل کو حل کرنے کا حق دار کون ہے؟

مجتہد اور متدین علماء اور اجتہاد سے میری مراد یہ ہے کہ وہ فقہاء کے اقوال کو واقعات پر صحیح طور پر منطبق کر سکتا ہو اور یہ اجتہاد ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ قیامت تک رہے گا۔ اور تدین سے مراد یہ ہے کہ اغراض کا تابع نہ ہو کہ کھینچ تان کر ناجائز کو حدّ جواز میں لائے۔[2]

مسائل کے حل کرنے میں امت کی سہولت کا خیال رکھنا

یہ وہ وقت ہے کہ آج کل مشتبہ چیز کو بھی حلال کہا جاتا ہے نہ کہ حلال کو بھی اس میں شبہات نکال کر حرام کر دیا جائے بس یہ معیار یاد رکھو کہ جس کو فقہی فتویٰ حلال کہہ دے بس وہ حلال ہے۔[3]

اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ فتویٰ میں تنگی نہ کرنا چاہئے جائز تک رکھئے تو غنیمت ہے، اولیٰ پر تو کہاں پابندی ہو سکتی ہے اختلافی مسئلہ میں اگر ابتلائے عام ہو تو اس کو بھی جائز بتلائیے، مگر یہ معاملات میں ہے نہ کہ شطرنج وغیرہ میں کیونکہ معاملات میں تو تنگی

---

[1] دعوات عبدیت ص: ۱۰۳-۱۰۴ [2] انفاس عیسیٰ ص ۱۸۰ [3] التبلیغ ۱۰/ ۶۷

کرنے سے تکلیف ہوتی ہے اور شطرنج وغیرہ کے روکنے سے کیا تکلیف ہے۔[1]

(اسی طرح) یہ توسع معاملات میں کیا گیا، دیانات میں نہیں (کیونکہ اس میں کچھ اضطرار نہیں) اسی لئے جمعہ فی القریٰ میں محض ابتلاء عوام کے سبب ایسا توسع نہیں کیا۔[2]

عموم بلویٰ کی وجہ سے ضعیف قول پر فتویٰ دینے کا ضابطہ

عموم بلویٰ کی وجہ سے صرف اختلافیات میں ضعیف قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے، جو چیزیں بالاتفاق حرام ہیں ان میں عموم بلویٰ کو کوئی اثر نہیں۔[3]

میں تو ہمیشہ سے یہ سمجھے ہوئے ہوں کہ مجتہد فیہ میں عموم بلویٰ کا اعتبار ہونا چاہئے، قرأت میں بھی اس کی ضرورت ہے متأخرین نے میری رائے میں ٹھیک کیا۔[4]

عموم بلویٰ وہاں چل سکتا ہے جہاں مسئلہ مختلف فیہ ہو، وہاں اپنا مسلک بوجہ عموم بلویٰ ترک کر سکتے ہیں۔[5]

امت کو فتنہ اور تشویش سے بچانے کے لئے بجائے راجح کے مرجوح کو اختیار کرنا

جس مسئلہ میں کسی عالم وسیع النظر ذکی الفہم منصف مزاج کو اپنی تحقیق سے یا کسی عامی کو ایسے عالم سے بشرطیکہ متقی بھی ہو بشہادت قلب معلوم ہو جائے کہ اس مسئلہ میں راجح دوسری جانب ہے تو دیکھنا چاہئے کہ اس مرجوح جانب میں بھی دلیل شرعی سے عمل کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر گنجائش ہو تو ایسے موقع پر جہاں احتمال فتنہ وتشویش عوام کا ہو مسلمانوں کو تفریق کلمہ سے بچانے کے لئے اولیٰ یہی ہے کہ اس مرجوح جانب پر عمل

---

[1] التبلیغ ۸۲/۱۵، احکام المال [2] انفاس عیسیٰ ص ۲۳۴ [3] ملفوظات دعوات عبدیت ص ۱۲۶ ج ۱۹
[4] حسن العزیز ۲۴۷/۱ [5] کمالات اشرفیہ ۳۱۴

کرے دلیل اس کی یہ حدیثیں ہیں۔

حدیث:(۱) **عن عائشه قالت قال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم الم تران قومک حین بنواالکعبة اقتصر واعن قواعد ابراهیم فقلت یارسول الله الا تردها علی قوا عدابراهیم؟ فقال لو لا حدثان قومک بالکفر لفعلت الحدیث اخرجه الستة الا ابادأود** تیسیر کلکتہ ص ۳۶۸ کتاب الفضائل باب سادس فصل ثانی۔

(ترجمہ) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ مجھ سے ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم کو معلوم نہیں کہ تمہاری قوم یعنی قریش نے جب کعبہ بنایا ہے تو بنیا دابراہیمی سے کمی کردی ہے، میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر آپ اسی بنیاد پر تعمیر کرادیجئے، فرمایا کہ اگر قریش کا زمانہ کفر سے قریب نہ ہوتا تو میں ایسا ہی کرتا، روایت کیا اس کو بخاری ومسلم اور ترمذی اور نسائی اور مالک نے۔

فائدہ: یعنی لوگوں میں خواہ مخواہ تشویش پھیل جائے گی کہ دیکھو کعبہ گرادیا اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کرتا، دیکھئے باوجودیکہ جانب راجح یہی تھی کہ قواعد ابراہیمی پر تعمیر کرادیا جاتا مگر چونکہ دوسری جانب بھی یعنی ناتمام رہنے دینا بھی شرعاً جائز تھی گو مرجوح تھی، آپ نے بخوف فتنہ وتشویش اسی جانب مرجوح کو اختیار فرمایا چنانچہ جب جب یہ احتمال رفع ہوگیا تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اسی حدیث کی وجہ سے اس کو درست کردیا، گو پھر اس تعمیر کو حجاج بن یوسف نے قائم نہیں رکھا غرض حدیث کی دلالت مطلوب مذکور پر صاف ہے۔

حدیث:(۲) **عن ابن مسعود انه صلی اربعاً فقیل له عبت علی عثمان ثم صلیت اربعاً فقال الخلاف شر،اخرجه ابو داؤد** تیسیر کلکتہ ص ۲۳۹ کتاب الصلوٰۃ باب ثامن۔

(ترجمہ) حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (سفر میں) فرض چار رکعت پڑھی کسی نے پوچھا کہ تم نے حضرت عثمانؓ (پر قصر نہ کرنے میں) اعتراض کیا تھا، پھر

خود چار پڑھی آپ نے جواب دیا کہ خلاف کرنا موجب شر ہے روایت کیا اس کو ابوداؤد نے۔

فائدہ: اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ باوجودیکہ ابن مسعودؓ کے نزدیک جانب راجح سفر میں قصر کرنا ہے مگر صرف شر وخلاف سے بچنے کے لئے اتمام فرمالیا جو جانب مرجوح تھی مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی جائز سمجھتے تھے بہرحال ان حدیثوں سے اس کی تائید ہوگئی کہ اگر جانب مرجوح بھی جائز ہو تو اسی کو اختیار کرنا اولیٰ ہے۔

اور اگر اس جانب مرجوح میں گنجائش عمل نہیں بلکہ ترکِ واجب یا ارتکاب امر ناجائز لازم آتا ہے اور بجز قیاس کے اس پر کوئی دلیل نہیں پائی جاتی اور جانبِ راجح میں صحیح صریح موجود ہے، اس وقت بلاتردد (ترک تقلید کرکے) حدیث پر عمل کرنا واجب ہوگا، اور (خاص) اس مسئلہ میں کسی طرح تقلید جائز نہ ہوگی کیونکہ اصل دین قرآن وحدیث ہے اور تقلید سے یہی مقصود ہے کہ قرآن وحدیث پر سہولت وسلامتی سے عمل ہو، جب دونوں میں موافقت نہ رہی، قرآن وحدیث پر عمل ہوگا، ایسی حالت میں بھی اسی پر جمار ہنا یہی تقلید ہے جس کی مذمت قرآن وحدیث واقوال علماء میں آئی ہے۔[1]

معاملات میں خصوصیت کے ساتھ توسع اختیار کرنا

شریعت میں وسعت ہے میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر کسی مسئلہ میں مجتہدین کا اختلاف بھی ہو مگر آج کل کے مجتہدین کا اختلاف نہیں، اور اس میں عام ابتلاء ہو تو اس کو بھی جائز کہنا چاہئے، وجہ یہ ہے کہ معاملات بہت گندے ہو رہے ہیں، اگر مختلف فیہ امور کو حرام بتلایا جائے گا تو اگر اس پر کوئی عمل کرے گا تو اس کو تنگی ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شریعت کو تنگ سمجھنے لگے گا اور اگر عمل نہ کرے گا تو وہ ان کو اور محرمات اجماعیہ کو برا سمجھے گا اور دونوں میں مبتلا ہو جائے گا اس لیے غلو نہیں کرنا چاہئے تنگی میں، بلکہ وسعت کرنی چاہئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ وسعت ہونے سے اعتقاد درست ہوگا کہ شریعت کیسی اچھی چیز ہے

[1] الاقتصاد ص۸۴، ۸۵

اور کیسی رحمت ہے، لوگوں کا تو یہ گمان ہوگیا ہے کہ شریعت میں تو سوائے لا یجوز کے اور کچھ ہے ہی نہیں، حالانکہ شریعت میں لا یجوز بہت کم ہے، یجوز کثرت سے ہے، جو فقہ سے واقف ہے وہ اس کو خوب جانتا ہے وسعت دینے میں ایک تو شریعت سے محبت ہوگی دوسرے جواس سے منتفع ہوگا آرام سے رہے گا اس سے حق تعالیٰ کی محبت غالب ہوگی۔[1]

امت کو تنگی سے بچانے کے لئے دوسرے مذہب کو اختیار کرنا

فرمایا: مردوں کی غفلت اور ظلم سے عاجز آ کر جو عورتیں کثرت سے مرتد ہو رہی ہیں اس کے متعلق ایک رسالہ ترتیب دیا ہے جس کا نام الحیلۃ الناجزۃ ہے۔۔۔۔اس رسالہ کے متعلق بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس رسالہ کا حاصل تو یہ ہوا کہ حنفیت کو چھوڑ دو، منشاء اس اعتراض کا یہ ہے کہ اس میں بعض صورتوں میں دوسرے ائمہ کے مذاہب پر بھی فتویٰ دیا گیا ہے، میں کہتا ہوں کہ حنفیت نہ چھوٹے چاہے اسلام چھوٹ جائے؟ جب اسلام اور ایمان ہی جاتا رہا تو وہ کیا ہوگا؟ حنفی یا شافعی یا مالکی یا حنبلی، مقلد یا غیر مقلد؟ دیکھئے کیا عقلیں ہیں، اگر یہ فتویٰ لیا جائے کہ ایک شخص یا مرتد ہوتا ہے یا غیر مقلدی اختیار کرتا ہے تو شرعاً کیا حکم ہے؟ تو اس پر کیا فتویٰ دیتے ہو؟[2]

دوسرے مذہب کو اختیار کرنا کب جائز ہے؟

(درمختار اور شامی کی عبارت۔۔۔۔) ان روایات سے معلوم ہوا کہ دوسرے مجتہد کے قول پر عمل کرنا یا تو اس وقت جائز ہے جب اپنے مذہب کے مکروہ کا ارتکاب لازم نہ آئے، اور یا موضع ضرورت میں جائز ہے۔۔اور ضرورت کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی ضرر لاحق ہونے لگے اور ضرر سے مراد حرج اور تنگی اور مشقت ہے۔ (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) (امداد الفتاویٰ ص ۶۴۰ ج ۱ سوال نمبر ۵۶۲)

[1] التبلیغ ص ۹۷ ج ۱۵ [2] ملفوظات حکیم الامت ص ۱۸ ج ۳ قسط ۱ ملفوظ نمبر ۲۲ و ص ۷۷ ج ۳ قسط ۲ ملفوظ نمبر ۲۰۸

فصل (۲)

ضرورت کے وقت دوسرے مذاہب پر فتویٰ دینے کی گنجائش

ضرورت شدیدہ اور ابتلائے عام کے وقت حنفیہ کے نزدیک دوسرے ائمہ کے مذہب کو اختیار کر کے اس پر فتویٰ دے دینا جائز ہے، لیکن عوام کو خود اپنی رائے سے جس مسئلہ میں چاہیں ایسا کر لینے کی اجازت نہیں، بلکہ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

اور اس زمانہ میں احتیاط اس طرح ہو سکتی ہے کہ جب تک محقق ومتدین علمائے کرام میں سے متعدد حضرات کسی مسئلہ میں ضرورت کا تحقق تسلیم کر کے دوسرے امام کے مذہب پر فتویٰ نہ دیں اس وقت تک ہرگز اپنے امام کے مذہب کو نہ چھوڑے، کیونکہ مذہب غیر کو لینے کے لئے یہ شرط ہے کہ اتباع ہویٰ کی بناء پر نہ ہو، بلکہ ضرورت داعیہ کی وجہ سے ہو اور ضرورت وہی معتبر ہے جس کو علمائے اہل بصیرت ضرورت سمجھیں۔

اور اس زمانہ پرفتن میں یہ دونوں باتیں جمع ہونا یعنی کسی ایک شخص میں تدین کامل ومہارت تامہ کا اجتماع نایاب ہے، اس لئے اس زمانہ میں اطمینان کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ کم از کم دو چار محقق علماء دین کسی امر میں ضرورت کو تسلیم کر کے مذہب غیر پر فتویٰ دیں بدون اس کے اس زمانہ میں اگر اقوال ضعیفہ اور مذہب غیر کو لینے کی اجازت دی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ ہدم مذہب ہے، کما لا یخفی واللہ اعلم بالصواب۔ (الحیلۃ الناجزۃ ص ۴۶)

فرمایا: کہ دیانات میں تو نہیں لیکن معاملات میں جن میں ابتلاء عام ہوتا ہے دوسرے امام کے قول پر بھی اگر جواز کی گنجائش ہوتی ہے تو اس پر فتویٰ دفع حرج کے لیے دے دیتا ہوں اگر چہ ابوحنیفہؒ کے قول کے خلاف ہو، اگر چہ مجھے اس گنجائش پر پہلے سے اطمینان تھا لیکن میں نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے اس کے متعلق اجازت لے لی میں نے دریافت کیا تھا کہ معاملات میں محل ضرورت میں دوسرے امام کے قول پر فتویٰ دینا جائز ہے؟ فرمایا کہ جائز ہے۔ (دعوات عبدیت ص ۱۲۴ ج ۹)

ضرورت کے وقت افتاء بمذہب الغیر متقدمین ومتاخرین کی تصریحات سے ثابت ہے

اصل مسئلہ افتاء بمذہب الغیر کا۔۔۔۔۔تو متقدمین ومتاخرین کی تصریحات سے ثابت ہے چنانچہ استیجار علی تعلیم القرآن کے جواز پر متاخرین میں سے صاحب ہدایہ وقاضی خاں اور صاحب کنز وغیرہ سب محققین فتویٰ دیتے ہیں اور متقدمین میں سے امام فضلی اور فقیہ ابواللیث نے بھی فتویٰ دیا تھا اس سے صاف طور پر ثابت ہوا کہ ضرورت کے وقت مذہب غیر پر فتویٰ دینے کے جواز پر مشائخ کا اتفاق ہے، اس کے بعد کسی خاص مسئلہ میں بالتخصیص فتویٰ منقول ہونے کی ضرورت نہیں رہتی۔

مسئلہ افتاء بمذہب الغیر للضرورۃ کی اصل خود امام ابو یوسفؒ سے بھی منقول ہے چنانچہ شامی نے رسم المفتی میں بحوالہ بزازیہ نقل کیا ہے **انہ، صلی الجمعة مغتسلا من الحمام ثم اخبر بفارة مَیتة فی بیرِ الحمام فقال: نأخذبقول اخواننا من اهل المدينةاذا بلغ الماء قلتين لم يحمل خبثاً الخ**[1]

ضرورت کی وجہ سے دوسرے مذہب پر فتویٰ دینے کی اجازت ہر زمانہ میں ہے

بوقت ضرورت دوسرے مذہب پر عمل جائز ہے اور اس ضرورت میں یہ قید نہیں کہ اس کا تحقق کب ہوا ہے، بلکہ علی الاطلاق ضرورت کا لفظ استعمال کیا ہے جو عام ہے ہر ضرورت کو خواہ وہ کسی زمانہ میں پیدا ہوئی ہو جیسا کہ علامہ نے عقود رسم المفتی میں بھی

[1] الحیلۃ الناجزۃ، رفاق المجتہدین، ص۲۲۰

ضرورت کو عام رکھا ہے بلکہ اس میں صفحہ ۴۵ پر **فهذه كلها قد تغيرت احكامها لتغير الزمان إما للضرورة وإما للعرف وإما لقرائن الاحوال الخ** ۔ کے بعد جو تحریر فرمایا ہے **فان قلت العرف يتغير مرة بعد مرة فلو حدث عرف آخر لم يقع فى الزمان السابق فهل يسوغ للمفتى مخالفة المنصوص واتباع العرف الحادث ؟قلت : نعم فان المتأخرين الذين خالفوا المنصوص فى المسائل المارة، لم يخالفوه إلا لحدوث عرف بعد زمن الإمام فللمفتى إتباع عرفه الحادث فى الألفاظ العرفية وكذا فى الأحكام التى بناها المجتهد علىٰ ما كان فى عرف زمانه وتغير عرفه الى عرف آخر اقتداء بهم الخ**۔

اس میں تصریح ہے کہ اس زمانہ میں بھی تغیر زمان ضرورت جدیدہ کی وجہ سے ہو جائے تو اہل فتویٰ کا مذہب غیر پر فتویٰ دینا جائز ہے۔[1]

دوسرے مذہب پر فتویٰ دینے کے بعض اہم شرائط

(۱) شرط اولین تو یہی ہے کہ مذہب غیر پر عمل کرنا ضرورت شدیدہ کی بناء پر ہو، اتباع ہوا کے لئے نہ ہو اور اس شرط پر تمام امت کا اجماع اور اتفاق علامہ ابن تیمیہ نے نقل کیا ہے۔[2]

(۲) افتاء بمذہب الغیر ہر زمانہ میں جائز ہے بشرطیکہ سخت ضرورت ہو کہ مذہب غیر کے لئے بدون، کوئی تکلیف نا قابل برداشت پیش آجائے (ضرورت کا معیار اوپر گذر چکا)

(۳) کسی مسئلہ میں دوسرے امام کا مذہب لینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس مسئلہ میں اس امام کے نزدیک جو شرطیں ہوں ان سب کی رعایت کی جاوے۔ (درمختار، شامی[3])

اگر کسی عمل میں بضرورت دوسرے مذہب پر عمل کیا جائے تو اس عمل کی تمام جزئیات پر عمل کرنا چاہئے۔[4]

(۴) اور ایک شرط مذہب غیر پر عمل کرنے کی جمہور علماء کے نزدیک یہ بھی ہے

---

[1] الحیلۃ الناجزۃ: ۴۷ [2] فتاویٰ ابن تیمیہ ۲/۲۴۰ [3] الحیلۃ الناجزۃ ص ۷۰ [4] حسن العزیز ۴/۶۴

کہ تلفیق خارقِ اجماع نہ ہوحتیٰ کہ صاحب درمختار نے اس پر اجماع بایں الفاظ بیان کیا ہے، **ان الحکم الملفق باطل بالا جماع** اوراس شرط کی تفاصیل وقیود میں کلام طویل اور اختلاف کثیر ہے جس کو ایک مستقل رسالہ ''التحقیق فی التلفیق'' میں ضبط کر کے اعلاء السنن کی کتاب البیوع کے مقدمہ کا جزء بنادیا گیا ہے۔[1]

تلفیق کی تعریف اوراس کی مثال

مثلاً اگر وضو کرنے کے بعد خون نکل آیا تو امام ابوحنیفہؒ کے مذہب پر تو وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعیؒ کے مذہب پر نہیں ٹوٹا، سو یہاں تو یہ شخص شافعی مذہب اختیار کرے اور پھر اس نے بیوی کو بھی ہاتھ لگایا تو اب شافعی کے مذہب پر وضو ٹوٹ گیا اور امام ابوحنیفہؒ کے مذہب پر نہیں ٹوٹا تو یہاں حنفیہ کا مذہب لے لے، حالانکہ اس صورت میں کسی امام کے نزدیک وضو نہیں رہا، امام ابوحنیفہ کے نزدیک تو خون نکلنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا اور امام شافعی کے نزدیک عورت کے چھونے کی وجہ سے۔[2]

(یا مثلاً) کوئی شخص مس مرأۃ بھی کرے اور فصد بھی کھلوائے اور مس ذکر کرے، پھر وضو نہ کرے اور نماز پڑھے تو جس امام سے پوچھے گا وہ اس کی نماز کو باطل کہے گا تو باجماع مرکب اس کی نماز باطل ہوگی اس کو تلفیق کہتے ہیں۔

ایک صاحب نے پوچھا کہ مختلف مسائل میں مختلف مجتہدوں کے قول پر عمل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

فرمایا: کہ جائز نہیں کیونکہ دین پابندی کا نام ہے اوراس میں مطلق العنانی (یعنی آزادی) ہے۔[3]

---

[1] الحیلۃ الناجزۃ ص ۲۶ [2] اشرف الجواب ص ۱۲۵ ج ۲ [3] دعوات عبدیت ص ۷۱ ج ۱۹

عمل واحد میں ضرورت کی وجہ سے بھی تلفیق کی اجازت نہیں

ہمارے نزدیک ان اقوال مختلفہ میں یہ قول اعدل الاقوال ہے کہ عمل واحد میں تلفیق خارق للاجماع کی اجازت نہ ہو اور دو عمل جداگانہ ہوں تو ان میں (ضرورت کے وقت) تلفیق کی اجازت دی جائے گو ظاہراً خلاف اجماع لازم آتا ہو۔

مثلاً کوئی شخص بے ترتیب وضو کرے تو شافعیہ کے نزدیک وضو صحیح نہیں، اور کوئی شخص ربع رأس سے کم مسح کرے تو حنفیہ کے نزدیک وضو نہیں ہوتا، پس اگر کوئی شخص اس طرح وضو کرے کہ ترتیب کی رعایت نہ ہو اور مسح کرے ربع رأس سے کم کا تو کسی کے نزدیک بھی وضو نہیں ہوا۔ اور یہ تلفیق خارج اجماع ہے۔

اور اگر کسی نے وضو میں چوتھائی سر سے کم میں مسح کیا اور نماز میں فاتحہ خلف الامام نہ پڑھی تو ظاہراً اس صورت میں بھی خرق اجماع لازم آتا ہے کہ وضو شافعیہ کے مذہب پر ہے اور نماز حنفیہ کے مذہب پر، مگر وضو جدا عمل ہے اور نماز جدا، اس واسطے یہ تلفیق (ضرورت کے وقت) منع نہیں۔[1]

محض حظِّ نفس کے لئے تلفیق جائز نہیں

بعض لوگوں نے محض اپنا مال بچانے کے لئے زیور کی زکوٰۃ کے مسئلہ میں امام شافعیؒ کا مذہب لے لیا، امام صاحب کے نزدیک زیور میں زکوٰۃ واجب ہے اور امام شافعی کے نزدیک نہیں ہے۔

سو خوب سمجھ لو کہ محض حظ نفس کے لئے کسی دوسرے امام کا مذہب اختیار کر لینا یہ دین نہیں بلکہ اتباع نفس اور تلاعب بالدین ہے (یعنی دین کو کھیل بنانا ہے) اس مسئلہ

[1] الحیلۃ الناجزۃ ص ۲۶

میں تو وہ شافعی ہو گئے ، پھر دوسری جگہ اگر کہیں پھنسے تو وہاں ابوحنیفہ کا قول لے لیتے ہیں،اس وقت حنفی بن جاتے ہیں،تو ان کا نفس ایسا ہے جیسے شتر مرغ کہ صورت میں اونٹ کے بھی مشابہ ہےاور پر دار ہونے کی وجہ سے پرندہ ہے،اب اگر اونٹ سمجھ کر کوئی اس پر بوجھ لادنا چاہے تو اپنے کو پرندہ کہتا ہےاوراس طرح جان بچاتا ہےاوراگر کوئی پرندہ سمجھ کر یہ کہے کہ ذرا اوپر کو اڑ کر دکھا دو،تو کہتا ہے کہ میں تو اونٹ ہوں، بھلا کہیں اونٹ بھی اڑا کرتا ہے،واقعی نفس کی یہی کیفیت ہے کہ یہ اپنے اوپر بات آنے ہی نہیں دیتا۔[1]

تلفیق کا وبال

یہ بڑی خطرناک بات ہے کہ محض دنیا کے واسطے اپنے فروع مذہب کو چھوڑ دے مثلاً شافعی ہے، محض دنیاوی غرض سے حنفی ہو جائے یا اگر حنفی ہو تو شافعی ہو جائے۔

علامہ شامیؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک فقیہ نے ایک محدث کے یہاں اس کی لڑکی کے لئے پیام بھیجا اس نے کہا اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ تم رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرو،فقیہ نے اس شرط کو منظور کر لیا اور نکاح ہو گیا۔

اس واقعہ کا ایک بزرگ کے پاس ذکر کیا گیا تو انہوں نے اس کو سن کر سر جھکا لیا،اورتھوڑی دیر سوچ کر فرمایا کہ مجھے اس شخص کے ایمان جاتے رہنے کا خوف ہے اس واسطے کہ جس بات کو وہ سنت سمجھ کر کرتا تھا بغیر اس کے کہ اس کی رائے کسی دلیل شرعی سے بدلی ہو،صرف دنیا کے لئے اس کو چھوڑ دیا،ایک مردار دنیا کے واسطے دین کو نثار کیا۔[2]

[1] اسباب الغفلۃ ملحقہ دین ودنیا ص ۴۸۰ [2] اشرف الجواب ص۱۲۵ ج۲

رفع یدین کرنے کی شرط پر نکاح کرنے سے سلب ایمان کا خطرہ اوراس پراشکال وجواب

مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادیؒ حضرت تھانویؒ کی خدمت میں تحریر فرماتے ہیں:

سوال: حسن العزیز (ج ۲ص ۲۳۹) پر یہ عبارت نظر آئی کہ ایک شخص تھے اصحاب فقہ میں سے انہوں نے اپنا پیام اصحاب حدیث میں کسی کے یہاں دیا، انہوں نے قید لگائی کہ تم کو رفع یدین وغیرہ کرنا ہوگا، انہوں نے منظور کرلیا، ایک بزرگ نے فرمایا کہ اس شخص کے بارے میں مجھے اندیشہ ہے کہ مرتے وقت اس کا ایمان نہ سلب ہوجائے، محض مردار دنیا کے لئے ایسی چیز کو بلاتحقیق ترک کردیا جس کو دین سمجھتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ رفع یدین اس شخص کے نزدیک معصیت تو نہ تھا، بس غیر افضل تھا، تو اگر ایک مقصد مباح کے لئے اس نے ایک سنت کے بجائے دوسری سنت پر عمل شروع کردیا تو اس میں سلب ایمان کے اندیشہ کی کون سی بات پیدا ہوگئی؟

جواب: یہ قصہ ردالمحتار شرح درمختار باب التعزیر قبیل باب السرقۃ میں مذکور ہے، اور یہ بزرگ ابوبکر جوزجانی ہیں جن کے قول کو خلاف تحقیق کہنے میں مبادرت نہیں ہوسکتی اور وہ تحقیق اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ سے ظاہر ہے کیونکہ بناء اس ترکِ سنت کی دوسری سنت کا من حیث السنّت اختیار کرنا نہ تھا بلکہ محض جیفہ دنیا کا دین پر ترجیح دینا تھا جس کی حقیقت استخفافِ دین اور استعظامِ دنیا ہے (یعنی دین کو حقیر اور دنیا کو بڑی چیز سمجھنا ہے) اور اس کا وہی اثر ظاہر ہے جو ان بزرگ نے فرمایا ورنہ سوال کے سب مقدمات نماز بقصد ریاء میں بدرجہ اولیٰ جاری ہیں کیا ریاء بھی مباح ہوجائے گی؟[۱]

---

[۱] حکیم الامت نقوش وتاثرات: ص ۱۳۱ و۱۳۴

دوسرے مذہب پر فتویٰ دینے کے سلسلہ میں نہایت ضروری تنبیہ

ضرورت کی وجہ سے مذہب غیر کو لے کر اُسی چیز کے جواز پر فتویٰ ہوسکتا ہے جس کا جواز مذہبِ غیر میں منصوص ہو، غیر مجتہد کو یہ جائز نہیں کہ منصوص فی مذہب الغیر پر قیاس کرکے کسی ایسی چیز کا جواز ثابت کرے جو دوسرے مذہب میں منصوص نہ ہو اور پھر ضرورت کی وجہ سے اس اپنے مستخرجہ جواز پر فتویٰ دے جیسا کہ بعض لوگوں نے علامہ شامیؒ کے زمانہ میں ضرورت کا دعویٰ کرکے تلاوتِ قرآن علی القبر وغیر کی اجرت کو جائز کہا تھا قیاسا علیٰ جواز تعلیمه المنصوص فی مذهب الامام مالک والشافعی، اوراس مقام پر علامہ کا اصل مقصود اسی قیاس فاسد کو رد کرنا ہے۔

حاصل رد یہ ہے کہ اولاً استیجار علی التلاوۃ کی ضرورت غیر مسلم، جو خروج عن المذہب کو جائز کرنے والی ہے اور اگر بالفرض ہم اس کی ضرورت کو تسلیم بھی کرلیں تب بھی جائز نہیں ہوسکتی، کیونکہ کسی مذہب میں بھی اس کا جواز منصوص نہیں اور تعلیم جو منصوص ہے اس پر اہل زمانہ کے لئے بوجہ غیر مجتہد ہونے کے تلاوت کو قیاس کرنے کا حق نہیں ہے، اگرچہ ایصال نفع بکتاب اللہ الی الغیر تلاوت میں بھی موجود ہے جو اصل مسئلہ یعنی رقیہ وارِدہ فی الحدیث کی علت ہے اور اسی علت کے سبب امام مالکؒ وشافعیؒ نے تعلیم القرآن کی اجرت کو جائز قرار دیا ہے۔ اوراسی واسطے فلنا ان نمنعه کے بعد وان وجدت فیه العلة فرمایا ہے یعنی اگرچہ اصل مسئلہ منصوصہ فی مذہب کی علت بھی پائی جاوے (یعنی) وان وجدت فیه العلة میں علت سے مراد علة الحکمه فی اصل المسئلة المنصوصة فی مذھب ہے نہ کہ علة الضرورة (الحیلۃ الناجزۃ ص ۴۹)

تنبیہ: مذہب غیر پر عمل کرنے کی شرط قضاء قاضی ہے (ان مسائل اوران صورتوں میں) جس صورت میں کہ اس عمل سے الزام علی الغیر ورفع حق غیر ہوتا ہو، واللہ اعلم۔ (امداد الفتاویٰ ص ۱۱۵ ج ۲)

دوسرے مذہب پرفتویٰ دینے کی چند مثالیں

(۱)سوال (۱۳۲) آج کل یہ دستور ہوگیا ہے کہ پیداوار ایکھ یعنی رس کا معاملۂ خرید، ایسے وقت ہوجاتا ہے کہ کہیں ایکھ بوئی بھی نہیں جاتی ہے، کہیں کچھ بوئی جاتی ہے، اگر نہیں خریدی جاتی تو عین وقت پر جب کہ رس تیار ہوملتی ہی نہیں ہے، اس صورت میں خریداری کھنڈسال کی اجازت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اگر اجازت نہ ہوتو غالباً کھنڈسال ہی نہ ہو یا بہت ہی زاید قیمت دینے پر شاید ملے۔

الجواب :عقد سلم میں مبیع کا وقت میعاد تک برابر پایا جانا حنفیہ کے نزدیک شرط ہے، اگر یہ شرط نہ پائی گئی تو عقد سلم جائز نہ ہوگا، لیکن شافعیؒ کے نزدیک صرف وقت میعاد پر پایا جانا کافی ہے، کذا فی الہدایہ، تو اگر ضرورت میں اس قول پر عمل کرلیا جاوے تو کچھ ملامت نہیں رخصت ہے۔[۱]

(۲) سوال (۲۹۴) زید نے اپنا بچھڑا بکر کو دیا کہ تو اس کی پرورش کر، بعد جوان ہونے کے اس کی قیمت کرکے ہم دونوں میں سے جو چاہے گا نصف قیمت دوسرے کو دے کر اس کو رکھ لے گا، یا زید نے خالد کو ریوڑ سونپا اور معاہدہ کرلیا کہ اس کو بعد ختم سال پھر پڑتال لیں گے، جو اس میں اضافہ ہوگا وہ باہم تقسیم کرلیں گے، یہ دونوں عقد شرعاً جائز ہیں یا قفیز طحان کے تحت میں ہیں؟ جیسا کہ عالمگیری جلد پنجم ص ۱۷۲ مطبوعہ احمدی میں ہے دفع بقرة الیٰ رجل علی ان یعلفها وما یکون من اللبن والثمن بینهما انصافا فالاجارة فاسدة۔

الجواب : کتب اِلَیَّ بعض الاصحاب من فتاویٰ ابن تیمیه کتاب الاختیارات مانصه: ولو دفع دابة اونخلة الیٰ من یقوم له وله جزء من نمائه صح وهو روایة عن احمد ۸۵/۴ ۔پس حنفیہ کے قواعد پر تو یہ عقد نا جائز

---

[۱] امداد الفتاویٰ ص ۱۰۶ ج ۳ سوال نمبر ۱۳۲

ہے، کما نقل فی السوال عن عالمگیریہ لیکن بنا بر نقل بعض اصحابِ امام احمد کے نزدیک اس میں جواز کی گنجائش ہے پس تحرز احوط ہے، اور جہاں ابتلاء شدید ہو توسع کیا جاسکتا ہے۔[1]

ناجائز کا فتویٰ دینے کے ساتھ جائز صورت بتلانے کا بھی اہتمام

سوال: ہمارے یہاں جتنے سینے والے (درزی) ہیں سب نے یہ مقرر کر رکھا ہے کہ جو کوئی شاگرد کرے اس شاگرد سے دس روپیہ کی مٹھائی لے کر سب سینے والوں کو تقسیم کرے چاہے وہ خوشی سے دے یا ناراضی سے دے مگر ضرور لینا چاہئے یہ روپیہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اس طرح جائز نہیں، البتہ اگر یہ ٹھہر جاوے کہ اتنے روز تک اور اتنے وقت تک سکھانے کی اجرت ہم دس روپے یا دس روپے کی چیز لیں گے اس طرح جائز ہے، پھر اتنے دنوں سکھلانا پڑے گا، مگر پھر یہ روپیہ یا چیز اس شخص کی ملک ہوگی تقسیم کرنا واجب نہیں بلکہ چونکہ (اصرار سے) دوسروں کا مانگنا ظلم ہے اور تقسیم اس ظلم کی اعانت ہے اس لئے تقسیم کے جواز میں بھی شبہ ہے۔[2]

جائز صورت اور حلال شکل بتانے کا اہتمام

سوال (۲۱۸) احقر سرکاری مدرسہ میں درجہ سوم و چہارم کی تعلیم دیتا ہے، اور درجہ چہارم کو ہر سال میں چار ماہ سود کے نکالنے کا قاعدہ بتلانا پڑتا ہے، اور سوالات مشتقیہ حل کرانے پڑتے ہیں، علاوہ اس کے باقی عرصہ میں اور اس عرصہ میں اور حساب بھی سکھلاتا ہوں، اور مدرسہ میں ہندو اور مسلمان سب قسم کے طلبہ ہیں، لہٰذا اس درجہ کو تعلیم دینا میرے واسطے جائز ہے یا نہیں؟ درجہ سوم میں اور حساب کی تعلیم ہے سود کی نہیں ہے۔

الجواب: آپ قبل تعلیم یہ کہہ دیا کریں کہ میں جو لفظ سود کہوں گا مراد میری وہ نفع جائز ہوگا جو کہ بلاشرط خود نیت کرلے کہ میں جب اس کا قرض ادا کروں گا تو میں اپنے

[1] امداد الفتاویٰ ص ۳۴۳ ج ۳ [2] امداد الفتاویٰ ص ۳۴۷ ج ۳

دل سے اور خوشی سے بدون اس کے استحقاق ومطالبہ کے اتنے حساب سے تبرعاً زیادہ دے دوں گا، بس اتنا کہہ کر پھر وہ حساب سکھلا دیں، تعلیم کا گناہ تو اسی وقت جاتا رہا ،اب اس سے اگر ناجائز طور پر کوئی کام لے گا تو اس پر وبال ہوگا۔

ایضاً: چونکہ حربی سے سود لینے میں کوئی خطاب شرعی نہیں ہے ،اس لئے اس کو حرام نہ کہا جاوے گا پس سود کی ایک صورت ایسی نکلی جو حرام نہیں ،اور یہ مسئلہ ہے کہ جس امر میں ایک صورت بھی حلال ہو اس کی تعلیم اعانت علی الحرام نہیں، پس آپ اس نیت سے سکھلاتے رہئے۔[1]

سوال (۲۲۲) شکل مندرجہ نمبر ایک کے ڈگری کو مدعی بقدر اصل ڈگری یعنی اسی روپئے کو ایک دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرتا ہے، خود تو سود نہیں لیتا ہے، لیکن اس کے علم میں یہ بات ہے کہ وہ سود لے گا یا اس سے نفع لیوے کسی سبب سے، اس کے ہاتھ یہ ڈگری فروخت کرتا ہے آیا اس بیع پر کوئی مؤاخذہ ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر یہ بائع مشتری سے حکم شرعی سے اطلاع کر کے خیر خواہانہ منع کر دے پھر بائع سبکدوش ہو جاوے گا، مگر خود ڈگری کا فروخت کرنا ہی محل کلام ہے، کیونکہ روپیہ روپیہ کا مبادلہ و بیع مشروط ہے دست بدست ہونے کے ساتھ اور یہ یہاں مفقود ہے۔

اس کی تدبیر یہ ہے کہ یہ بائع اس مشتری سے اتنے روپئے قرض لے اور مشتری سے کہے کہ ہمارا اتنا قرض فلاں فلاں مدعیٰ علیہ کے ذمہ آتا ہے ہم تو تم کو اس پر حوالہ کرتے ہیں تم اس سے وصول کر لو، اس طرح درست ہے، مگر اس میں ایک مشکل شرط یہ ہے کہ وہ مدعیٰ علیہ بھی بخوشی اس معاملہ سے رضامند ہو۔

اور اگر وہ رضامند نہ ہو تو ایک اور تدبیر یہ ہے کہ یہ بائع اس مشتری سے قرض

---

[1] امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۱۶۷

لے کر اس کو وکیل بنادے کہ تم مدعی علیہ سے وصول کرلو، اور وصول کرنے کے بعد تم اپنے قرضے میں رکھ لو اس طرح درست ہے۔[1]

جواب میں سوال سے زائد مفید باتوں کا اضافہ

اگر مستفتی نے ناجائز صورت پوچھی ہو تو جائز شکل اور اس کی صورت بھی بتلا دینا چاہئے

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ محرم کیا کپڑے پہنے؟ فرمایا کہ کرتا اور عمامہ اور پاجامہ اور وَرس زعفران کا رنگا ہوا نہ پہنے جوتہ نہ ہو تو موزہ پہنے اور ان کو جوتا کی طرح کاٹ لے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی طالب کوئی بات پوچھے مگر اور کوئی ضروری بات پوچھنے سے رہ جائے تو شفقت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس کے سوال کے جواب پر اکتفا نہ کرے بلکہ وہ دوسری بات از خود بتلا دے۔[2]

تقویٰ کے مقابلہ میں فتویٰ کو کب ترجیح ہوتی ہے

فرمایا کہ حکم شرعی یہ ہے کہ اگر تقویٰ کے کسی خاص درجہ پر عمل کرنے سے دوسرے کی دل شکنی ہو تو فتویٰ پر عمل کرنا چاہئے ایسے موقع پر تقوی کی حفاظت جائز نہیں چنانچہ کسی چیز کے نہ لینے میں اگر اپنی عزت ہو اور اپنے بھائی کی ذلت ہو اور لینے میں اپنی تو ذلت ہو، لیکن بھائی کی عزت ہو تو بھائی کی عزت کو اپنی عزت پر ترجیح دے یہ ایثار نفس ہے۔[3]

---

[1] امداد الفتاویٰ ج۳ ص۱۶۹ [2] اصلاح انقلاب ص۳۰۲ [3] ملفوظات کمالات اشرفیہ ص۹۳ ملفوظ نمبر۴۴۲

فصل (۳)

جب تک کہ شرح صدر نہ ہو اس وقت تک جواب دینا جائز نہیں

فرمایا کہ جب کسی سوال کے جواب میں شرح صدر و شفاء قلب نہ ہو صاف جواب دیدے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ ہر سوال کے لیے ضروری نہیں کہ اس کا جواب ہی دیا جائے نیز یہ بھی جواب ہے کہ ہم کو معلوم نہیں، لیکن لوگ جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں خواہ شفاء قلب ہو یا نہ ہو یہ جائز نہیں۔[۱]

مجھ کو جب تک شرح صدر نہ ہو جائے مسئلہ میں جواب نہیں دیتا، تردد کی صورت میں مسئلہ کا جواب دینا جائز نہیں اور اطمینان ہو جانے پر مؤاخذہ نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ مسئلہ کا جواب ہی دیا جائے خواہ اس میں تردد ہی ہو، بلکہ اگر خود اطمینان نہ ہو اوروں پر حوالہ کر دیا جائے کہ سائل دوسری جگہ دریافت کرلے اور اس میں راحت کیسی ہے اور خواہ مخواہ جواب دینے میں یہ ہے کہ روزانہ کتابیں دیکھو، ٹکریں مارو پھر اعتراض پڑے جواب دو۔

یہ ساری خرابیاں اپنے کو بڑا سمجھنے کی ہیں، یوں خیال کرتے ہیں کہ اگر جواب نہ دیا تو لوگ کہیں گے کہ جواب بھی نہ دیا، بعض علماء میں جو تاویل کا مرض ہے یہی خرابی کا باعث ہے کہ جو بات منہ سے نکل گئی اسی پر اڑے ہوئے ہیں، خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو، صرف اس وجہ سے کہ لوگ ذلیل سمجھیں گے۔[۲]

---

[۱] حسن العزیز: ۳۱۹/۲۔ [۲] حسن العزیز: ۵۹/۳۔

جواب سے قبل سوال کی توضیح بھی ضروری ہے

فرمایا: ایک مدرسہ سے خط آیا ہے کہ وہاں کے ایک مدرس صاحب نے تحریکات میں حصہ لیا تھا اور ڈیڑھ برس تک جیل میں رہے تو زمانۂ قید کی تنخواہ ان کو دینا چاہئے یا نہیں؟ میں نے جواب میں لکھا ہے کہ دو باتیں دریافت طلب ہیں (۱) نوکر رکھتے وقت ان سے معاہدہ کیا تھا (۲) وہ تنخواہ لینے والے کیا توجیہ کرتے ہیں صاف صاف لکھو تو جواب دوں [۱]

صورت مسئلہ کی تعیین بھی ضروری ہے

جواب تو جب ہی ہوسکتا ہے جب کہ سوال کی صورت متعین ہو، واقعات کی تنقیح جب تک نہ کی جائے گی جواب کس بات کا ہوگا، فرمایا: اس کے متعلق یہاں پر بہت سوال آتے ہیں جواب میں لکھ دیتا ہوں کہ زبانی سمجھنے کی بات ہے زبانی سمجھ لو۔ یہ اسی واسطے کہ سائل سے سوال کی تنقیح تو کر لی جائے [۲]

مجمل و مبہم غیر منقح سوالات ہوں تو کیا کرنا چاہئے

لوگ خطوط میں ایسے گنجلک سوالات بھیجتے ہیں، مجھے بڑا خلجان ہوتا ہے، سب امور کی تنقیح خط لکھنے والے سے کس طرح ممکن ہے ایسی صورت میں تو یہ لکھ دیتا ہوں کہ کسی عالم سے زبانی پوچھ لو، اور بعض اوقات تنقیحات بھی قائم کر کے لکھ کے بھیجتا ہوں لیکن اس صورت میں لکھتے وقت ممکن ہے کہ کوئی تنقیح ذہن میں نہ آئے اور پوچھنے سے رہ جائے [۳]

بہت سے سوالات میرے پاس لفظ یا کے ساتھ آتے ہیں جہاں یا ہو واپس کر کے لکھ دیتا ہوں کہ علیحدہ علیحدہ سوال قائم کر کے بھیجئے لوگوں کو طریقہ بتلانا چاہئے اگر دو باتیں پوچھنی ہوں الگ الگ کر کے پوچھئے مجھے تو دونوں باتوں کا ذہن میں رکھنا بڑا

۱؎ کلمۃ الحق ص:۱۳۱۔ ۲؎ الافاضات الیومیہ ۲/۱۸۔ ۳؎ حسن العزیز ۱/۱۲۹

مشکل معلوم ہوتا ہے۔

بعض دفعہ ایک صورت ذہن سے نکل جاتی ہے اور غلطی ہو جاتی ہے جواب میں اور اصل وجہ یہ ہے کہ ایک ایک صورت کا علیحدہ علیحدہ سوال ہو تو مختصر جواب ممکن ہے اور جو کئی صورتیں ایک ساتھ جمع کر دیں اور ان میں ہر ایک کا جدا جدا حکم ہوا تو جواب میں تفصیل کی تطویل ہوتی ہے اور مجیب کو پھر تمام سوالات کا اعادہ کرنا پڑتا ہے [1]

قابل تنقیح سوالات میں جواب سے پہلے تنقیح کی ضرورت

سوال (۱۱۹) کیا فرماتے ہیں علماء دین وشرع متین امور مستفسرہ ذیل میں قصبہ مئو میں کپڑے کے خریدار اس قسم کے زیادہ ہیں جو مال کی قیمت میں نصف سوت اور نصف زرنقد دیا کرتے ہیں، اگر اسامی یعنی بائع چاہے کہ مال کی قیمت بلاسوت کے کل زرنقد ملے تو خریدار مال خریدنے سے باز رہے گا، لیکن کل زرنقد دے کر مال خریدنا قبول نہیں کرے گا اور اسامی یعنی بائع کا حرج ہونے لگے گا اس صورت میں اسامی اپنا مال نصف سوت اور نصف زرنقد پر فروخت کرے تو یہ بیع جائز ہے یا ناجائز، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک سو روپئے کا مال فروخت ہوگا تو پچاس روپئے کا سوت ہوگا تو پچاس روپئے کا سوت اور پچاس روپئے زرنقد سے مال کی قیمت ادا کی جائے گی لیکن اس امر کا ذکر بائع اور مشتری کے درمیان خرید وفروخت کے وقت نہیں کیا جاتا ہے، مال کی قیمت طے کر لیتے ہیں کہ چالیس روپئے کا ہوا یا پچاس روپئے کا ہوا اور سوت کا نرخ بعض وقت قبل سے معلوم رہتا ہے اور بعض وقت مال فروخت ہو جانے کے بعد طے ہوتا ہے، اس معاملہ میں بائع اور مشتری دونوں رضامند ہو جاتے ہیں تو اس میں کیا قباحت ہے اس کا جواب بہت جلد عطا ہو (تم السؤال)

---

[1] احسن العزیز ص ۱۹۵

پھر یہاں سے اس پر یہ تنقیح کی گئی

یہ دست بدست ہوتا ہے یا اول قیمت دی جاتی ہے، پھر ایک میعاد کے بعد مال یا اس کا عکس اور میعاد معین ہوتی ہے یا نہیں۔(تم التنقیح)

اس تنقیح کا یہ جواب آیا

واضح ہو کہ بائع جس وقت مال اپنا فروخت کرتا ہے، اس کے مال کی قیمت میں کبھی اسی وقت دست بدست نصف سوت اور نصف زر نقد سے دام مل جاتے ہیں، لیکن اکثر خریدار دام دینے میں تاخیر کرتے ہیں، اور تاخیر کی میعاد ایک ہفتہ سے چار ہفتہ تک ٹھہرائی گئی ہے، یعنی ایک ہفتہ یا چار ہفتہ میں اس کے مال کی قیمت میں نصف سوت اور نصف زر نقد سے دام ملے گا، لیکن مال کی قیمت میں بائع کو جو سوت ملتا ہے، وہ اصلی نرخ سے کسی قدر گراں پڑتا ہے، یعنی فی بنڈل دو آنہ یعنی اگر اصلی نرخ بازار کے آٹھ روپے بنڈل ہوگی، تو مال کی قیمت میں جب سوت دیں گے تو دو آنہ اوپر آٹھ روپے بنڈل کا نرخ کر کے دیں گے، اس طرح پر کہ سولہ روپے مال کی قیمت ہوگی تو آٹھ روپے دو آنے کا ایک بنڈل سوت دیں گے اور سات روپے چودہ آنے نقد دیں گے، اس طرح پر بیع وشراء درست ہے یا نہیں؟ فقط۔

اس کا جواب حسب ذیل دیا گیا

الجواب: باقتضائے المعروف کالمشروط یہ تو یقینی ہو گیا کہ ثمن دو چیزوں کا مجموعہ ہے (یعنی) نقد اور سوت کا، پس یہ کہنا کہ سولہ روپے قیمت ہے مثلاً اس کے معنی مصطلح بقاعدہ بالا یہ ہیں کہ اس کی قیمت آٹھ روپے نقد اور آٹھ روپے کا سوت ہے مثلاً سوا گر

مجلس ہی میں تقابض ہوجاوے یعنی خریدار نے کپڑے پر قبضہ کرلیا، اور بائع نے ثمن، یعنی نقد اور سوت پر، تب تو بلاتکلف یہ بیع جائز ہے، اور اگر کل ثمن مجلس میں نہیں دیا گیا یا سوت نہیں دیا تو اس صورت میں بیع کے جائز ہونے کی یہ شرط ہے کہ عقد کے وقت سوت کا نرخ اور یہ کہ کتنا سوت دینا ہوگا تصریحاً مقرر ہوجاوے، کیونکہ یہاں سوت جزو ثمن ہے، اور ثمن کا معلوم ہونا صحت بیع کی شرط ہے اما نفس الجواز فلما فی الدرالمختار جاز بیع کرباس بقطن وغزل مطلقا، کیفما کان لاختلافھما جنسا اہ قلت ویستثنی منہ نوب یمکن نقضہ فیعود غزلا فانہ یشترط فیہ التقابض کمافی ردالمختار، ج ۴ ص ۲۸۵، ۲۸۶ [1]

جس فتوے کے بارے میں اطمینان نہ ہو کہ یہ سوال کسی سازش کے تحت ہے یا اس سے غلط فائدہ اٹھائے جانے کا خطرہ ہو اس کے جواب سے گریز

(سوال) مکرمی جناب قبلہ مولانا صاحب السلام علیکم

کچھ عرصے سے اس قصبہ میں چند تعلیم یافتہ نوجوانوں نے تبلیغ کا کام شروع کیا ہے، عامۃ المسلمین کوکلمہ طیبہ کے معنی بتلانے سے ابتدا کی ہے ان کو مندرجہ ذیل طریق پر کلمہ کے معنی بتائے جاتے ہیں۔

''لاالٰہ الا اللہ'' سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں ہے معبود کا مادہ عبد ہے، عبد کے معنی غلام، بندہ یا نوکر کے ہیں لہٰذا معبود کا مطلب ہوا جس کی غلامی، بندگی یا چاکری کی جائے، یا باالفاظ دیگر ''حاکم''

---

[1] امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۹۳ تا ۹۵

کا مفہوم بھی اس میں آجاتا ہے، اب اس کلمہ پر ایمان لانے اور اس کے اقرار کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ ایک طرف تو تمام دنیا بھر کے خداوندوں کے احکام کھڑے ہیں، جو رسم ورواج، خیالات، اخلاق، طرز رہائش اور معاشرت وغیرہ پر مشتمل ہیں اور دوسری طرف حکم خدا اور سنتِ رسول یعنی شریعت ہے، دونوں میں سے جس کو دل چاہے انسان قبول کرلے اس کا انکار کرنے والا کافر اور اقرار کرنے والا مسلمان ہوتا ہے، اس اقرار کے بعد انسان کو خدا کا بندہ بن کر رہنا پڑے گا، یہ نہیں ہوسکتا کہ شریعت کا ایک حکم تو قانون بن جائے اور دوسرے میں کاہلی اور سستی دکھلائی جائے یا رسم ورواج یا حب جاہ ومال وقوم وخاندان یا اولاد میں اسے رد کردیا جائے، یہ تمام احکام جن کی اطاعت محض خدا کے لئے کی جائے مسلمان کے لئے عبادت ہیں، کافر ومومن کا اصلی فرق بھی صاف ہے مسلمان صرف احکام خداوندی کو مشعل راہ بنائے گا، لیکن کافر خود مختار بنا رہے گا، ہر فعل مسلمان جو تعمیل حکم ایزدی میں کیا جائے عبادت خدا ہے چاہے بازار سے سودا خریدنا ہی کیوں نہ ہو۔''

ہمارے یہاں ایک مولوی صاحب ہیں ان کو اس مفہوم پر بڑا اعتراض ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''الٰــہ'' کو اس مفہوم میں نہیں لے سکتے، بلکہ صرف ''مسجود'' کے معنی میں ہی لے سکتے ہیں، دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ہر فعل جو نماز، روزہ کے علاوہ ہو چاہے محض خدا کے لئے کیا جائے عبادت نہیں ہے بلکہ اطاعت ہے، عبادت صرف نماز روزہ اور ذکر وتسبیح کو ہی کہا جاسکتا ہے، عبادت کے پہلے مفہوم سے یہ اطاعت ہم معنی ہوجاتی ہے اور عبادت اور اطاعت میں کوئی فرق نہیں رہتا، اگر عبادت اور اطاعت کا ایک ہی مطلب ہوتا تو قرآن میں عبادت اور اطاعت کے الفاظ جدا جدا کیوں آتے؟ ''اطاعت'' لفظ

عام ہے اور ''عبادت'' مخصوص ہے، مزید فرماتے ہیں کہ اگر عبادت کو انہی معنوں میں لیا جائے تو اطاعت رسول اطاعت اولواالامر اور اطاعت والدین کا مطلب بھی پھر عبادت رسول، عبادت اولواالامر، عبادت والدین ہو جائے گا، حالانکہ عبادت سوائے خدا کے کسی اور کے لئے شرک ہے، مزید برآں چونکہ عبادت غیر اللہ شرک ہے اس لئے اگر اطاعت اور عبادت ہم معنی ہوتے تو اطاعت غیر اللہ بھی شرک ٹھہرتی جو فی الواقع نہیں ہے۔

اپنے خیالات کی تائید میں فرماتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے ان امور کے بارے میں مہربانی فرما کر اپنی تحقیق سے بندہ کو مستفید فرمائیں، اپنے جواب میں آیات قرآنی سنت نبوی اور فیصلہ امام صاحب کا حوالہ بھی دیجئے، از حد شکر گذار ہوں گا، والسلام۔ علی احمد

(نوٹ) یہ مکتوب مولانا اشرف علی تھانویؒ مولانا محمد منظور نعمانیؒ مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ دہلی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی خدمت میں لکھا گیا تھا۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا جواب

از تھانہ بھون

مکرمی السلام علیکم

کیا اس کے قبل کوئی خط آپ کا آیا ہے، اگر آیا ہے تو دکھلائیں اگر نہیں آیا تو آپ اول اپنا تعارف کرائیں۔[1]

اشرف علی

[1] تلاش راہ حق ص ۱۸

احتمالِ فتنہ کی صورت میں جواب سے گریز

فرمایا: ایک شہر سے ایک خط آیا کہ یہاں فلاں لیڈر بہت آفت اٹھا رہے ہیں ایک فوج بنائی ہے ایک جھنڈا نکالا جاتا ہے پرتلے لوگوں کے ڈالے جاتے ہیں کہیں بار مونیم بجایا جاتا ہے، لہٰذا اس کے متعلق فتویٰ دیا جائے ہم شائع کریں گے، جواب حسب ذیل دیا گیا۔

احکام سب ظاہر ہیں لہٰذا اس صورت میں تبلیغ واجب نہیں، فتویٰ سے سوائے افتراق کے کچھ حاصل نہ ہوگا، پھر فرمایا: اسی وجہ سے ہم سے سب ناراض ہیں ان لیڈر کا خط آتا اس کا بھی خشک جواب جاتا ان کے مخالف کا آیا اس کا بھی خشک جواب جارہا ہے فتوے سے مقصود محض آڑ ہوتی ہے، اب تو پارٹیاں بن گئی ہیں اور ہم کسی پارٹی میں نہیں ہم تو یوں کہتے ہیں خدا کی پارٹی بننا چاہئے، اُولٰئِکَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [1]

اہم اور مفید سوال پر اظہار خوشی

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادیؒ کے ایک سوال کے جواب میں نفس جواب کے تحریر فرمانے سے قبل حکیم الامت حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

ماشاء اللہ نہایت ضروری سوال ہے، جس کی طرف کبھی التفات نہیں ہوا، جزاکم اللہ کہ آپ نے متوجہ کیا۔[2]

---

[1] القول الجلیل ص ۱۰ ملفوظ نمبر ۷ [2] حکیم الامت نقوش وتاثرات ص ۵۱۵

مبہم ومہمل غیر منقح سوال کا جواب نہیں دینا چاہئے

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت یہ جو آج کل حکومت کے مقابلہ کے واسطے لوگوں نے تدابیر اختیار کر رکھی ہیں ان کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ فرمایا کہ یہ سوال ہی مہمل ہے، ان تدابیر کا کچھ نام بھی ہے یا نہیں؟ واقعہ کی صورت بیان کر کے حکم معلوم کرنا چاہئے تھا، اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ مجھ کو علم غیب ہے کہ جو صورت تمہارے ذہن میں ہے اس کا مجھ کو بھی علم ہے، یا یہ کہ مجھ کو تمام صورتوں کا علم ہے پھر اس کے بعد دو معنی ہوئے ایک تو یہ کہ مجھ کو تمام صورتوں کا حکم بیان کرنا چاہئے، کیونکہ اگر ایک بھی بیان سے رہ گئی تو نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے اخیر میں کہہ دیا کہ ان میں سے اس صورت کا حکم نہیں معلوم ہوا جس کو میں معلوم کرنا چاہتا تھا، دوسرے یہ معنی ہوئے کہ میرا مشغلہ یہی ہے کہ تمام شقوق کی تحقیق کیا کروں اور پھر ان کا حکم ظاہر کیا کروں، آپ تو ایک ٹکا بھر زبان ہلا کر نواب بن کر بیٹھ گئے، اب میں تعمیل حکم کی انجام دہی میں مصروف کار ہوں، کیا بدتمیزی اور بدتہذیبی کی بات ہے، تم کو سوال پورا کرنا چاہئے تھا، اس وقت تم نے یہ مہمل سوال کر کے قلب کو پریشان کیا، اگر آدمی کو بولنے کی تمیز نہ ہو تو خاموش ہی بیٹھا رہے، کون سا یہ سوال فرض وواجب تھا اور کہاں کے آپ اتنے بڑے مرجع العالم مفتی ہیں کہ لوگ آپ کے پاس استفتیٰ بھیج کر ان صورتوں کا حکم معلوم کیا کرتے ہیں؟

فرمایا: لوگوں کو بیٹھے بٹھلائے کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور چاہئے اور کچھ نہیں تو یہ ہی سہی کہ فضول سوال کر کر کے مولویوں ہی کو تختۂ مشق بنائیں، جو چیزیں قابل اہتمام اور ضروری ہیں ان کا تو کہیں نام ونشان نہیں نہ ان کی فکر، بس غیر ضروری (چیزوں) میں ابتلا ہو رہا ہے۔

اب ضروری غیر ضروری کی تفسیر سمجھو! جس چیز کا اپنے سے تعلق نہ ہو بس وہ غیر ضروری ہے، پس جو چیز ضروری ہو آدمی اس کا حکم معلوم کرے، آج ہی خط آیا ہے

اس میں لکھا ہے کہ آج کل جو یہود اور نصرانی ہیں ان کی عورتوں سے نکاح بغیر مسلمان کئے ہوئے کیسا ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟ میں نے جواب لکھا ہے کہ جو شخص نکاح کر رہا ہے اس سے کہو کہ وہ خود مسئلہ دریافت کرے اور جس عورت سے نکاح کرنا ہے اس کے عقیدے اس سے معلوم کر کے لکھو تب ہم مسئلہ بتائیں گے۔

اگر اور جگہ یہ سوال جاتا تو ایک رسالہ تصنیف کر کے جواب میں روانہ کیا جاتا، یہاں سے یہ روکھا اور ضابطے کا جواب گیا تو بیچارہ کیا خوش ہوسکتا ہے، گالیاں ہی دے گا، خیر دیا کرے میں نے تو اس میں آئندہ کے لئے بھی تعلیم دے دی ہے کہ غیر ضروری چیزوں میں آدمی کو اپنا وقت نہ برباد کرنا چاہئے، ارے پہلے آدمی ضروری باتوں سے تو فراغ حاصل کر لے اور وہ ضروری بات یہ ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کی فکر کرے، معلوم ہوتا ہے ان سائل صاحب کی کسی سے گفتگو ہوئی ہوگی اس پر یہ تحقیقات شروع کر دی تاکہ جواب دکھلا کر دوسرے کو رسوا کریں، عام مذاق یہی ہو رہا ہے کہ دوسروں پر تو اگر مکھی بھی بیٹھی ہو تو اعتراض ہے اور اپنے جسم میں کیڑے پڑے ہوئے ہیں اس کی بھی فکر نہیں، اس قسم کے بہت سوال آتے ہیں یہاں سے جواب بھی ایسے ہی جاتے ہیں جس پر گالیاں ہی دیتے ہوں گے۔[1]

حالات کی تحقیق اور واقعات کی تنقیح کے بغیر جواب دینے سے احتیاط اور کشف حال کے لئے تحقیق کی ضرورت

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

آج کل ہندوستان میں مفاد ملکی کے نام سے ایسی سیاسی جماعتیں جو تنظیم وتعمیم کی جامع ہوں دو ہیں، ایک کانگریس دوسری مسلم لیگ اور دونوں اپنی اپنی طرف شرکت کی دعوت

[1] ملفوظات حکیم الامت ج۵ ص۱۲۴ ملفوظ نمبر ۱۳۱

دیتی ہیں ،اور نافعیت میں ایک کودوسرے پر ترجیح دینے میں اہل الرائے اختلاف رکھتے ہیں اوراسی کی تحقیق کے لئے مدت سے متردین کی طرف سے شرکت کے متعلق مختلف عنوانات سے سوالات کا سلسلہ جاری ہے،اب تک چونکہ دونوں کے واقعات کا کافی علم نہ تھااس لئے جواب کی بناءزیادہ تر سائلین کے بیان پر ہوتی تھی اور احیاناً جواب کے کچھ حصہ میں ثقات کی روایات کا بھی کچھ دخل ہوتا تھااور بعض اوقات بغرض مزید تحقیق خودسائل سے بھی واقعات کی تنقیح کی جاتی تھی اور ان بناؤں کے اختلاف سے مختتم جواب نہ ہوسکتا تھا جس سے ممکن ہے کہ سائل کوشفائے تام نہ ہوتی ہو اوراس صورت میں یقیناً ایسے جوابوں سے طریق عمل کا اخذ کرنا جوسوال سے اصل مقصود تھا دشواری سے خالی نہ تھا اس لئے سخت ضرورت تھی کہ واقعات کی مزید تعیین وتبیین کی جاوے جس کے لئے مختلف ذرائع اختیار کئے گئے ،جس میں خاص اہتمام کے بعد بحمداللہ تعالیٰ اتنی ضروری کامیابی ہوگئی جس سے انشاءاللہ تعالیٰ شافی جواب پیش کرنا ممکن ہوگیا اورآج آپ کا خط اس جواب کے پیش کرنے کا محرک ہوگیا، یہ چندسطریں اسی جواب کی حکایت ہے۔[1]

عنوان کی تعیین کے ساتھ ہی جواب دینا چاہیے

فرمایا: میں نے زمانۂ تحریک میں کہا تھا کہ اگر بجائے مبہم عنوانات کے عنوان کی تعیین کرکے سوالات کریں تو میں جواب دوں چاہے کسی کے بھی خلاف ہو، ایک صاحب کا اسی زمانہ میں ایک سوال آیا تھا میں نے کہا کہ ''ترک موالات'' کا عنوان حذف کرکے متعین واقعہ پوچھو جواب دوں گا۔[2]

---

[1] افادات اشرفیہ درمسائل سیاسیہ ص ۱۷ [2] مزید المجید ص:۶۳۔

سوال کی مختلف جہتوں اور شقوں پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے

فرمایا: بعض سوالات کا جواب دینے میں بہت تنگی ہوتی ہے، ایک صاحب نے دریافت کیا کہ میں حج کو جانا چاہتا ہوں، مجھ سے اجازت مانگتے ہیں اور وہ پہلے سے حاجی بھی ہیں ان کو منع کروں تو دل نہیں چاہتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ لوگ اس کو ممانعت پر محمول کر لیتے ہیں کہ دیکھو طاعت سے روکتے ہیں اول تو طاعت سے کوئی روکتا نہیں، اور چھوٹی طاعت سے روک کر کسی بڑی طاعت کا حکم کر دیں تو اس کو کوئی دیکھتا نہیں، اس لیے میں نے یہ لکھ دیا ہے کہ آپ کی اس سفر سے غرض کیا ہے؟ اب وہ خود سمجھ کر لکھیں گے۔

فرمایا: ایک رئیس کے ملازم کا خط آیا ہے اور سوال کیا ہے کہ آقا کو جھک کر سلام کرنا درست ہے؟ اب اگر لکھتا ہوں کہ درست ہے تو جواب غلط ہے، اور اگر لکھتا ہوں کہ نہیں، تو آقا کو خیال ہوگا کہ ہمارے نوکر کو بے ادب بنایا، میں نے لکھ دیا ہے کہ کیا وہ بے جھکے سلام کرنے سے ناراض ہوتے ہیں؟ اب اگر وہ سوال کرے گا اور لکھے گا کہ ناراض ہوتے ہیں تب میں لکھوں گا کہ درست نہیں اس صورت میں آقا کو معلوم ہونے پر یہی خیال ہوگا کہ اس نے سوال ہی ایسا کیا ہے جس کا جواب یہ ہے، میں اس قدر ان معاملات میں رعایتیں کرتا ہوں۔[1]

فرمایا کہ مسائل ذو جہتین میں اہل اغراض بزرگوں (مفتیوں) کو ایک رخ دکھلا کر اپنے ساتھ کر لیتے ہیں جس کا منشا حسن ظن ہوتا ہے دوسرے رخ کی طرف اس وقت التفات نہیں ہوتا لیکن اگر خصوصیت کے ساتھ کوئی شخص ان حضرات کو دوسرا رخ دکھلا کر استفتاء کرے تو وہ ضرور نکیر فرمائیں گے۔[2]

---

[1] الافاضات ۲۷۳/۸ [2] ملفوظات کمالات اشرفیہ ص:۹۲۔

جواب لکھنے میں جلد بازی نہ کرنا چاہئے اور دستی استفتاء کا جواب فوراً، اور پیچیدہ مسئلہ کا جواب زبانی نہ دینا چاہئے

مسئلوں کا معاملہ نازک ہوتا ہے کبھی کوئی کتاب دیکھنی ہوتی ہے اس میں تلاش کرنا ہوتا ہے کبھی غور کی ضرورت ہوتی ہے ادھر خط لانے والے کا تقاضہ ہوتا ہے (حالانکہ) جلدی میں امکان ہوتا ہے کہ غلطی رہ جائے یا نظر چوک جائے۔

چنانچہ ایک شخص دستی استفتاء فرائض کا لائے میں نے جواب لکھ دیا جب وہ چلا گیا تب خیال آیا کہ جواب میں غلطی ہوگئی، نہایت حیران تھا کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی، آخر حق تعالیٰ سے دعا کی کہ اب میرے اختیار سے خارج ہے آپ چاہیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں آدھ گھنٹہ کے بعد دیکھتا ہوں کہ وہی شخص چلا آرہا ہے پھر اس کو صحیح جواب لکھ کر حوالہ کیا اور عزم کر لیا کہ آئندہ کبھی دستی فتویٰ کا جواب ہاتھ کے ہاتھ نہ لکھ کر دوں گا۔

چنانچہ اب میں خط لانے والے سے یہی کہہ دیتا ہوں کہ ٹکٹ رکھ جاؤ ڈاک سے بھیج دوں گا۔[1]

عالم (ومفتی) کو چاہئے کہ (مسئلہ واستفتاء کا) جواب جلدی نہ دے، بلکہ سوچ سمجھ کر جواب دے، اور جو مسئلہ پیچیدہ ہو اس کا جواب زبانی کبھی نہ دیں[2]

یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ سوال سے سائل کی کیا مراد ہے

ایک صاحب کا خط آیا ہے کہ بلا مجامعت اور خلوت صحیحہ کے ایک شخص نے اپنی عورت کو تین طلاق دیدیا اس صورت میں عدت ہے یا نہیں؟ یہ سوال اگر کسی اور جگہ جاتا تو جواب میں لکھ دیتے کہ عدت نہیں، مگر مجھ کو وہم ہوا کہ معلوم نہیں یہ شخص خلوت صحیحہ کو بھی سمجھتا

---

[1] حسن العزیز ۱۲۴/۱ [2] بالاخواة التبلیغ ص ۹۳

ہے یا نہیں، جواب سے اس کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں نے لکھا ہے کہ خلوت صحیحہ تم کس کو سمجھتے ہو تمہارے ذہن میں خلوت صحیحہ کا مفہوم کیا ہے؟ ممکن ہے کہ خلوت صحیحہ کو سمجھتے ہی نہ ہوں تو جواب کو غلط سمجھتے۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تصور شیخ کے متعلق کیا حکم ہے؟ میں نے کہا کہ آپ تصور شیخ کا کیا مطلب سمجھتے ہیں، کہنے لگے کہ خدا کو پیر کی شکل میں دیکھنا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے خیر کی، ورنہ یہ شخص ہمیشہ کے لیے گمراہی میں مبتلا ہو جاتا تب میں نے اس کا نفی میں جواب دیا، یہ سب تجربہ کی باتیں ہیں [1]

جواب ہمیشہ ظاہری عبارت کے موافق ہونا چاہیے

ایک شخص ایک تحریری استفتاء لایا، حضرت نے فرمایا کہ اس میں یہ بات درج نہیں ہے کہ جو شخص طلاق دینا چاہتا ہے اس نے بعد نکاح صحبت کی یا نہیں؟ کیونکہ اس سے حکم بدل جائے گا، اس نے کہا کہ کئی سال نکاح کو ہو گئے صحبت ضرور کی ہے حضرت نے فرمایا کہ اس میں تو یہ نہیں لکھا اگر تم یہ بات صرف زبانی کہتے ہو زبانی مسئلہ کا جواب بھی سن لو یا اس میں لکھانا چاہتے ہو؟ اس نے کہا کہ میں تو اس میں لکھانا چاہتا ہوں حضرت نے فرمایا کہ پھر جب اس میں لکھا لاؤ گے تب اس میں جواب لکھا جائے گا [2]

جواب ہمیشہ واضح اور آسان زبان میں ہونا چاہیے

فرمایا کہ جو سوال کیا جائے اس کا بلا تکلف صاف صاف جواب دینا چاہیے گول پیچ دار الفاظ ہرگز نہ ہونے چاہئیں، تکلف اور تصنع جو آج کل بطور عادت ثانیہ کے ہو گئے ہیں بالکل خلوص کے خلاف اور نہایت تکلیف دہ چیزیں ہیں [3]

[1] الافاضات الیومیہ ۷/۳۴۲ س:۲۔ [2] حسن العزیز ۱/۱۳۶۔ [3] ملفوظات اشرفیہ ص:۳۳۹۔

دلائل وحوالے لکھنا چاہئے یا نہیں؟

فرمایا کہ سمجھ دار اور تحقیق پسند لوگوں سے دلیل بیان کرنا اور تشفی کر دینا مناسب ہے واجب یہ بھی نہیں الا آنکہ معلم تنخواہ اسی کی پاتا ہو۔[1]

آج کل کوڑ مغزوں کے لیے نقل ہی کی زیادہ ضرورت ہے درایت کا آج کل زمانہ نہیں۔[2]

صاحب ہدایہ حدیث کے حافظ تھے اس لیے ان کو حدیث کے حوالہ کی ضرورت نہ تھی اور اس وقت اتنا ہی کافی تھا کہ حدیث میں آیا ہے مگر اس زمانے میں چونکہ تدین نہیں رہا (اس لیے آج کل) حوالہ میں صفحہ وسطر سب کچھ لکھنا چاہئے تاکہ دوسرا دیکھ سکے۔[3]

عوام کے سامنے ایسے دقیق مضامین اور دلائل بیان کرنا جوان کی فہم سے بالاتر ہوں ممنوع ہے

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ لوگوں کے سامنے ایسی بات کرو جس کو وہ سمجھیں، کیا (سمجھ سے باہر باتیں کر کے) تم اس کو پسند کرتے ہو کہ خدا اور سول کی تکذیب کی جاوے؟ (یعنی جب وہ بات قرآن وحدیث سے صراحتًہ یا استدلالاً ثابت ہے تو خدا و رسول کی کہی ہوئی ہوئی، اور چونکہ سمجھ سے باہر ہے اس لئے عوام اس کی تکذیب کریں گے پس تم سبب ہوئے خدا اور سول کی تکذیب کے اور چونکہ ضروریات دین میں سے کوئی امر ایسا نہیں ہے لہٰذا یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ اس میں بعض دین کا کتمان لازم آتا ہے۔

(روایت کیا اس کو بخاری نے)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جب تم کسی قوم سے ایسی بات کرو گے کہ

---

[1] ملفوظات اشرفیہ ص: ۳۳۹۔ [2] الافاضات ۲/۴۲۴۔ [3] کلمۃ الحق ص: ۵۱۔

وہاں تک ان کی عقل کی رسائی نہ ہوتو وہ ضرور بعضوں کے لئے خرابی کا باعث ہوگی (روایت کیا اس کو مسلم نے، تیسیر ص ۳۱۸)

فائدہ: بعضے بے باک صوفی (اور علماء و مفتی) عوام کے سامنے بے تکلف تصوف کے دقائق (اور ایسے علمی مضامین) بیان کر بیٹھتے ہیں (جو ان کی فہم سے بالاتر ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں) بعضے عوام تو ان کو خلاف شریعت سمجھ کر ان کی تکذیب کرتے ہیں اور بعضے باوجود ان کی حقیقت نہ سمجھنے کے ان کو مان کر قواعد مشہورہ شرعیہ کے منکر ہوجاتے ہیں سو ہر حال میں اللہ و رسول کی تکذیب کا تحقق ہوا و الثانی أشد من الأول اس حدیث میں اس عادت کی ممانعت ہے۔[۱]

مفتی کے فتوے پر بغیر دلیل معلوم کئے عمل کرنا جائز ہے

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو بے تحقیق کوئی فتویٰ دیدے تو اس کا گناہ اس فتویٰ دینے والوں کو ہوگا روایت کیا اس کو ابوداؤد نے۔

فائدہ: دیکھئے اگر تقلید جائز نہ ہوتی اور کسی کے فتویٰ پر بدوں معرفتِ دلیل کے عمل جائز نہ ہوتا جو حاصل ہے تقلید کا تو گنہگار ہونے میں مفتی کی کیا تخصیص؟ بلکہ جس طرح مفتی کو غلط فتویٰ بتلانے کا گناہ ہوتا اسی طرح سائل کو دلیل تحقیق نہ کرنے کا گناہ ہوتا۔[۲]

(فتاوی المجتهدين بالنسبة الى العوام كالأدلة الشرعية بالنسبة الى المجتهدين ،والدليل عليه أن وجود الأدلة بالنسبة الى المقلدين وعد مها سواءٌ اذ كانوا لايستفيدون منها شيئاً ،فليس النظر فى الأدلة والاستنباط من شأنهم ،ولا يجوز ذالك لهم البتة ، وقد قال تعالىٰ فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لاَ تَعْلَمُوْنَ ،والمقلد غير عالم، فلايصح له الا سؤال أهل الذكر ،واليهم مرجعه فى احكام الدين على الاطلاق ، فهم اذاً القائمون له' مقام الشارع، واقوالهم قائمة مقام الشارع ،..........فثبت أن قول المجتهد دليل العامى ـ)(الموافقات للشاطبی، کتاب الاجتہاد، المسئلۃ التاسعۃ ص ۱۸۵ ج ۴)

---

[۱] التكشف عن مهمات التصوف ص: ۳۳۷ [۲] الاقتصاد فی بحث التقلید والاجتہاد

”صلعم“ لکھنا کافی نہیں ”صلی اللہ علیہ وسلم“ پورا لکھنا چاہئے

فرمایا کہ درود کا مخفف جو لوگ لکھتے ہیں ”صلعم“ یہ مناسب نہیں، گویا یہ درود سے ناگواری اور تنگی کی دلیل ہے، اور اگر کوئی شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک لکھے اور نہ زبان سے درود پڑھے اور نہ پورا درود کا صیغہ لکھے تو صرف ”صلعم“ لکھنا بالکل ناکافی ہے بلکہ پورا درود لکھنا یا زبان سے کہنا واجب ہے۔

(اسی طرح) پھر بھی ”رضی اللہ عنہ“ کا مخفف ”رضہ“، جو لکھتے ہیں اس کے متعلق فرمایا کہ مراتب کے تفاوت سے شاید کچھ تفاوت ہو جائے مگر نفس حکم تو مشترک ہے۔

عبرتناک حکایت

ایک مولوی صاحب نے حکایت سنائی کہ جس شخص نے اول اول ”صلعم“ لکھا تھا تو اس نے شب کو خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ جیسے تو نے میرے درود کو قطع کیا اسی طرح اللہ تعالیٰ تیرے ہاتھ کو قطع کرے چنانچہ صبح ہی کوئی واقعہ ایسا پیش آیا کہ اس کا ہاتھ قطع کر دیا گیا۔

حضرت نے فرمایا: جیسا کہ لوگوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درود میں اختصار کرلیا ہے اگر ایسا ہی اختصار کا برتاؤ حضور بھی ہمارے ساتھ کرنے لگیں تو پھر بھلا ہمارا کہاں ٹھکانا رہے۔

میرے نزدیک درود میں ایسا اختصار کرنا مناسب نہیں اور میں اسی کو ترجیح دیتا ہوں کہ ”صلعم“ لکھنا کافی نہیں، اس وقت متعدد مشاہیر حضرات اہل علم تشریف رکھتے تھے اور اس مسئلہ میں اظہار رائے فرما رہے تھے، اس وقت فرمایا کہ یہ موقع ادب کا ہے حضور کے حقوق ہم پر بے حد ہیں میں اس میں زیادہ کاوش کو مناسب نہیں سمجھتا۔[1]

---

[1] القول الجلیل ص ۳۴ ملفوظ نمبر ۲۰

فصل (۴)

غیر ضروری اور فضول سوال کا جواب

ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ ایک عورت جارہی تھی اس کے ساتھ اس کا شوہر بھی تھا اور اس کا بھائی بھی، راستہ میں کسی راہزن نے ان دونوں کو قتل کر دیا، اتفاقاً اس طرف سے ایک فقیر کا گذر ہوا اس عورت کی التجا سے فقیر نے کہا کہ ان دونوں کا سر دھڑ سے ملا کر رکھ دے، میں دعا کروں گا، عورت نے غلطی سے بھائی کا سر شوہر کے دھڑ میں اور شوہر کا سر بھائی کے دھڑ میں جوڑ دیا، فقیر نے دعا کی تو دونوں زندہ ہو گئے اس صورت میں عورت کس کو ملے گی؟

میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور سوال کرنے والے کو زجر وتوبیخ کی کیوں کہ ایسے سوال بالکل لغو اور بے ہودہ ہیں ایسے سوالات کا کوئی جواب نہ دینا چاہئے لوگوں کو چاہئے کہ اپنے کام کی باتیں دریافت کیا کریں ایسے فضول سوالات سے تضییع اوقات نہ کیا کریں۔[1]

کسی نے لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا انتقال پیشتر ہوا ہے یا حضرت حوا کا اور دونوں کے بیچ میں انتقال کے کس قدر زمانہ گزرا ہے؟

میں نے اس کا جواب دیا کہ ”میں نے کہیں نہیں دیکھا“۔[2]

ایک خط میں آیا تھا کہ معلوم ہوا ہے کہ بھوک کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شکم مبارک پر پتھر باندھا ہے، کتب سیر کے حوالے بھی دیئے ہیں پوچھا تھا کہ کیا یہ صحیح ہے؟ میں نے لکھا ہے کہ اگر صحیح ہے تو تم کیا کرو گے مطلب یہ ہے کہ غیر ضروری

---

[1] دعوات عبدیت ۴/۴۶۔ [2] دعوات عبدیت ۱۹/۸۸۔

تحقیق سے کیا فائدہ؟

ایک شخص ان کے پاس آیا اور سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین شریفین کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے اس سائل سے دریافت کیا کہ تم سے موت کے وقت یا قبر میں یا حشر میں یا میزان پر یہ سوال ہوگا؟ عرض کیا کہ نہیں؟ پھر کہا کہ کیا تم کو معلوم ہے کہ قیامت میں نماز کی اول پوچھ ہوگی عرض کیا کہ جی معلوم ہے کہا کہ اچھا بتلاؤ نماز میں فرائض، واجبات، سنن، مستحبات کیا کیا ہیں؟ بے چارہ گم ہوگیا، فرمایا کہ جاؤ کام کی باتوں میں وقت صرف کیا کرتے ہیں غیر ضروری سوال نہ کرنا چاہئے کم سے کم علماء کو تو چاہئے کہ سائل کے تابع نہ بنیں۔[1]

حضرت والا کے پاس ایک سوال آیا کہ اوج بن عنق اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کا عصا کتنے لمبے تھے؟ جواب لکھا کہ جیسے یہ سوال غیر ضروری ہے اسی طرح جواب کی بھی ضرورت نہیں، کسی لایعنی (فضول) سوال کا میں یہی جواب دیا کرتا ہوں کہ مجھے فرصت نہیں کسی کو کہہ دیا کہ اور عالم سے پوچھ لو کسی کا جواب بھی نہیں دیتا اور اگر جواب کے لیے ٹکٹ بھیجا ہو تو اس کو واپس کر دیتا ہوں کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق منظور نہیں ہے لہٰذا تضییع وقت سمجھ کر سکوت کیا جاتا ہے، کسی سے ایک دفعہ اصل مسئلہ کی تقریر کر کے فرمایا کہ اس سے زیادہ مجھ کو نہیں معلوم! آپ کی تشفی مجھ سے نہیں ہوسکتی۔[2]

سوال مختصر میں جواب بھی مختصر

حکیم الامت حضرت تھانویؒ ایک سوال کا جواب دینے سے قبل تحریر فرماتے ہیں:

طرز کلام سائل سے مفہوم ہوتا ہے کہ سائل کی طبیعت اختصار پسند ہے لہٰذا ہم بھی بحکم خیر الکلام ماقل ودل نہایت اختصار سے جواب دیتے ہیں۔[3]

---

[1] الافاضات الیومیہ ص۱۰۱ ج۲ [2] ملفوظات کمالات اشرفیہ ص:۳۳۹۔ [3] امداد الفتاویٰ ج۶ ص۱۳۶

فضول سوال کے جواب سے اعراض

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّةِ قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ (سورہ بقرہ پ۲)

(ترجمہ) آپ (ﷺ) سے چاند کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں، آپ ﷺ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلۂ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے۔

فائدہ: اس میں اعراض عن الفضول پر دلیل ہے اور اس پر بھی شیخ کو حق ہے کہ بعض سوالات سے منع کر دے خواہ صریحاً خواہ اس طور سے کہ جو پوچھا گیا ہے اس کا جواب نہ دے دوسرا جواب دے دے۔[1]

ضروری اور غیر ضروری سوال کا معیار

جو کلام بھی غیر ضروری ہوگا اس سے قلب میں کدورت ہوتی ہے اور ضروری چیز کا معیار یہ ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو ضرر مرتب ہو۔[2]

ہر سوال کا جواب ہر شخص کو کیوں نہیں دینا چاہئے؟

آج کل یہ مرض ہے کہ ہر سوال کا جواب ہر سوال کرنے والے کو دے دیا جاتا ہے حالانکہ ہر سوال کا جواب ہر سائل کے مناسب نہیں ہوتا مثلاً اگر کوئی شخص طبیب سے سنکھیا اور کچلہ کے مدبّر کرنے کی ترکیب پوچھے تو گو طبیب ناواقف نہیں لیکن ہر کسی کو ترکیب بتا دینا (کیا) مناسب ہے؟ اگر کسی طبیب کو کسی مریض پر اطمینان نہ ہو تو اس کو ہرگز وہ نسخہ نہ بتائے گا۔

اسی طرح علماء کو چاہئے کہ یہ سمجھیں کہ کون سوال کس کے منصب کے موافق ہے۔

بعض غیر ضروری سوال ہوتے ہیں بعض غیر مناسب اگر کوئی اصرار کرے تو کہہ دے کہ مجھے تحقیق نہیں اور اگر یہ کہتے ہوئے عار آئے تو کہہ دے کہ یہ سوال تمہارے منصب سے بالاتر ہے، بہت سے بہت وہ یہ سمجھے گا کہ انہیں کچھ آتا نہیں تو اس سے تمہارا کیا نقصان ہے۔

---

[1] بیان القرآن، مسائل السلوک ص۵۷ [2] الافاضات ۳۸/۲۔

بہت سے ایسے مسائل ہوتے ہیں جو عوام کے سمجھنے کے نہیں ہوتے مثلاً تقدیر کا مسئلہ یا تصوف کا کوئی باریک مسئلہ مثلاً وحدۃ الوجود۔

فرض کیجئے کہ کوئی عامی شخص ایسا مسئلہ پوچھتا ہے اس کو کیا جواب دیا جائے گا یہی کہ بھائی! یہ تیری سمجھ سے باہر ہے اور اگر اس کو جواب دیا گیا تو وہ گمراہ ہوگا۔[1]

علت وحکمت کا سوال کرنے والوں کو حضرت تھانویؒ کا جواب

ایک شخص پوچھنے لگے کہ گاؤں میں جمعہ نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟ اس زمانہ میں لوگوں کو مجتہدیت کا ہیضہ بھی ہوگیا ہے ہر بات کی وجہ سمجھنا چاہتے ہیں، میں نے ان صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ نے ہر مسئلہ کی وجہ معلوم کر لی ہے؟ تو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ مجھے اس کی وجہ بتلایئے کہ مغرب کی تین رکعتیں اور عشاء کی چار کیوں ہیں؟ اور اگر ہر مسئلہ کی وجہ معلوم نہیں ہے تو اسی مسئلہ کی کیا تخصیص ہے؟ اس کو بھی اسی فہرست میں داخل کرلو، ایسے ہی یہ سوال ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز ہے اور ایصالِ ثواب کے لئے ناجائز؟ بات یہ ہے کہ حکم شرعی اسی طرح پر ہے، قانون یہی ہے، بعض نیم مُلاّ قیاس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تعلیمِ قرآن پر اجرت لینا علماء نے جائز کر دیا ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ اس میں اور اس میں کیا فرق ہوا؟ جنابِ من ایک آدھ مسئلہ جاننے سے عالم نہیں ہوتا ہے، جب ایک شخص صاحبِ فتویٰ (معتبر مفتی) کہتا ہے کہ یہ صورت جائز ہے اور وہ ناجائز ہے تو تمہارے لئے بس اس کا قول حجت ہے۔

اگر جج کے یہاں مقدمہ ہو اور ایک شخص ہار جائے اور وہ ہارنے والا یہ کہے کہ اس دفعہ (قانون) کی رو سے بیشک میں ہار گیا لیکن اس دفعہ (قانون) کی وجہ کیا ہے؟ جج فوراً کان پکڑ کر نکال دے گا کہ قانونِ سرکار کی گستاخی کرتا ہے، اسی طرح عوام کو مسائل شرعیہ کی وجوہ دریافت کرنا شریعت کی بے ادبی ہے اور منشا اس کا قلب میں احکام کی عظمت نہ

---

[1] الافاضات ۱/۱۶۹۔

ہونا ہے، ہاں اگر کوئی طالب علم ہو اور فن سیکھتا ہو اس کو وجہ اور دلائل کا سوال کرنا برا نہیں، بلکہ اس کو ضروری ہے اس لئے کہ وہ دین کے اندر محقق بننا چاہتا ہے، اگر کوئی کہے کہ ہم بھی محقق بننا چاہتے ہیں تو ہم ان سے کہیں گے کہ جناب نوکری چھوڑیئے، زراعت، تجارت، دنیا کے سب کام چھوڑیئے اور ہمارے پاس کم از کم دس سال رہیئے دیکھئے آپ کو بھی ہم بتلائیں گے۔[1]

کتمان علم کا شبہ اور اس کا جواب

بعضے نامناسب سوالات کا جو میں جواب نہیں دیتا تو میرے پاس دھمکی کے خطوط آتے ہیں کہ حدیث میں ہے:

من سئل عن علم فکتمه الجَمَهُ الله بلجام النار یوم القیمة. یعنی اگر کسی سے کوئی علم کی بات پوچھی جائے اور وہ اس کو نہ بتلائے تو اس کو دوزخ کی لگام لگائی جائیگی۔ اس قدر بدتہذیبی پھیل گئی ہے کہ مسئلہ پوچھتے ہیں اور یہ حدیث لکھتے ہیں، ارے بھائی! جس سے یہ مسئلہ پوچھا جائے کیا اس سے یہی معاملہ کیا جاتا ہے؟

کسی عالم سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا انہوں نے جواب دیا اور وہ کوئی ایسا ہی مسئلہ تھا اس نے انہیں یہی حدیث سنائی انہوں نے اس کو خوب جواب دیا کہ:

''بہت اچھا جب قیامت میں میرے لگام لگے اور میں آپ کو مدد کے لیے بلاؤں تو اس وقت مت آیئے گا آپ بےفکر رہیں میں آپ کو تکلیف نہیں دوں گا''۔[2]

اگر بلاضرورت ہی تحقیق کا شوق ہے تو مدارس میں جا کر ترتیب سے تعلیم حاصل کیجئے۔[3]

علمی اور تحقیقی مسائل اگر نااہل پوچھے تو کیا کرنا چاہئے

ایسے موقعوں پر میں بھی یہی جواب دیا کرتا ہوں کہ ہر شئے کے قواعد ہیں،

---

[1] وعظ الغاء المجازفة ملحقہ دعوات عبدیت ص۴۲ ج۲۱۶ [2] الافاضات ۱/۹۶۱۔ [3] الافاضات قدیم ۴/۱۳۔

استفتاء اور افتاء یعنی سوال و جواب کے بھی قواعد ہیں، ان قواعد کے اندر رہ کر جواب دینا چاہیئے، عوام کا ایسا تابع نہ ہونا چاہیئے کہ وہ جیسا بھی سوال کریں اس کا جواب ضرور دے دیا جائے، چاہے وہ جواب اس کے مناسب ہو یا نہ ہو، اور اگر کوئی اصرار کرے تو کہہ دے کہ مجھے تحقیق نہیں اور اگر یہ کہتے ہوئے عار آئے تو کہہ دے کہ یہ سوال تمہارے منصب سے بالاتر ہے مگر آج کل تو بس اس کی کوشش ہے کہ کوئی بد اعتقاد نہ ہو جائے میں کہتا ہوں کہ اگر واقع میں بھی نہ آتا ہو تو اس میں عار کی کیا بات ہے۔[1]

علمی وتحقیقی جواب دینے کی دو شرطیں

فرمایا کہ سائل کی نسبت جب تک دو امر کا اطمینان نہ ہو جائے سکوت کرتا ہوں، وہ دو امر یہ ہیں ایک سائل کی استعداد علمی، تاکہ جواب رائیگاں جانے کا احتمال نہ رہے۔

دوسرا امر سائل کی نیت کہ بجز تحقیق کے اس کا کوئی مقصود نہیں، چونکہ آپ کے متعلق دونوں امر کے معلوم ہونے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں لہٰذا جواب سے معافی کا طالب ہوں۔[2]

علمی وتحقیقی سوال اگر اچھی نیت سے اہل علم کی جانب سے ہو تو اس کا جواب دینا چاہیئے

حضرت تھانویؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: اس قسم کے سوالات چند بار پہلے بھی مجھ سے کئے گئے ہیں لیکن چونکہ اب تک اکثر سائلین غیر اہل علم تھے جن کی غرض سوال بھی قابل اطمینان نہ تھی اور جوابات بھی واضح تھے اس لیے سوالات کی اہمیت نہیں سمجھی گئی (اور جوابات نہیں دیئے گئے) مگر اب اہل علم کی طرف سے سوال کیا گیا ہے جن کی غرض بھی متہم نہیں اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ جواب دیا جائے۔[3]

---

[1] الافاضات ۱۰/۶۱-۶۲۔ [2] الافاضات ۹/۲۷۵۔ [3] بوادر النوادر ۲/۸۱۵۔

جواب اسی کو دینا چاہئے جس کا عمل کرنے کا قصد ہو

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت! کشمیر کے متعلق اکثر لوگوں کو مالی و جانی امداد کرنے میں اشکال ہے اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ چونکہ سائل کا مقصد خود عمل کا نہ تھا ویسے مشغلہ کے طور پر پوچھا۔

اس لیے فرمایا کہ جس شخص کا ارادہ امداد کرنے کا ہو اس کو خود سوال کرنا چاہئے اس کو جواب دیا جائے گا اگر آپ کا ہی ارادہ ہے تو ظاہر کریں کہ کون سی امداد کرنا چاہئے ہیں تا کہ اس کا حکم ظاہر کروں سوال اس شخص کو کرنا چاہئے جس کا کچھ کرنے کا ارادہ ہو، عرض کیا بعض لوگ دریافت کرنے لگتے ہیں۔

فرمایا: جو میں کہہ رہا ہوں آپ سمجھتے ہیں یا نہیں؟ دوسروں کو جواب دینے کی آپ کو کیا فکر! کوئی پوچھے کہہ دیجئے ہم کو نہیں معلوم۔[1]

جس زمانے میں کوے کے مسئلے کا شور وغل ہوا بہت لوگ میرے پاس مجھ سے پوچھنے آئے میں ان سے پوچھتا کہ کیا کھاؤ گے؟ کہتے نہیں! میں کہتا کہ تو نہ بتاؤں گا، نہ تم پر پوچھنا (فرض) نہ مجھ پر بتانا فرض اور عقیدہ کا مسئلہ نہیں۔[2]

میں کہتا ہوں جب ارادہ کھانے کا نہیں تو پوچھتے کیوں ہو کیونکہ یہ فروعی مسئلہ میں سے ہے اصول میں سے نہیں کہ قیامت میں پوچھ ہو کہ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھا تھا، میری غرض یہ تھی کہ عوام الناس کو علماء پر جرأت نہ ہو اور فضول میں مشغول نہ ہوں۔[3]

معترض و معاند شخص کو جواب نہ دینا چاہئے

فرمایا: معاند کو جواب دینا مفید نہیں بلکہ خاموشی بہتر ہے مگر مولویوں کو صبر کب آتا ہے جوش اٹھتا ہے بقول مولانا یعقوب صاحب آج کل کے مولوی فوجیوں سے کم

---

[1] الافاضات ۱/۱۷-۱۸ [2] الافاضات ۲/۱۲۷ [3] دعوات عبدیت ۱۴/۸۱۔

نہیں وہ پلٹن سے لڑتے ہیں یہ کتاب اور رسالہ سے۔

جس کو محض اعتراض ہی مقصود ہو اس کو کہہ دینا چاہئے کہ جاؤ تم یونہی سمجھو البتہ جو سمجھنا چاہے اس کو سمجھا سکتے ہیں۔[1]

غیر ضروری تحقیقات میں نہ پڑنا چاہئے

یہ عادت کہ غیر ضروری چیزوں سے جن میں غیر ضروری سوال بھی آ گیا اجتناب رکھو، اسلام کی خوبی میں سے ہے، حدیث شریف میں ہے:

مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهُ مَالَا یَعْنِیْهِ۔[2]

بعض لوگوں کو تحقیقات کا بہت شوق ہوتا ہے وقت بیکار کھوتے ہیں کام میں لگنا چاہئے محض تحقیقات سے کیا ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ تحقیقات سے فن کی تدوین ہو جائے گی مگر نتیجہ کچھ نہ ہوگا۔[3]

ایک صاحب نے تعجب سے سوال کیا کہ حضرت! سنا ہے کہ مرغا فرشتوں کو دیکھ کر بولتا ہے کیا فرشتے اس کو مکشوف ہوتے ہیں؟ فرمایا کہ ہاں پھر فرمایا یہ تحقیق تو ہوگئی اور وہ مرغا جس وجہ سے بھی بولتا ہو مگر میں پہلے آپ کے اس بولنے کی وجہ پوچھتا ہوں کہ آپ کو بیٹھے بٹھلائے کیا نظر آیا جو آپ ایک غیر ضروری سوال کرنے چلے، کیا خاموش بیٹھا رہنا آپ کے نزدیک گناہ ہے؟[4]

کس قسم کے مسائل میں توقف کرنا چاہئے

فرمایا: امام صاحب سے جو اس مسئلہ (**اطفال مومنین**) میں **اللہ اعلم بما کانوا عاملین** منقول ہے جس کا حاصل توقف ہے، میرے ذہن میں امام صاحب کے توقف کے متعلق یہ بات آئی ہے کہ امام صاحب نے اس عنوان میں ہم کو ایسے امور کی

---

[1] الافاضات الیومیہ [2] الافاضات ص ۱۲۷/۳ [3] الافاضات الیومیہ ۹۵ ج ۲ [4] الافاضات الیومیہ ۱۴ ج ۲

تحقیق سے منع فرمایا ہے جس پر دین کا مقصود موقوف نہیں ہے تو جس کو اس کی تحقیق نہ ہوئی ہو وہ اس کے درپے نہ ہو اس لیے امام صاحب نے سائل کو مجمل جواب دیا اس کے سامنے تحقیق نہیں بیان فرمائی کیونکہ اس کا سوال فضول تھا، امام صاحب نے اسی اصل کو بہت سے فروع میں ملحوظ رکھا ہے سو امام صاحب نے اس احتیاط کی وجہ سے اس مسئلہ میں جواب واضح نہیں دیا بلکہ توقف کے عنوان سے سائل کو سوال لاطائل سے روکنا چاہا۔[1]

بہت سے مسائل جانے جاتے ہیں لیکن فتوی نہیں دیا جاتا

فرمایا کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ گوفی نفسہ صحیح ہوں مگر مفضی ہو جاتے ہیں مفاسد کی طرف جہاں عوام کو ان کی اطلاع ہوئی اور آفتیں کھڑی ہوئیں (اس لیے ایسے مسائل نہیں بیان کرنا چاہئے) میں نے بہت دفعہ بیان کیا ہے کہ علم دین بعض لوگوں کو مضر ہوتا ہے۔ (تو یہاں ضرر علم سے بچانا مقصود ہے اس لیے کتمان بھی نہ ہوگا)

فقہاء نے بہت سے مسائل میں تصریح کر دی ہے کہ یُعرف ولا یعرّف[2] (کہ جانا اور سمجھا جائے گا، لیکن فتنہ کے خوف سے اور خلاف مصلحت ہونے کی وجہ سے دوسروں کو بتایا نہ جائے گا، تشہیر نہ کی جائے گی)۔

جس مسئلہ کو بیان کرنے میں فتنہ کا اندیشہ ہو اس میں کیا کرنا چاہئے

فرمایا کہ جس مسئلہ پر زور دینے میں فتنہ کھڑا ہوتا ہو اس میں گفتگو بند کر دی جائے کیونکہ اس خاص دینی مسئلہ کی حمایت کرنے سے فتنہ کا دبانا زیادہ ضروری ہے ہاں مقتدائے اسلام کو شریعت کی ہر بات صاف صاف کہنا چاہئے جیسے امام احمد بن حنبلؒ نے خلق قرآن کے متعلق صاف صاف کہہ دیا تھا اور جو ایسا بڑا مقتداء نہ ہو اس کو بحث کی ضرورت نہیں جہاں مخاطب سمجھ دار منصف مزاج ہو وہاں صحیح مسئلہ بیان کر دے اور جہاں بحث مباحثہ کی صورت ہو خاموش رہے۔[3]

---

[1] بدائع ص:۲۵۶۔ [2] الافاضات الیومیہ [3] الافاضات الیومیہ ۲۹۰ ج ۷

جھگڑوں کے فتووں کا جواب کس طرح دینا چاہیے

فرمایا کہ میرا معمول ہے کہ میں جھگڑوں کے استفتوں پر متعارف طریق پر جواب نہیں لکھا کرتا صرف ضابطہ کا جواب دیتا ہوں [1]

فتنہ کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ

ایک شخص کا ایک خط آیا کہ ایک واعظ صاحب فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت ایک دفعہ تو واجب ہے اور دوسری دفعہ منع ہے کیا یہ مسئلہ ٹھیک ہے یا نہیں؟

ایک شخص نے لکھا تھا کہ ایک واعظ صاحب یہ فرماتے ہیں کہ جو عشاء کی سنتیں پڑھے وہ کافر ہے، ایک ایسا ہی مضمون شہادت کربلا کے متعلق تھا اس قسم کے مسائل میں جو غلط فہمی سے سائل کچھ کا کچھ سمجھ کر پوچھتا ہے اور اس بناء پر جواب حاصل کر کے بانیِ فساد بنتا ہے۔

(اس قسم کے سوالات کے متعلق) میرا معمول جواب دینے میں یہ ہے کہ لکھ دیتا ہوں کہ انہوں نے کچھ اور فرمایا ہوگا عالم آدمی کبھی اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتا آپ نے غلطی سے کچھ اور خیال کر لیا ہے اور اگر واقعی یہی بات ہے تو خود ان کے ہاتھ سے لکھا کر بھیجئے فرمایا کہ پھر کوئی کچھ نہیں لکھتا۔ یہ طرز رفع فتنہ وانسداد فساد کے لیے بہت مستحسن ہے۔[2]

اگر کوئی فتویٰ نہ مانے

ایک واقعہ اور پیش آیا کہ جس شخص نے حضرت سے کوئی فتوی لیا تھا اس نے اس پر مناظرانہ انداز سے اعتراضات لکھ کر بھیجے تھے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ:

[1] ملفوظات اشرفیہ ص: ۸۵ [2] دعوات عبدیت ۱۳۴ ج ۱

''ہم نے اپنی معلومات کے مطابق جواب لکھ دیا ہے اگر پسند نہیں ہے تو جس عالم پر اعتماد ہو اس سے رجوع کرو''۔ **وَفَوْقَ کلِّ ذِیْ علم علیم**[1]

اعتراض وجواب کے درپے نہ ہونا چاہئے

ایک دفعہ مولانا کے ایک تصحیح کردہ فتویٰ پر کہیں سے کچھ اعتراضات لکھے ہوئے آئے تھے میں نے اس کا جواب لکھنا چاہا، مولانا نے فرمایا کہ اس کا جواب مت لکھنا صرف یہ لکھ دو کہ اس کا جواب تو ہے مگر ہم مرغان جنگی نہیں ہیں کہ سوال وجواب کا سلسلہ دراز کریں، بس اس جواب کا حق ایک دفعہ ادا ہو گیا تھا، اور یہ لکھ دو اگر اطمینان نہ ہو تو ''**فَوْقَ کلِّ ذِیْ علمٍ علِیْم**''، دوسری جگہ دریافت کرلو، جنگ وجدل سے معاف کرو، مولانا کی بات اس وقت تو سمجھ میں نہ آئی تھی مگر اب اس کی قدر معلوم ہوتی ہے جنگ وجدل کرنا اس کا کام ہے جس کو فرصت ہو اور بیکار ہو۔

اس کی مثال ایک حکایت ہے کہ ایک شخص کی داڑھی میں سفید بال تھے جب حجام خط بنانے بیٹھا تو کہنے لگے کہ سفید بال چن دو۔

نائی نے ساری داڑھی صاف کر دی اور کہا کہ تم خود چن لو مجھ کو فرصت نہیں، کام کا آدمی بکھیڑوں سے اس طرح گھبراتا ہے ہاں شرعی ضرورت ہو تو اور بات ہے، جو سمجھنا چاہئے اس کو سمجھا سکتے ہیں اعتراض کا تو کوئی جواب نہیں۔[2]

اختلافِ فتویٰ کی صورت میں دوسرے علماء کے حوالہ کرنا

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے حضرت حسینؓ کو سید الشہداء کا لقب دینے سے متعلق ایک سوال کا جواب تحریر فرمایا تھا، اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

[1] مجالس حکیم الامت ص: ۱۰۰۔ [2] حسن العزیز ۱/۵۴۵۔

جواب بالا کے بعد سائل کی طرف سے پھر کچھ سوالات آئے قصر مسافت وقطع شغب کے لئے ان کو مشورہ دیا گیا کہ دونوں طرف کے دلائل زید وعمر کے نام سے دوسرے علماء کی خدمت میں پیش کر کے فیصلہ کرالیا جائے۔[1]

ترک مجادلہ ومباحثہ کی اہمیت وفضیلت

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ناحق پر ہو اور بحث ومباحثہ چھوڑ دے (اور حق کو قبول کرلے) اس کے لئے جنت کے کنارہ پر ایک گھر بنایا جاوے گا اور جو شخص حق پر ہو اور پھر بھی بحث ومباحثہ چھوڑ دے (یہ سمجھ کر کہ مخاطب مانتا نہیں، فضول وقت برباد ہوتا ہے اور احتمال ہے کہ شاید اپنے اندر کوئی نفسانیت پیدا ہوجاوے) اس کے لئے وسط جنت میں گھر بنایا جاوے گا (جو کہ کنارۂ جنت سے افضل ہے) اور جس کے اخلاق اچھے ہوں گے اس کے لئے اعلیٰ جنت میں گھر بنایا جاوے گا (جو کہ وسط جنت سے بھی افضل ہے) روایت کیا اس کو ترمذی نے (تیسیر، مطبوعہ کلکتہ ص ۱۰۵)۔

فائدہ: اکثر بزرگوں کو دیکھا گیا ہے کہ مکالمات ومخاطبات میں جب کوئی ان سے الجھتا ہے باوجود اپنے حق پر ہونے کے طرح دے کر سکوت فرماتے ہیں، جس میں وہی مصلحت ہوتی ہے جس کی طرف ترجمۂ حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے، اس حدیث سے اس کا پسندیدہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔[2]

فَاِنْ حَاجُّوْکَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ

(آل عمران آیت نمبر ۲۰)

---

[1] امداد الفتاویٰ ص ۵۹۸ ج ۴ سوال ۶۰۲ [2] التکشف عن مهمات التصوف ص ۲۹۹

ترجمہ: پھر بھی یہ لوگ اگر آپ سے حجتیں نکالیں تو آپ (ﷺ) فرمادیجئے کہ میں اپنا رخ خاص اللہ کی طرف کرچکا اور جو میرے پیرو تھے وہ بھی۔

فائدہ: اس میں دلالت ہے (اہل حق و) اہل طریق کی اس عادت پر کہ جب حق بالکل واضح ہوجائے مگر مخاطب کی حالت سے معلوم ہو کہ یہ قبول نہیں کرتا تو اس وقت مباحثہ ترک کردیتے ہیں اور یہ استنباط اس آیت کی مشہور تفسیر پر ہے کہ یہ قول ''أسلمت وجھی'' مجادلہ سے اعراض ہے۔[1]

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ الآية (سورہ یونس)

ترجمہ: اور اگر آپ کو جھٹلاتے رہیں تو یہ کہہ دیجئے کہ میرا کیا ہوا مجھ کو ملے گا اور تمہارا کیا ہوا تم کو ملے گا، تم میرے کئے ہوئے کے جواب دہ نہیں ہو اور میں تمہارے کئے ہوئے کا جواب دہ نہیں ہوں۔

فائدہ: یہی عادت ہے (اہل حق و) اہل طریق کی مناظرہ میں جس وقت وہ خصم کی جانب سے ضد اور ہٹ دیکھتے ہیں، بخلاف الفاظ پرستوں کے کہ وہ مناظرہ کے موقع پر کبھی ایسی بات نہ کہیں۔[2]

قابل تعریف فقیہ ومفتی

عن علیؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم:

" نعم الرجل الفقیه فی الدین ان احتیج الیه نفع ،وان استغنی عنه اغنی نفسه' " اخرجه' رزین۔

(ترجمہ) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دین کا عالم بھی خوب (یعنی قابل تعریف) ہوتا ہے، اگر کوئی اس کے پاس

[1] بیان القرآن، مسائل السلوک ص ۹۳ [2] بیان القرآن، مسائل السلوک ص ۲۴۹

(دینی) احتیاج پیش کرے تو نفع پہنچادے (یعنی دین کی تعلیم کرے) اور اگر کوئی اس کے پاس احتیاج نہ پیش کرے تو وہ بھی اپنے آپ کو بے پروا کر کے رکھے (روایت کیا اس کو رزین نے، تیسیر ص ۳۱۷)

فائدہ: جماعت صوفیہ (اور علمائے محققین میں) نصیحت کے باب میں اکثر کا مسلک یہ ہے کہ زیادہ کسی کے پیچھے نہیں پڑتے، ایک دو بار کہہ کر اپنا حق ادا کر دیا، اگر مان لیا تو بہتر، ورنہ اپنے شغل میں لگتے ہیں أغـنـىٰ نفسه' اپنے عموم سے اس عادت کا ماخذ ہے۔

اور دوسری جزئی اس کی یہ بھی ہے کہ اپنی دنیوی حاجت ان کے سامنے پیش نہیں کرتا۔[1]

میری رائے یہ ہے کہ عوام کے درپے نہ ہو ایک حدیث شریف میری نظر سے گذری مجھے بہت پسند آئی ارشاد ہے کہ **نـعـم الـفـقـيـه ان احتيج اليه نفع وان استغنى عنه اغنى نفسه'** (رزین نے اس حدیث کی تخریج کی ہے)۔

حضرت حاجی صاحبؒ نے مجھ کو نصیحت کی ہے کہ جب تم سے کوئی جھگڑے تو تم سب رطب ویابس اس کے سپرد کر کے علیحدہ ہو جانا، جیسا ایک شخص نے حجام سے کہا تھا کہ میری ڈاڑھی میں سے سفید بال چن دے اس نے ساری ڈاڑھی اتار کر سامنے رکھ دی کہ مجھ کو تو اتنی فرصت ہے نہیں تم خود بیٹھے ہوئے چنتے رہو۔

جب ردوقدح کی نوبت آ گئی تو پھر کام کرنے کا کیا لطف رہا، جو شخص دوستی سے بھی گھبراتا ہو اس کو اختلاف سے دلچسپی کیا ہوگی؟ مگر لوگ اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں گویا یہ بھی لوگوں کا ایک مشغلہ ہو گیا ہے اور ہم نے چونکہ بزرگوں کا طرز دیکھا ہے اس لئے ہم کو اس سے نفرت ہے کہ یہ کیا خرافات ہے۔[2]

---

[1] التکشف عن مہمات التصوف [2] القول الجلیل ص ۵۳

فصل (۵)

سدّ اللباب حکیمانہ طرز اختیار کر کے مستفتی کو پریشان کرنا

ایک شخص نے سوال کیا کہ حضرت میں نے چماروں کے کنوئیں سے پانی پی لیا فرمایا کہ توبہ کرلو اور آئندہ ایسا مت کرنا جب وہ شخص چلا گیا تو فرمایا کہ یہ میں نے اس لیے کہا کہ تاکہ دل میں رکاوٹ رہے آگے نہ بڑھے نفرت پیدا ہو۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص مع اپنے کنبہ کے لایا گیا وہ خانساماں تھا اس نے انگریز کی بچی ہوئی چائے پی لی تھی اس کے تمام متعلقین نے اس سے نفرت ظاہر کی کہ تو ''کرشٹان'' ہوگیا، یہ شخص بہت پریشان تھا۔

حضرت شاہ صاحب کے پاس سب مسئلہ پوچھنے آئے شاہ صاحب کے پاس اہل علم کا مجمع رہتا تھا شاہ صاحب نے فرمایا کہ بھائی اتنی بڑی بات اتنی جلدی طے نہیں ہوسکتی کل آنا کسی بڑی کتاب میں مسئلہ دیکھیں گے اور بیوی بچوں سے کہا اس سے الگ رہنا کئی روز دق کر کے فرمایا کہ آج ایک روایت نکلی ہے بہت بڑی بات ہوگئی تم سے، اتنے مساکین کو کھانا کھلاؤ، اتنی نفلیں پڑھو، غسل کرو، غرض بڑا بکھیڑا بتلادیا شاگردوں نے جرحاً باہم کہا کہ نہ معلوم شاہ صاحب نے یہ مسئلہ کہاں سے فرمایا، حضرت شاہ صاحب نے سن کر فرمایا کہ تم کیا جانو، یہ انتظامی بات ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ دلیر ہوجاتے اور کرشٹان بننا شروع ہوجاتے حضرت شاہ صاحب کا طرز نہایت حکیمانہ تھا عجیب باتیں تھیں [1]

---

[1] الافاضات ۳۷۱/۶۔

دلیری ختم کرنے کے لیے مصلحتاً گول مول جواب دینا

فرمایا: ایک شخص نے دریافت کیا تھا کہ اجنبیہ کا بوسہ لینے سے روزہ فاسد ہوتا ہے یا نہیں؟

میں نے یہ جواب دیا تھا کہ ''یہ کیوں نہیں دریافت کیا کہ گناہ بھی ہوتا ہے یا نہیں؟'' آج پھر خط آیا ہے کہ یہ تو مجھ کو معلوم تھا، میں نے آج جواب لکھا ہے کہ جب روزہ میں معاصی صادر ہوں تو وہ مقبول نہیں ہوتا تو پھر اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے اگر میں ضابطہ کا جواب دیتا ہوں کہ فاسد ہوجاتا ہے تو غلط ہوتا اس لیے میں نے ایسا جواب دیا ہے کہ جس سے نہ فتوی غلط ہو نہ دلیری بڑھے اہل علم کو ایسے پہلوؤں کا خیال رکھنا چاہیے بلاسوچے سمجھے فوراً جواب نہ دیدے۔[1]

ایک صاحب نے استفتاء کیا ہے کہ میرے لیے بجز ملازمت سرکاری کے اور کوئی صورت معاش کی نہیں اور سرکاری ملازمت بغیر ڈاکٹری معائنہ کے ہو نہیں سکتی اور ڈاکٹری معائنہ میں بالکل برہنہ ہونا پڑتا ہے اور میں منتخب ہوچکا ہوں، اس ملازمت کے لیے صرف ڈاکٹری معائنہ کی رکاوٹ باقی ہے تو کیا اس مجبوری میں ڈاکٹری معائنہ جائز ہے یا نہیں؟ حضرت نے جواب تحریر فرمایا کہ جائز سمجھنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ ناجائز سمجھا جائے اور کرالیا جائے اس کے بعد توبہ کرلی جائے۔

پھر فرمایا کہ ایسے جواب کی یہ بھی وجہ ہے کہ اب کیا معلوم کہ واقعی اس کے سوا اور تمام ذرائع آمدنی کے ان کے لیے مفقود ہیں یا نہیں کیونکہ گھاس تو کھود سکتے ہیں، کسی مسجد میں موذنی تو کرسکتے ہیں البتہ تنعم چاہتے ہوں تو دوسری بات ہے پھر ضرورت کے تحقق پر بھی اگر میں یہ لکھ دیتا ہوں کہ جائز ہے تو جرأت بڑھ جاتی نامعلوم کہاں تک نوبت پہنچتی، میرے اس جواب میں اہل عمل کے لیے بڑا اسبق ہے کہ وہ ایسے خیالات کی رعایت رکھا کریں۔[2]

---

[1] کلمۃ الحق ص:۱۳۴۔ [2] الافاضات ۱۰/۱۹۹۔

جواب نہ دے کر بھی سرزنش اور ملامت کرنا

ایک شخص کا خط آیا ہے انہوں نے قنوت نازلہ کے بارہ میں دریافت کیا ہے کہ آج کل یہ نماز میں پڑھنی چاہئے یا نہیں، اور اگر پڑھیں تو ہاتھ چھوڑ کر یا ہاتھ باندھ کر اور آسمان کیطرف ہاتھ اٹھائیں یا نہیں؟

میں نے ان کے جواب میں لکھا ہے بھلا ایسا جواب کیوں کسی کو پسند آئے گا مگر اس کی حقیقت تو میں جانتا ہوں یہ شخص ایک کم قوم کا ہے باہر جا کر اپنے کو سید ظاہر کیا نام بھی بدل دیا۔

میں نے جواب دیا ہے کہ آپ نے قنوت نازلہ میں تو استفتاء کیا جو چنداں ضروری نہیں اور رذائل نفس کے متعلق کچھ نہ پوچھا جو نہایت ضروری ہے۔

اب یہ بات کہ جواب کو سوال سے کیا مناسبت ہے تو اس کا ثبوت کلام اللہ میں موجود ہے، وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الاَهِلَّةِ ط قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ ط تو سوال تو کیا چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علت سے اور جواب ملا ہے اس کی حکمت و فائدہ کا، مطلب یہ ہے کہ علت سے سوال مت کرو، فائدہ دیکھو جو جوڑ یہاں ہے وہی میرے جواب میں، حاصل یہ کہ ضرورت سے سوال کرو۔[1]

ضرورت کے وقت مستفتی کو پریشان کرنا

فرمایا کہ ایک شخص نے بذریعہ خط دریافت کیا کہ "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئا للہ" کے وظیفہ کا کیا حکم ہے؟ آگے عبارت گستاخانہ تھی کہ اس کا حکم آپ کو کہاں تک معلوم ہے؟ جواب لکھا کہ حکم سے کیا مراد ہے، منصوص یا مستنبط وہ اس سوال کے چکر سے مدت تک بھی نہیں نکل سکتا یہ اس کی گستاخی کی سزا تھی۔[2]

---

[1] مزید المجید ص ۱۱۱۔ [2] کلمۃ الحق ص: ۴۷۔

حسب موقع جواب نہ دے کر بھی شدت اختیار کرنا

فرمایا کہ ایک شخص کا خط آیا ہے کہ تصویر کا رکھنا گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟ میں نے جواب لکھا ہے کہ کپڑوں کے بکس میں کبھی آگ رکھتے ہوئے بھی یہ تحقیق کی ہے کہ یہ چھوٹی چنگاری ہے یا بڑا انگارہ۔[1]

فرمایا کہ ایک خط آیا ہے لکھا ہے کہ بے ٹکٹ ریل کے سفر کرنے میں ابتلائے عام ہے اس میں کوئی گنجائش نکالنی چاہئے۔

جواب: کیا ایسے ابتلائے عام کی وجہ سے کوئی چیز جائز ہو جاتی ہے عوام کے نزدیک علماء صرف اس کام کے لیے رہ گئے ہیں کہ جس معصیت میں ان کو ابتلاء ہو جایا کرے اس کو وہ معصیت کی فہرست سے نکال دیا کریں۔[2]

سوال کا جواب نہ دے کر نکیر کرنا

فرمایا: یہیں پر اس زمانہ میں ایک علی گڑھ کا طالب علم عصر کے وقت آیا مگر نماز نہیں پڑھی اس نے مجھ سے ترک موالات ہی کے متعلق پوچھا تھا میں نے کہا کہ پہلے تو اپنی خبر لو، انگریزوں سے ترک موالات اس لیے کیا تھا کہ ترکوں سے لڑے، مگر نماز جو نہیں پڑھی تو خدا سے ترک موالات کیوں کیا؟ شاید اس لیے کہ اس نے انگریزوں کو غلبہ کیوں دیا۔[3]

مصلحتاً سوال کا جواب نہ دے کر ٹال دینا

فرمایا کہ ایک خط آیا ہے لکھا ہے کہ پیر کو سب باتوں کا علم ہونے کا جس کا عقیدہ ہو، وہ شخص کافر ہے یا کیا؟ بہت سے لوگ اس کی اقتداء سے باز رہتے ہیں؟

---

[1] الافاضات ۱۸/ ۳۷۔ [2] الافاضات ۱/ ۲۹۔ [3] الافاضات ۲/ ۴۵۔

جواب: ایسے مضمون کے جواب کے لیے کارڈ کافی نہیں، پھر اسی سلسلہ میں فرمایا کہ کسی امام کے متعلق سوال معلوم ہوتا ہے اماموں کے پیچھے لوگ ہاتھ دھو کر پڑے رہتے ہیں اگر لفافہ بھیجیں گے تب کان کھولوں گا۔[1]

بعض سوالوں کے جوابات لفافے ہی میں دیئے جاتے ہیں

کارڈ پر ایسے سوالات کے جوابات (جس کا تذکرہ ماقبل میں ہوا) میں نہیں دیتا ہوں اس لیے کہ اس میں میرا تو مضمون ہوگا ان کا نہیں ہوگا اس کی تعیین ان کی زبان پر ہوگی، اور لفافے میں میرا ان کا دونوں کا مضمون ہوگا، کسی کو دکھلائیں گے تو وہ سمجھ لے گا کہ ایسے سوال پر جواب ہے، لوگ بڑی بڑی ترکیبوں اور چالاکیوں سے کام لیتے ہیں، اور اصل تو یہ ہے کہ اوروں کی فکر میں کیوں پڑے آدمی اپنا ایمان سنبھالے۔[2]

اصلاح کی خاطر جواب نہ دینا

ایک شخص بلا کرایہ ریل پر سفر کر کے آیا تھا فرمایا کہ تم پہلے جا کر کرایہ داخل کرو کیونکہ بلا کرایہ چوری سے سواری کرنا حرام ہے اس کے بعد جب اور کچھ دریافت کرو گے تو بتلایا جائے گا۔[3]

مخاطب کی رعایت میں مضمون میں نرمی اختیار کرنا

فرمایا کہ نواب ڈھاکہ کو محفل میلاد کا بڑا شوق تھا خود مجالس منعقد کرتے تھے اور خود ہی پڑھا کرتے تھے انہوں نے جب مجھ سے مسئلہ پوچھا تو میں نے عنوان میں اس قدر رعایت کی کہ بدعت تک نہ لکھا، بلکہ یہ لکھا کہ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے وہ سمجھدار آدمی تھے فوراً چھوڑ دیا۔[4]

---

[1] کلمۃ الحق ص: ۱۰۴۔ [2] الافاضات ۱/۶۷۔ [3] کلمۃ الحق ص ۱۰۴۔ [4] مجالس حکیم الامت ص ۲۶۳۔

جواب میں مخاطب پر بھی نگاہ رکھنا ضروری ہے

اسی طرح مولانا گنگوہیؒ نے ایک سوال کا فیصلہ فرمایا کہ اختلاف محل سے جواب مختلف ہو گیا کسی نے پوچھا تھا کہ قبروں سے فیض ہوتا ہے یا نہیں؟

مولانا نے فرمایا کہ فیض کون حاصل کرتا ہے اس سائل نے کہا مثلاً میں فرمایا کہ نہیں ہوتا مطلب یہ کہ اہل کو ہوتا ہے نااہل کو نہیں ہوتا سبحان اللہ کیا خوب جواب عطا فرمایا۔[1]

فرمایا کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے ایک عورت نے مسئلہ پوچھا کہ ایک روز گھر میں تیل نہ تھا ایک رئیس کی سواری شب کو مکان کے سامنے سے گذری۔ سلسلہ دراز تھا میں نے اپنے دروازے میں بیٹھ کر چرخہ چلایا نہ معلوم وہ تیل حرام تھا یا حلال، اس سوت سے نفع حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ دریافت فرمایا تم کون ہو؟ عرض کیا میں بشر حافی کی بہن ہوں۔ فرمایا کہ اگر کوئی اور ہوتا تو اجازت دیدیتا بشر حافی کی بہن کو اجازت نہیں دے سکتا۔[2]

تشقیق کے ساتھ مختلف شقوں کا جواب دینا سخت غلطی ہے

علماء محققین نے اس کی سخت ممانعت کی ہے کہ تشقیق کے ساتھ جواب دیا جائے اس میں بعض اوقات سائل مفید شق کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔[3]

میں یہ بات اہل علم کے لیے بیان کرتا ہوں کہ مختلف شقوں کا حکم ایک دم سائل کو نہیں بتلانا چاہئے کہ اگر یوں ہے تو یوں حکم ہے اور یوں ہے تو یہ حکم ہے، تشقیقات کے ساتھ جواب نہیں دینا چاہئے بعض اوقات سائل کو اس میں خلط ہو جاتا ہے (بہتر طریقہ یہ ہے کہ) پہلے واقعہ کی تحقیق کر لینا چاہئے جب ایک شق کی تعیین ہو جائے اس کا حکم

---

[1] کلمۃ الحق ص ۸۸۔ [2] الافاضات ۲/۳۸۳۔ [3] الافاضات ۲/۳۸۴۔

بتلا دیا جائے [1]

غالباً علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ عوام کو تشقیق کے ساتھ جواب نہ دیا جائے واقعی کام کی بات فرمائی ہے اس میں اندیشہ ہے کہ وہ مفید شق کا دعویٰ کر بیٹھے گا جیسے طبیب سے کوئی پوچھے کہ اگر دموی مرض ہے تو کیا نسخہ ہے اور صفراوی مرض ہے تو کیا نسخہ ہے؟ یہ واہیات سلسلہ ہے، جو صورت حال ہو اسی کا سوال اور اسی کا جواب ہونا چاہئے [2]

علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ مفتی کو مسئلہ میں تشقیق نہ کرنا چاہئے، بلکہ سائل سے ایک شق کی تعیین کرا کر صرف اس کا جواب دینا چاہئے، تجربہ سے معلوم ہوا، بڑے کام کی وصیت ہے، مفتیوں کے کام کی بات ہے، کیونکہ تشقیق میں بعض اوقات (سائل) اپنے مفید شق کا دعویٰ کرنے لگتا ہے [3]

تشقیق کے ساتھ جواب دینے کی خرابی

فرمایا کہ شقوق فرض کر کے جواب دینا عامی کے لیے سخت مضر ہے کیونکہ اس کو اتنی تمیز نہیں ہوتی کہ وہ ہر شق کے جواب کو علیحدہ علیحدہ کر کے منطبق کر لے گا، اس لیے پیشتر اس سے واقعہ کی صورت کو متعین کرا لینا چاہئے پھر اس کا جواب بتلا دے [4]

اس کی خرابی کا ایک قصہ سناتا ہوں کہ ہمارے قریب ایک قصبہ میں غلطی سے رضاعی بہن بھائی کا نکاح ہو گیا اور یہ بے خبری میں ہوا کسی کو پتہ نہیں تھا اسی لیے تو فقہاء نے لکھا ہے کہ دودھ پلانے والی مشہور کر دے کہ میں نے فلاں فلاں جگہ دودھ پلایا ہے......غرض کہ بعد نکاح کے پتہ چلا، علماء سے استفتاء کیا سب نے حرام بتلایا مجھ سے کہا گیا کہ اجی اس میں تو بدنامی ہوگی، میں نے کہا اور اس میں بدنامی نہ ہوگی کہ بہن بھائی ایک جگہ جمع ہیں، اس نے کہا وہ دودھ تو رہا بھی نہ تھا ویسے ہی نکل گیا میں نے کہ کہا دودھ ہی نکل گیا تھا حرمت نہیں نکلی وہ تو اس کے پیٹ میں بیٹھ گئی۔

[1] الافاضات ۶/۳۷۰، قسط: ۳ [2] ایضاً ۱۹۴/۸، قسط: ۱ [3] ملفوظات ص ۴۲۱ ج ۲ قسط ۴ [4] کمالات اشرفیہ ص ۳۲۱

بس وہ غیر مقلد کے یہاں دہلی پہنچا کسی نے کہہ دیا کہ اگر پانچ گھونٹ سے کم پیے ہوں تو حلال ہے ورنہ حرام ہے بس سائل نے سن کر فوراً سوال قائم کرلیا کہ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید جس نے ایک عورت کا دودھ پانچ گھونٹ سے کم پیا ہے اور ہندہ جس نے پوری مدت اسی عورت کا دودھ پیا ہے تو یہ ہندہ اس زید کے نکاح میں حلال ہے یا نہیں؟ بینوا وتو جروا۔

بس کیا تھا انہوں نے لکھ دیا کہ یہ مسئلہ حلال ہے ان کے یہاں تو یہ مسئلہ ہے ہی، ایک حنفی عالم نے بھی فتویٰ دیکھ کر کہہ دیا کہ کیا حرج ہے یہ بھی تو ایک مذہب ہے مگر پوچھنا تو یہ ہے کہ آیا سوال کا واقعہ جواب سن کر تراشا گیا یا وہاں بیٹھ کر کسی نے گھونٹ شمار کئے تھے۔[1]

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا معمول

(اسی لیے) میرا معمول ہے کہ خود تشقیق نہیں کرتا اور جہاں تشقیق ہوتی ہے سائل سے ہی پوچھتا ہوں (کہ کون سی شق کا وقوع ہوا ہے) تاکہ دونوں شقوں کا حکم دیکھ کر سائل مفید شق کا دعوے نہ کرنے لگے، نیز بعض اوقات شقوں کا حکم باہم مختلط ہو جاتا ہے۔[2]

اپنے جہل کو چھپانے کے لئے خوامخواہ کی تشقیق نہ کیجئے

ایک معقولی طالب علم سے کسی نے مسئلہ پوچھا کہ گلہری کنویں میں گرگئی ہے اس کا کیا حکم ہے؟ طالب علم صاحب کو مسئلہ تو معلوم نہ تھا مگر جہل کا اقرار کیسے کریں، آپ نے معقولی تشقیقات شروع کیں کہ وہ جو گری ہے تو دو حال سے خالی نہیں یا تو کسی نے گرائی ہے یا خود گری ہے، آہستہ گری ہے یا زور سے، پھر یہ بھی دو حال سے خالی نہیں

[1] ملفوظات ۱۵۱۔ [2] حسن العزیز ۳/۴/۱۷۔

یا تو کسی آدمی نے گرائی ہے یا جانور نے، یا ڈر کے خودگری ہے تو ان شقوں میں سے کون سی صورت واقع ہوئی ہے؟

بس اس طرح ان کا جہل چھپ گیا، آج کل ایسی ہی ذہانت اور تیزی کمال سمجھی جاتی ہے۔

ایک حکایت مولانا گنگوہیؒ نے ایک جاہل مفتی کی بیان کی تھی، ان کو عاجز کرنے کی غرض سے کسی نے ان سے مسئلہ پوچھا کہ حاملہ عورت سے نکاح کرنا کیسا ہے؟ یہ بڑے بکھیڑے کا اور تفصیل طلب مسئلہ ہے، انہوں نے اخفاء جہل کے لئے کیسا مزہ کا جواب دیا کہ ایسا ہے جیسے گھیرا دیدیا، دریافت کیا کیسا گھیرا؟ کہا کہ یہی گھیرا جس کو گھیرا کہتے ہیں، چند بار کے سوال پر بھی یہی جواب دیتے رہے، ایسا گھیرا دیا کہ خود بھی اس سے نہ نکلے[1]

اہل علم کی طرف سے کئے گئے سوالات کی اہمیت افراد وشخصیات سے متعلق سوالات کے جوابات کس طرح دینا چاہئے

سوال: حضرت سیدنا ومولانا دامت برکاتہم۔ السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہٗ معروضات ذیل کا جواب ارقام فرما کر ممنون فرمایا جاوے۔

(۱) حضرت مولانا حسین احمد صاحب ومولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب (مدظلہما) کو حضرت والا کیسا سمجھتے ہیں؟ اور کیا اپنے مخصوص ومعلوم سیاسی معتقدات کے باوجود یہ حضرات لائق احترام ہیں؟

[1] ملفوظات حکیم الامت ص ۳۲۶ ج ۲ قسط ۳

(۲) جو افراد یا اخبارات ان حضرات کی شان میں بے باکانہ کلمات استعمال کرتے ہیں مثلاً شیخ الاصنام، شیخ الہنود، اجودھیاباشی اور لالہ اور مہاشہ وغیرہ وغیرہ ان کو حضرت کیسا سمجھتے ہیں؟ اور وہ شرعی مجرم ہیں یا نہیں؟

(۳) حضرت والا ان حضرات کو سیاسیات میں اختلاف رائے کے باوجود نیک نیت اور دیانت دار سمجھتے ہیں یا بدنیت اور خائن؟ اور ان حضرات کی سیاسی جدوجہد کیا حضرت کے نزدیک اخلاص اور ملت کی خیر طلبی پر مبنی ہے یا کسی خودغرضی اور خود مطلبی پر؟

والسلام محمد منظور نعمانی بریلی۔

الجواب: (الملقب بشق الغین عن حق علی وحسین) بعد الحمد والصلوٰۃ۔

اس قسم کے سوالات چند بار پہلے بھی مجھ سے کئے گئے ہیں، لیکن چونکہ اب تک اکثر سائلین غیر اہل علم تھے جن کی غرض سوال بھی قابل اطمینان نہ تھی اور جوابات بھی واضح تھے اس لئے سوال میں اہمیت نہیں سمجھی گئی، نیز بعضے سوالات دوسری جانب سے بھی ایسے آئے جن میں واقعات اس کے خلاف ظاہر کئے گئے اور ان کی تحقیق کا کوئی ذریعہ نہ تھا سو ان کا جواب ان سوالوں کے جواب کا مضاد ہوتا، ان اشکالات کی وجہ سے دونوں قسم کے سوالوں میں اجمالی جواب پر اکتفا ہوتا رہا، مگر اب اہل علم کی طرف سے سوال کیا گیا ہے جن کی غرض بھی متہم نہیں اس لئے ایک امر تو جو مفصل جواب سے مانع تھا مرتفع ہوگیا، اور دوسرے مانع کے رفع کی یہ صورت ذہن میں مناسب معلوم ہوئی کہ جواب عمومات کے ساتھ دیا جاوے جو بلا تخصیص ہر قسم کے سوالات پر اور ہر مسئول عنہ پر منطبق ہو سکے حتی کہ خود مسئول یعنی مجیب پر بھی جیسا کہ تحریر ہذا کے لقب میں اصل مسئول عنہ کے نام کے ساتھ خود مسئول کے نام کی طرف بھی اشارہ ہے، اب اس تمہید کے بعد وہ جواب عام عرض کرتا ہوں۔۔۔ (اس کے بعد عربی عبارات اور دلائل ہیں)

ان دلائل عشرہ سے یہ مسائل ثابت ہوئے۔

اول: بدون حجت شرعیہ کے کسی کی طرف خصوص مومن کی طرف کسی قول یا فعل قبیح کا منسوب کرنا بہتان اور صریح گناہ ہے اور خصوص در خصوص کسی امر مبطن مثل نیت وغیرہا پر حکم کرنا حدیث **هلاشققت قلبه** میں اسی پر تنبیہ ہے۔

دوم: بعد ثبوت شرعی بھی بدون ضرورت شرعیہ اس کا تذکرہ کرنا جب کہ منسوب الیہ کو ناگوار ہو غیبت، حرام اور معصیت ہے۔

سوم: البتہ ضرورت شرعیہ سے اس کی اجازت ہے اور منجملہ ان ضرورتوں کے کسی مسلمان یا مسلمانوں کو ضرر سے بچانا بھی ہے خواہ وہ ضرر دنیوی ہو یا دینی۔

چہارم: لیکن اس ضرورت مذکورہ سے بھی تذکرہ میں یہ واجب ہے کہ لعن وطعن وتمسخر واستہزاء اور دشنام اور فحش الفاظ سے خصوص ایسے کلمات سے جو عرفاً کفار وفجار کے حق میں استعمال کئے جاتے ہیں احتراز کیا جائے، اگر دلیل شرعی سے کسی قول وفعل پر رد اور نکیر کرنا ہو تو حدود شرعیہ کے اندر علمی عبارات کا استعمال کرے مثلاً فلاں امر بدعت ہے، معصیت ہے، باطل ہے، وامثالہا جیسے میں کانگریس کی شرکت بہیئت کذائیہ کو معصیت اور اس کے اجتہادی ہونے کو باطل کہا کرتا ہوں۔

پنجم: البتہ انتقام میں یہ بھی جائز ہے دو شرط سے ایک یہ کہ بالمثل ہو، دوسرے یہ کہ وہ امر مماثل کسی مستقل دلیل علی الاطلاق سے ناجائز نہ ہو مثلاً زید نے عمرو کے والد یا استاذ یا شیخ کو برا کہا تو عمرو کو انتقام کے وقت یہ جائز نہیں کہ وہ زید کے بزرگوں کو برا کہے۔

ششم: لیکن اگر غضب للدین کے غلبہ میں احیاناً بلا اعتیاد کوئی ایسا لفظ نکل جاوے تو معذور سمجھا جائے گا، جیسے حضرت ابن عباس نے نوف بکالی کو **عدو الله** کہہ دیا۔

ہفتم: معصیت ہر حال میں معصیت ہے حسن نیت دافع معصیت نہیں ہوتی

یعنی تحسین نیت سے وہ مباح یا طاعت نہیں ہو جاتی، آیات و روایات مرقومہ بالا کا اطلاق اس کی کافی دلیل ہے۔ مگر اس کی تنویر کے لئے حضرت مولانا گنگوہیؒ کی ایک ارشاد فرمودہ مثال یاد آ گئی کہ اگر کوئی شخص ناچ ورنگ کی محفل اس نیت سے منعقد کرے کہ نمازی اذان سن کر تو آتے نہیں ناچ دیکھنے کے واسطے جمع ہو جائیں گے، پھر سب کو مجبور کر کے نماز پڑھوا دوں گا، تو کیا کوئی شخص اس نیت سے ناچ کرانے کو جائز کہہ سکتا ہے؟ بلکہ معصیت میں طاعت کی نیت قواعد شرعیہ کی رو سے زیادہ خطرناک ہے جیسے حرام چیز پر بسم اللہ کہنے کو فقہاء نے قریب بکفر کہا ہے۔

تفریع: امید ہے کہ ان کلیات سے سب جزئی سوالات کا جواب ہو گیا، الحمدللہ ان جوابوں میں اس آیت پر عمل نصیب ہو گیا **وَقُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ الآیة**۔[1]

کسی کے کہنے یا کسی پالیسی کے تحت جواب نہ دینا چاہئے

فرمایا کہ میں اہل علم کو متنبہ کرتا ہوں کہ فتوے میں یہ طریق اختیار کریں کہ کسی کے کہنے سے دوسرے پر فتوے نہ لگائیں اسی طرح سے کسی پر کفر کا فتوی نہ لگائیں۔

ایک شخص نے کہا کہ فلاں کا یہ فاسد عقیدہ ہے اور وہ یوں کہتا ہے، فرمایا: جس شخص کا یہ عقیدہ ہو اس سے لکھوا کر لاؤ۔[2]

فرمایا کہ میں کوئی جواب کسی خاص پالیسی اور مصلحت سے نہیں لکھتا، اس وقت جس قدر مضامین آتے ہیں سادگی سے وہی لکھ دیتا ہوں تکلف کر کے نہیں لکھتا اسی طرح بے تکلفی کی یہ بات ہے کہ بعض خط ایسا ہوتا ہے کہ چار چار پانچ پانچ روز رکھا رہتا ہے جب تک شرح صدر نہیں ہوتا تب تک نہیں لکھتا۔[3]

---

[1] بوادر النوادر ص ۸۱۵ [2] کلمۃ الحق ص ۳۳۔ [3] حسن العزیز ۲/۴۰۵۔

جواب میں تلبیس وایہام سے بچنا چاہیے

فرمایا کہ ایک بڑے علامہ نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ ہمارے یہاں ایک فتویٰ آیا ہے کہ ولایتی کپڑا پہننا جائز ہے یا نہیں؟

اب اگر یہ لکھا جاتا ہے کہ جائز ہے تب تو اپنے مقاصد میں خلل آتا ہے اور ناجائز کیسے کہیں کیونکہ جائز تو واقع میں ہے ہی، اس لیے اس کے خلاف بھی نہیں کرسکتا تو اب کیا کریں؟

فرماتے تھے کہ یہ جواب دیا کہ ولایتی کپڑا پہننا قابل مؤاخذہ ہے اور کہنے لگے کہ اس لکھنے میں حکمت یہ تھی کہ وہ تو یہ سمجھیں گے کہ خدا کے یہاں مؤاخدہ ہوگا اور ہم یہ سمجھیں گے کہ اپنے دوستوں کا مؤاخذہ ہوگا۔

میں نے کہا کہ مولانا توبہ کیجئے یہ تو شریعت مقدسہ میں تحریف ہے اور مسلمانوں کو دھوکہ دینا ہے، فرمایا کہ ایسی ایسی باتیں سن کر دل کانپ جاتا ہے کہ اے اللہ! دین کا ان لوگوں کے دلوں سے احترام جاتا رہا[1]

جس مسئلہ کا جواب جاچکا ہو دوبارہ اس کا جواب نہیں دینا چاہیے

فرمایا کہ یہاں یہ بھی قاعدہ ہے کہ جس مسئلہ کا ایک مرتبہ یہاں سے جواب جاچکا ہو اور وہ دوبارہ پوچھا جائے اور یہ بات یاد آجائے تو دوبارہ اس کا جواب نہیں لکھتے، لکھ دیتے ہیں کہ اس استفتاء کا جواب یہاں سے ایک مرتبہ جاچکا ہے اگر دوبارہ لکھوانا ہے تو اس کو واپس بھیج دیا جائے ہم اس کو اپنے ہاتھ سے پہلے پھاڑ کر پھر دوبارہ جواب بھیجیں گے ورنہ کسی اور سے منگوالیا جائے پھر فرمایا کہ صاحب! مولویوں کو گالی پڑتی ہے کہ ایک کو کچھ لکھ دیا ایک کو کچھ، اس لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا[2]

---

[1] الافاضات ۱/۴۷۔ [2] حسن العزیز ۱/۵۴۔

فصل (۶)

کس حالت میں اور کس قسم کے خطوط کا جواب نہیں دینا چاہئے

(۱) فرمایا: جب طبیعت نہ چلے اور تدبر نہ ہو تو غلطی کا احتمال ہوتے ہوئے جواب نہ دینا چاہئے، میرے پاس استفتاء کثرت سے آتے ہیں باستثناء بعض اکثر کے جواب میں یہ لکھ دیتا ہوں کہ دیوبند سے دریافت کرلو[۱]

بعض صحابہ سے جو فقہی مسائل پوچھے جاتے تھے وہ دوسروں پر حوالہ کردیتے تھے ان کے نام بھی لکھے ہیں وجہ یہ ہے کہ توجہ ایک ہی طرف ہوسکتی ہے دو طرف نہیں ہوسکتی[۲]

(۲) میرا تو قاعدہ ہے کہ اگر کسی خط کی عبارت ایسی ہوتی ہے کہ کئی معنی کو محتمل ہو تو میں لکھ دیتا ہوں کہ عبارت واضح لکھو اور جو فضول بات ہوتی ہے اس کا جواب ہی نہیں دیتا[۳]

(۳) مجھ کو جب تک شرح صدر نہ ہوجائے جواب نہیں دیتا، تردد کی صورت میں جواب دینا جائز نہیں، بعض خط چار چار پانچ پانچ روز تک رکھا رہتا ہے جب تک شرح صدر نہیں ہوتا تب تک جواب نہیں لکھتا[۴]

(۴) فرمایا: میں راستہ میں مسئلہ نہیں بتلایا کرتا وہاں اطمینان تو ہوتا نہیں[۵]

غیر جوابی خطوط کا جواب بیرنگ بنا کر نہ بھیجنا چاہئے

حضرتؒ بلا جوابی ٹکٹ یا لفافہ کے جواب نہیں دیتے تھے، ایک صاحب نے عرض کیا کہ وہ جواب کا منتظر ہوگا بیرنگ بھیج دیا کیجئے، فرمایا کہ میں پہلے ایسا ہی کیا کرتا تھا

[۱] حسن العزیز ۳/۱۹۱-۱۹۲ [۲] ایضاً ۳/۶۵ [۳] ایضاً ۳/۶۵ [۴] ایضاً ۳/۵۹ [۵] ملفوظات اشرفیہ ص ۳۷۲۔

لیکن بعضوں نے واپس کر دیا تھا پھر محصول ڈاک مجھ کو اپنے پاس سے دینا پڑا جب یہ احتمال ہے تو میں کیوں نقصان برداشت کروں، ان صاحب نے عرض کیا کہ اپنا نام نہ لکھا کیجئے، فرمایا کہ اس صورت میں اگر اس نے واپس کیا تو سرکار کا نقصان ہوگا سرکار کا نقصان کرنا کہاں جائز ہے۔[1]

ڈاک کے قوانین کے خلاف کوئی کام نہ کیجئے

حکیم الامت حضرت تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں:

میں خطوط کے بارے میں بہت احتیاط کرتا ہوں، کوئی بات خلافِ قواعد ڈاک نہیں کرتا ہوں۔۔۔۔ مثلاً ٹکٹ ذرا سا مشکوک ہوجاتا ہے تو میں نہیں لگاتا ہوں، یا بہت سے لفافے، کارڈ ایسے آجاتے ہیں کہ ان پر ڈاک خانہ کی مہر نہیں لگی ہوتی ہے، میرا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ان کو چاک کر دیتا ہوں، گو میں ان کو اگر دوبارہ استعمال کروں تو کسی ثبوت سے کوئی گرفت نہیں ہوسکتی لیکن دیانۃً اس کی اجازت نہیں، علماء کو چاہئے کہ خود دین ودنیا دونوں کی آفات سے بچیں، بعض وقت گنجائش پر عمل کرنے سے دین کی یا دنیا کی بڑی آفت کھڑی ہوجاتی ہے۔[2]

اگر فتوے میں کاغذ جوڑنا پڑے تو کیا کرنا چاہئے

فرمایا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے یہاں یہ انتظام تھا کہ اگر فتاوی میں جواب کے تطویل ہوجانے کی وجہ سے کہیں کاغذ میں جوڑ لگانے کی ضرورت ہوتی تو اس جوڑ پر بھی اپنے مہر کر دیتے تھے تاکہ تزویر کا شبہ نہ ہو۔

جامع عرض کرتا ہے کہ ایک بار حضرت والا نے ایسے ہی جوڑ پر دونوں طرف دستخطوں کے لیے حکم دیا تھا۔[3]

---

[1] حسن العزیز ۱/۶۱۶ [2] الافاضات الیومیہ ۱۰/۱۵۵ [3] ملفوظات کمالات اشرفیہ ص ۳۴۴ ملفوظ نمبر ۱۲۲

اگرایک ہی خط میں بہت سے سوالات ہوں تو کیا کرنا چاہئے

ایک صاحب نے بہت سے سوالات ایک خط میں لکھ کر بھیجے یہاں سے یہ جواب گیا کہ ایک خط میں دوتین سوالوں سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اتنی فرصت نہیں، دوتین سوال ایک خط میں ہوں تو طبیعت پر بارنہیں ہوتا ورنہ اگر پچاس پچاس سوالات دوخط میں بھی ہوئے تو انہیں کا ختم کرنا مشکل ہے بقیہ ڈاک یوں ہی بلا جواب پڑی رہے اور نہ معلوم کب تک جوابوں کی نوبت نہ آیا کرے۔

بعضوں نے یہ بھی رائے دی کہ جس خط میں بہت سے سوالات ہوں اس کو رکھ لیا جایا کرے اور دودوتین تین سوالات کے جوابات روز لکھ کر جب سوالات ختم ہوجایا کریں تب بھیج دیا جایا کرے، اس میں ظاہر ہے کہ کس قدر طوالت اور پریشانی ہے دوسرے کو بھی انتظار جواب کی سخت تکلیف ہوگی، کیونکہ نہ معلوم سب کے جوابات کب ختم ہوں اور خطوط محفوظ رکھنا، روز روز جواب لکھنا اور روزمرہ کا کام ختم کرکے پھر اس کو یاد کرکے لے کر بیٹھنا اور اتنے دنوں تک طبیعت پر بوجھ علیحدہ، اس میں مجھے کس قدر پریشانی اور انتظام کی دقت ہے[1]

وعظ وتقریر میں مسائل نہیں بیان کرنا چاہئے

پہلے مجھ کو شبہ تھا کہ علماء وعظ میں احکام کیوں نہیں بیان کرتے صرف ترغیب وترہیب پر اکتفاء کرتے ہیں اپنے بزرگوں پر بھی یہی شبہ تھا لیکن پھر خود تجربہ سے معلوم ہوا کہ وعظ میں مسائل بیان کرنا ٹھیک نہیں بالخصوص اس زمانے میں جب کہ بدفہمی کا بازار گرم ہے مگر ترغیب دینا مناسب ہے ترغیب ہی دینا چاہئے، یہ تجربہ مجھ کو لکھنؤ کے ایک وعظ سے ہوا، میں نے چند مسئلے ربٰو کے متعلق ایک دم سے بیان کردیئے، سامعین میں بعض مسائل میں اختلاف ہوگیا میرے پاس مکرر تحقیق کے لیے آئے۔

---

[1] حسن العزیز ۱/۲۷۵۔

معلوم ہوا کہ قلت فہم یا سوء حفظ سے کسی مقدمہ کا مقدم دوسرے کی تالی سے جوڑ دیا، وبالعکس اس لیے گڑبڑ ہوگئی اور جب خود واقعہ پیش آئے گا تو اس کے پوچھنے پر صرف واقعہ نظر میں ہوگا اس میں خلط نہیں ہوسکتا۔[1]

مسئلہ بتلانے اور فتویٰ لکھنے کی اجرت

سچا مسئلہ بتلا کر بھی رشوت لینا جائز نہیں چہ جائے کہ دین میں تحریف کرکے، ہاں کتابت کی اجرت لینا جیسے فرائض لکھنے میں یہ جائز ہے مگر اس کے اثر پر بھی اگر غور کیجئے تو یہ بھی برائی سے خالی نہیں، وہ اثر یہ ہے کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ لوگ فرمائش کرتے ہیں کہ مولانا فلاں وارث کا نام نہ لکھئے گا، ایسی فرمائش اس لیے کرتے ہیں کہ کچھ دیتے ہیں ورنہ کیوں ہمت ہو۔[2]

ایک اہم ہدایت

فرمایا کہ جب میں تصنیف کا کام کرتا تھا تو عادت یہ تھی ہر وقت کاغذ پنسل میرے ساتھ رہتے تھے چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے کوئی مضمون یاد آ گیا تو فوراً لکھ لیتا تھا آدھی رات کو کوئی چیز یاد آتی تھی تو لکھ کر سوتا تھا کیونکہ بعض اوقات مضمون ذہن سے غائب ہوجاتا ہے پھر سوچنے سے بھی نہیں آتا۔[3]

دوسروں کے فتووں پر دستخط کرنے کی بابت ضروری ہدایت

فرمایا: جب تک خود تحقیق نہ کرلوں جی نہیں چاہتا کہ کسی کے کہنے سے فتویٰ پر دستخط کردوں، جواب شرح صدر ہوجانے کے بعد دینا چاہئے۔

اگر جزئیہ نہ ملے تو یہ بھی ضرور لکھ دیجئے کہ جواب قواعد کلیہ کی بنیاد پر دیا گیا ہے جزئیہ نہیں ملا اور علماء سے بھی دریافت کرلوتا کہ اپنے اوپر بوجھ نہ رہے۔[4]

---

[1] الافاضات ۶/۳۷، قسط:۲۔ [2] التبلیغ وعظ احکام المال ص ۶۱۔ [3] مجالس حکیم الامت ص ۲۲۸۔ [4] کلمۃ الحق ص ۵۹۔

مفتیوں کے لیے چند ضروری ہدایات

(ماخوذ از اصلاح انقلاب)

استفتاء خواہ زبانی سوال ہو یا تحریری ہو اس میں ان امور کا لحاظ رکھے۔

۱- حتی الامکان جواب میں توقف نہ کرے۔

۲- لایعنی سوال کا جواب نہ دے بلکہ سائل کو متنبہ کر دے۔

۳- اگر سوال دو صورتوں کو محتمل ہو تو تشقیق سے جواب نہ دے کیونکہ بعض اوقات سائل دونوں شقوں کا حکم سن کر ایک شق کو اپنے لیے مفید سمجھ کر سوال میں اسی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے سائل کا یا اس کے مقابل کا دینی یا دنیوی ضرر ہو جاتا ہے۔

۴- عامی شخص کو (مسئلہ کی) دلیل بتلانے کا التزام نہ کرے کیونکہ اکثر اس کے فہم سے خارج ہوگی۔

۵- ہاں دوسرے علماء کی سہولت کے لیے اگر دلیل کی طرف اشارہ کر دے یا کوئی عبارت بلا ترجمہ نقل کر دے تو مستحسن ہے۔

۶- اگر قرائن سے معلوم ہو جائے کہ سوال برائے تعنّت کے ہے تو جواب نہ دے، الغرض اہل سے دریغ نہ کرے اور نا اہل کو منہ نہ لگائے۔

۷- اگر قرائن سے معلوم ہو جائے کہ غائب سائل اس تحریری جواب کو اچھی طرح نہ سمجھے گا یا سمجھنے میں غلطی کرے گا تو جواب لکھ کر یہ بھی لکھ دے کہ کسی عالم سے اس جواب کو زبانی حل کرے۔[۱]

افتاء سے متعلق چند کوتاہیوں کی اصلاح

۱- استفتاء لے کر رکھ لینا اور مہینوں تک جواب نہ دینا۔

۲- حصول زر کا اس کو آلہ بنانا، البتہ اگر اس کی تکمیل وانتظام میں خرچ ہوتا ہو تو

---

[۱] اصلاح انقلاب ص ۲۳

اس کے بقدر وہ بھی اہل استطاعت پر کچھ فیس لگا دینے میں مضائقہ نہیں۔

۳- ہر سوال کے جواب کی کوشش کرنا، نہ بھی معلوم ہو تو یہ نہ کہنا کہ ''نہیں جانتا'' بلکہ کچھ کھینچ تان کر لکھ دینا۔

۴- اسی طرح معلوم ہونے پر بھی ہر سائل کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں اس کا اثر عوام پر برا پڑتا ہے علماء کو اپنا تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا جو سوال فی نفسہ یا کسی سائل کے اعتبار سے غیر ضروری ہو تو صاف کہہ دیا جائے کہ یہ سوال غیر ضروری ہے۔

۵- یا جو سائل دلیل سمجھنے کی لیاقت نہ رکھتا ہو اور دلیل معلوم کرنا چاہے، اس کو بھی صاف جواب دیدینا چاہئے سمجھانے کی کوشش نہ کرنے لگے۔

۶- جب دلیل اِنّــــی کے متعلق یہ مشورہ ہے تو دلیل لِمّی یعنی علت دریافت کرنے کی عوام کو گنجائش ہی نہ دے کہ اس کا علم تو پورا پورا خود علماء کو نہیں، الا ماشاءاللہ۔

مثلاً نماز کے پانچ وقت فرض ہونے کی دلیل اِنّی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور دلیل لِمّی، اس کی وہ حکمتیں ہیں جن کی بناء پر نماز فرض کی گئی۔

۷- بعض لوگ فرمائش کرتے ہیں کہ قرآن مجید سے پانچ وقت کی نماز کا ثبوت لاؤ، اب مجیب صاحب ہیں کہ قرآن مجید میں اس کی تلاش کرتے ہیں اور دوسروں سے مدد لیتے پھرتے ہیں، حالانکہ حکم شرعی کے لیے مطلقاً دلیل شرعی کافی ہے، خاص دلیل کی حاجت نہیں اور دلائل شرعیہ چار ہیں کتاب، سنت، اجماع وقیاس مجتہد، ان میں سے کسی ایک دلیل سے بھی جو حکم ثابت ہو جائے وہ ثابت ہے البتہ حسب تفاوت ادلہ ثبوت احکام کا درجہ متفاوت ہوگا۔

۸- بعضے استفتاء کرنے والے حیلے پوچھا کرتے ہیں جو ہرگز نہ بتلانا چاہئے۔

۹- بعض اوقات سوال مہمل ہوتا ہے اور وہ دو صورتوں کا محتمل ہوتا ہے، وہاں اکثر اہل علم تشقیق سے جواب دے دیتے ہیں کہ یہ صورت ہو تو یہ حکم اور وہ صورت ہو تو وہ حکم اس سے تجربہ کاروں نے منع فرمایا ہے کیونکہ ناخدا ترس لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق سوال تراش لینے کی گنجائش ملتی ہے کہ وہ مفید مطلب ہی شق کے مدعی بن

جاتے ہیں اور اصل واقعہ ملتبس ہو جاتا ہے۔[1]

فتاویٰ نویسی سے متعلق حضرت تھانویؒ کے اصول وضوابط

۱- ایک خط میں اتنے سوالات نہ بھر دے کہ جواب دینے والے پر بار ہو جائے چار پانچ سوال بھی بہت ہیں، بقیہ جواب آنے کے بعد پھر بھیج دے۔[2]

۲- اگر جوابی کارڈ پر سوالات لکھیں تو اس کی ایک نقل اپنے پاس رکھیں تا کہ جواب کی تطبیق کر سکیں (یعنی ملا کر دیکھ سکیں)۔

۳- جس مسئلہ میں شرح صدر نہ ہو یا فرصت کی کمی کی وجہ سے یا کتابیں موجود نہ ہونے کی وجہ سے روایات نہ مل سکیں، تو وہ بے جواب واپس کر دیا جاتا ہے۔

۴- دلیل لکھنے کی درخواست نہ کریں، اس واسطہ کہ مقلد کو دلیل پوچھنے کا منصب نہیں، اور جو مسئلہ دلیل لکھنے کے قابل ہوتا ہے اس میں از خود دلیل لکھی جاتی ہے۔

۵- فرائض (میراث) کے سوالات مجمل نہ لکھیں، اموات کی ترتیب ہر میت کو مع اس کے ورثہ کے لکھیں۔

۶- فرائض (میراث) کا مسئلہ اگر طویل ہوا تو چونکہ حساب کی ضرورت ہوتی ہے اس واسطے ایک محاسب سے اجرت پر کام لیا جاتا ہے۔[3]

مُہر لگانے کے سلسلہ میں حضرت تھانویؒ کا معمول

ایک مستفتی جواب لے کر چلا گیا اور واپس آ کر حضرت تھانوی سے کہا کہ: مولوی صاحب میں تو بہت دور نکل گیا تھا وہاں جا کر نظر پڑی کہ آپ نے اس فتوے پر مہر تو لگائی ہی نہیں، میں نے اس سے کہا کہ مہر تو بھائی میں لگایا نہیں کرتا۔[4]

---

[1] حقوق العلم ۹۵ وتجدید تعلیم وتبلیغ ۱۱۵ [2] آداب المعاشرت ص:۱۹۱ [3] معمولات اشرفی ص:۸۱
[4] حسن العزیز ۱/۱۲۴۔

اہل علم وارباب فتاویٰ کی ذمہ داری

فرمایا: میں نے یہ چاہا تھا کہ جونئی صورتیں معاملات بیع وشراء ودیگر ذرائع معاش کی اس زمانے میں پیدا ہوگئی ہیں ان کے جواز وعدم جواز کے متعلق شرعی احکام مدون کردیئے جائیں اوراس مجموعہ کا نام بھی میں نے حوادث الفتاویٰ تجویز کردیا تھا، ان فتاویٰ کی تدوین کے لئے میں نے یہ صورت تجویز کی تھی کہ ہر قسم کے اہل معاملہ اپنے اپنے معاملات کی صورتیں لکھ لکھ کر میرے پاس بھیجیں مثلاً تاجر تجارت کی صورتیں، اہل زراعت زراعت کی صورتیں، ملازمین ملازمت کی صورتیں، چنانچہ میں نے اپنے عام بیانات میں بھی اور خاص گفتگو کے موقع پر بھی اس کو ظاہر کیا اور وعدے بھی لیے۔

لیکن افسوس کہ کسی نے میری مدد نہ کی، پھر بھی میں نے بطور خود ہی نیز سوالات موصول ہونے پر لکھے جو حوادث الفتاویٰ کے نام سے شائع بھی ہو چکے ہیں لیکن وہ بہت چھوٹا سا مجموعہ ہے، جو ضروریات کے لیے کافی نہیں مگر اس کے مطالعہ سے کم از کم یہ تو معلوم ہوجاتا ہے کہ معاملات کی جتنی نئی صورتیں ہیں ان سب کے احکام فقہاء کے کلام میں موجود ہیں کیونکہ وہ حضرات کلیات ایسے مقرر فرما گئے ہیں کہ انہیں سے نئی صورتوں کے احکام نکل سکتے ہیں۔

اسی طرح متکلمین نے جو علم کلام مدون کیا ہے اس میں سب کچھ موجود ہے کیونکہ انہیں کے مقرر کردہ اصولوں پر سارے شبہات جدیدہ کا بھی جواب دیا جاسکتا ہے، اوراسی ذخیرہ سے کلام جدید کی بھی بآسانی تدوین ہوسکتی ہے، میں نے بطور خود ہی ان کے بعض شبہات کے جن کا مجھے علم تھا جوابات لکھ کر'' **الانتباهات المفيدة عن الاشتباهات الجديدة** '' کے نام سے شائع کردیا، اوراس میں میں نے ایسے اصول موضوعہ قائم کردیئے ہیں جن سے میرے نزدیک اس قسم کے جتنے شبہات پیدا ہوں بہ

سہولت رفع کئے جاسکتے ہیں۔

اب مجھ میں قوت کہاں ہے، کام کے لوگ موجود ہیں مگر کام نہ کریں تو اس کا کیا علاج ہے، آرام طلبی سے تو کام ہوتا نہیں کام تو کرنے سے ہوتا ہے جیسا مجھ سے بھلا برا ہوسکا دین کی ضروری خدمت کر چکا، اب جو اور کام باقی ہے اس کو اور لوگ کریں کیا وہ نہیں کر سکتے؟ مجھ سے اچھا کر سکتے ہیں لیکن اگر خواہ مخواہ ''واجد علی شاہ'' بن جائیں تو اس کا کوئی علاج ہی نہیں۔[1]

حضرت تھانوی کے یومیہ فتاوی لکھنے کی مقدار

فرمایا: ڈاک کے خطوط مختلف تعداد میں آتے ہیں ہفتہ یا مہینہ کے کبھی جوڑے نہیں گئے، مگر میرا اندازہ پچیس تیس کا اوسط ہے کبھی کبھی پینتالیس (۴۵) پچاس (۵۰) تک گئے ہیں الحمد للہ روز جواب لکھنے کی کوشش کرتا ہوں ورنہ بہت بار اور انبار ہو جائے۔[۴]

فرمایا آج جمع ہوئے استفتوں کا جواب پورا ہو گیا، مگر سر میں بھی درد ہو گیا، اکثر دیکھا ہے کہ جس روز کوئی بڑا کام ختم ہوتا ہے، ختم کے بعد (جسمانی) تکلیف محسوس ہوتی ہے، جیسے منزل پر پہنچ کر تکان ہوتا ہے اور درمیان میں مشغولی کی وجہ سے پتہ بھی نہیں چلتا۔[2]

فرمایا: آج بحمد اللہ میں فتاوی کا جواب لکھ کر فارغ ہو گیا، چھبیس خط تھے اور ہر خط میں قریب قریب چار پانچ سوال اوسط رکھ لیجئے گا قریب پچھتر (۷۵) اسی (۸۰) کے سوالات ہوئے، خدا کے فضل سے ڈیڑھ گھنٹے میں جوابات ہو گئے۔

میرا جی یہ چاہتا ہے کہ عید سے پہلے فارغ ہو جانا چاہئے عید کے روز کوئی بار نہ ہو، ایک آدھ میں بوجہ زیادہ پیچیدہ ہونے کے یہ بھی لکھنا پڑا کہ اس میں ضرورت ہے روایتوں کے دیکھنے کی اور مجھ کو اس کی فرصت نہیں۔[3]

[1] الافاضات ۹/۴/۴۰ تا ۴۰۷۔ کلمۃ الحق ۱۷۔ [2] ملفوظات حکیم الامت ص ۳۹۴ ج ۲ قسط ۴ [3] الافاضات ۲/ ۴۱

فصل (۷)

متعصبین ومعترضین کے اعتراضوں کے جواب کے سلسلہ میں حضرت تھانویؒ کا نظریہ

احقر عرض رسا ہے کہ ایک مدت دراز سے مجھ پر عنایت فرماؤں کی طرف سے بے جا اعتراضوں کی بوچھار ہے جس میں سے اکثر کا سبب تعصب وتحزّب (پارٹی بندی) ہے جس کے جواب کی طرف احقر نے اس لئے کبھی التفات نہیں کیا کہ میں نے ان اعتراضوں کو قابل التفات نہیں سمجھا۔

نیز یہ بھی خیال ہوا کہ آج کل جواب دینا اعتراضات کو ختم نہیں کرتا بلکہ اور زیادہ مطول کلام ہوجاتا ہے (یعنی سلسلہ بڑھ جاتا ہے) تو وقت بھی ضائع ہوا اور مقصد بھی حاصل نہ ہوا۔

تیسرے مجھ کو اس سے زیادہ اہم کام اس کثرت سے رہا کرے کہ اس کام کے لئے مجھ کو وقت بھی نہیں مل سکتا تھا۔

چوتھے میں نے جہاں تک دل کو ٹٹولا ایسے اعتراضوں کے جواب دینے میں بہت اچھی نہیں پائی، میں اہل خلوص کو تو کہتا نہیں مگر مجھ جیسے مغلوب النفس کی زیادہ تر نیت یہی ہوتی ہے کہ جواب نہ دینے میں معتقدین کم ہوجائیں گے، شان میں فرق آجائے گا، جس کا حاصل ارضاءِ عوام (یعنی مخلوق کو راضی کرنا) ہے، سو طبعی طور پر مجھ کو اس مقصود سے (یعنی عوام کو راضی کرنے سے) غیرت آتی ہے۔[1]

---

[1] اشرف السوانح ص ۱۵۵ ج ۳

معترضین کے اعتراض اور طعن وتشنیع کے جواب میں حضرت تھانویؒ رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

حضرت (اقدس تھانویؒ) پر اگر کوئی کسی قسم کا اعتراض کرتا ہے تو اس سے اپنی برأت فرمانے کی ہرگز کوشش نہیں فرماتے بلکہ اگر وہ اعتراض علمی رنگ کا ہوتا ہے اور قابل قبول ہوتا ہے تو اس کو قبول فرما کر اپنی سابقہ تحقیق سے بلا تامل رجوع فرما لیتے ہیں۔

اور اگر اس اعتراض کا قابل قبول ہونا مشکوک ہوتا ہے تو اس اعتراض کو اپنے جواب کے ساتھ ''ترجیح الراجح'' میں شائع فرما دیتے ہیں تا کہ دیکھنے والے خود جس کے قول کو چاہیں ترجیح دے سکیں، یہ معاملہ تو علمی رنگ کے اعتراض کے ساتھ فرماتے ہیں۔

اور اگر اعتراض معاندانہ رنگ کا ہوتا ہے (جو طعن وتشنیع پر مشتمل ہوتا ہے) تو اس کے متعلق پرواہ نہیں فرماتے، چنانچہ اگر ایسا اعتراض جوابی خط کے ذریعہ موصول ہوتا ہے تو اپنی برأت فرمانے کے بجائے نہایت استغناء کا جواب تحریر فرما دیتے ہیں، اور ایسے عنوان سے کہ معترض پر یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کے اعتراض کو بالکل لغو اور ناقابل التفات سمجھا گیا، مثلاً ایک شخص کو جس نے واہی تباہی اعتراضات لکھ کر بھیجے تھے تحریر فرما دیا کہ مجھ میں اس سے زیادہ عیوب ہیں مگر مجھے تو اپنے عیوب کی اشاعت کی توفیق نہیں ہوئی تم ان کو مشتہر کر دو تا کہ لوگ دھوکہ میں نہ رہیں، اور اگر خط جوابی نہیں ہوتا تو اس کو پھاڑ کر ردی میں ڈال دیتے ہیں۔ [1]

---

[1] اشرف السوانح سوم ص ۱۵۴

معقول اور صحیح جواب بھی متعنّت کے تعنت کو رفع نہیں کرسکتا

''حفظ الایمان'' کی ایک عبارت کے سوال وجواب اور معترض کے اعتراض کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

جواب دینا تو اختیار میں ہے میں نے جواب اس عبارت کے حاشیہ پر لکھ دیا ہے، باقی تسلی ہوجانا کسی کے اختیار میں نہیں، خصوصاً جنہوں نے پہلے سے مخالف فیصلہ کر رکھا ہے، جواب صحیح متردد کے تردد کو رفع کرسکتا ہے، متعنت کے تعنت کو رفع نہیں کرسکتا۔

رسالہ کا جواب برنگ مناظرہ ہمارے بزرگوں کی وضع کے خلاف اور بے نتیجہ ہے، سچی بات لکھ دی، کوئی نہ مانے تو ہم درپے نہیں ہوتے۔

آگے خط میں لکھا تھا'' تاکہ مجھے ان لوگوں سے (یعنی مخالفین سے) مقابلہ کی جرأت ہو'' اس کا یہ جواب لکھا گیا کہ'' اس کی ضرورت نہیں، نہ اس سے کبھی نزاع قطع ہوا ہے''۔[1]

ایک فتوے کی وجہ سے قتل کی دھمکی

بعد الحمد والصلوٰۃ احقر اشرف علی تھانوی مدعا نگاہ رہے کہ مولوی مظہر الدین صاحب مرحوم کے واقعہ کے بعد سے اخبارات سے برابر معلوم ہوتا رہا کہ مختلف حضرات کے پاس قتل کی دھمکی کے خطوط آرہے ہیں، یہ فعل کسی منظّم جماعت کا ہے یا افراد کا اس کا تو علم خدا کو ہے مگر جب یہ وبا چل رہی تھی تو میں اس سے کیسے بچ سکتا تھا، چنانچہ ایک خط جس میں کاتب کا نام و پتہ نہ تھا میرے نام بھی مضمون ذیل کا پہنچا۔

میرا ہی کیا ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ مقدرات بدلا نہیں کرتے لہٰذا جو ہونے والا ہے ہوکر رہے گا اور نہ ہونے والا نہ ہوگا، اس لئے اس خط سے بحمد اللہ مجھ پر کوئی معتد بہ

---
[1] امداد الفتاویٰ ص ۱۰۱ ج ۶ سوال ۴۴۱

اثر نہیں ہوا اور نہ اس سے بچنے کے لئے مجھ کو کسی بیان کے شائع کرنے کی ضرورت تھی، مگر اس سے مجھے یہ شبہ ہو گیا کہ بعض لوگوں کو مسلم لیگ کے متعلق میرے مسلک کی نسبت کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے تو اگر اس خط میں کاتب کا نام ونشان ہوتا تو خصوصیت کے ساتھ تفہیم ممکن تھی، اب عام عنوان سے جواب دیتا ہوں، ذیل میں اول اس خط کو نقل کرتا ہوں پھر اپنا جواب نقل کروں گا۔

دھمکی کا خط

مولوی اشرف علی تھانوی! یہ بات بہت تشویش اور ہمارے لئے شرم کی ہے کہ کانگریس جمعیۃ العلماء احرار اور مومن کانفرنس کی تمام کوششوں کے باوجود مسلم لیگ کا فتنہ ملک میں پھیلتا جاتا ہے اور آپ نے علماؤں کے خلاف مسلم لیگ کے موافق فتویٰ دیا ہے جس سے بہت اثر ہے، لیکن اب ہماری پارٹی مسلم لیگ کے مولویوں اور بددین لیڈروں کو مزا چکھانے کے لئے تیار ہو کر میدان میں آ گئی ہے اس لئے آپ کو بھی یہ تاکیدی نوٹس دی جاتی ہے کہ ایک مہینہ کے اندر اندر مسلم لیگ سے اپنا فتویٰ واپس لے لو اور حصرت امیر الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ کا مسلک قبول کرلو اور کانگریس کی حمایت کرو ورنہ یقین اور پورا یقین رکھو کہ ۔۔۔۔۔ کی طرح سے تم کو بھی تمہاری خانقاہ میں چھرے سے ذبح کر دیا جائے گا، یہ قسمیہ اور ایماناً اطلاع بھیجی جاتی ہے، ایک مہینہ کی مدت غنیمت جاننا ایک مہینہ تمہارے بیان کی انتظاری کر کے ہمارا آدمی روانہ ہو جائے گا جو پستول یا چھرے سے تم کو ختم کر دے گا، پھر مردود جینا کی باری ہوگی اور بدعتی مولوی ہامد بدایونی کی، یہ چٹھی کوئی دھمکی نہیں ہے۔

فقط کانگریس زندہ باد اور جمعیۃ العلماء زندہ آباد

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا جواب

معلوم ہوتا ہے کہ کاتبِ خط نے میرے اس فتوے میں جو مسلم لیگ کے متعلق ہے جس کا لقب ''تنظیم المسلمین'' ہے غور نہیں کیا جس کی وجہ سے بلا دلیل بلکہ خلافِ دلیل اس کو مسلم لیگ کی حمایتِ مطلقہ سمجھ لیا حالانکہ اس میں ذیل کی قیود کی تصریح ہے۔۔۔۔

یہ ہے واقعہ، مگر میں اب بھی اس پر آمادہ ہوں کہ اگر علماء سے اس کارروائی کے خلاف شرع ہونے کا فتویٰ حاصل کر کے مجھ کو اطلاع کر دی جاوے میں اس میں انصاف اور تدین سے غور کر کے شرح صدر کے بعد اپنے فتویٰ سے رجوع کر لوں گا جیسا کہ میرا ہمیشہ سے معمول رہا ہے، رسالہ ترجیح الراجح کا سلسلہ اس کی دلیل ہے اور یہی کلام ہے کانگریس کی حمایت میں جس کو میں اب تک بحالت موجودہ اسلام اور اہل اسلام کے لئے سخت مضر سمجھتا ہوں لیکن اگر دلیل شرعی اس کے خلاف واضح ہو جائے میں اپنی رائے بدلنے کے لئے تیار ہوں اور یہی صحیح طریقہ بھی ہے کسی کی غلطی پر مطلع کرنے کا، باقی اگر تخویف سے کسی نے اپنے ضمیر کے خلاف کوئی رائے بھی ظاہر کر دی یہ عقلاً بھی مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر شخص سمجھے گا کہ یہ رائے دل سے نہیں تو اس سے مقصود بھی حاصل نہ ہوگا، اس لئے یہ طریقہ محض عبث اور عقل و شرع دونوں کے خلاف ہے۔

یہ سب تنقیح اس وقت ہے جب حقیقت کو سمجھنا اور حق کا اتباع کرنا مقصود ہو اور اگر یہ نہیں تو پھر بجز قیامت کے دن کے اس کے فیصلہ کی کوئی صورت نہیں، باقی میں اس پر قادر نہیں کہ محض مخلوق کو راضی کرنے کے لئے حق تعالیٰ کو ناراض کر دوں اور دنیا کے متاع قلیل کے لئے آخرت کے نفع و ضرر کو نظر انداز کر دوں والسلام **واللہ الھادی الیٰ سواء السبیل**[1]

---

[1] افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص۸۴، ۸۷

ایسے حالات میں اہل علم وارباب فتاویٰ کے لئے مشورہ

میرا طرز عمل اور مشورہ مذکور ہے ،ان اعمال میں جو امور شرعاً منکر ہیں ان کو اعتقاداً اور عملاً واجب الترک جانتا ہوں اور جو مستحسن اتفاقی ہیں ان کو اعتقاداً تو حسن جانتا ہوں باقی عملاً جن پر قدرت ہے ان کو قابل عمل اور جن پر قدرت نہیں ان میں اپنے کو معذور سمجھتا ہوں اور جو اختلافی ہیں ان میں اپنی تحقیق پر عمل کرتا ہوں اور دوسری جانب کو بھی محل ملامت نہیں سمجھتا اور نہ ان میں کسی کو اپنے مسلک کی طرف دعوت دیتا ہوں البتہ کوئی مخلص خواہ واقع میں مخلص ہو خواہ اپنے کو مخلص ظاہر کرے اور میرا وجدان اس کی تکذیب نہ کرے ایسا شخص اگر میرے مسلک کو دریافت کرتا ہے اور مجھ کو وجدان سے دو امر مظنون ہوں ایک یہ کہ متردد ہے دوسرے یہ کہ عمل کے لئے پوچھتا ہے کسی سے قیل وقال یا بحث وجدال نہ کرے گا اس کو خاص طور پر بتلا دیتا ہوں باقی کسی کو خود کچھ نہیں کہتا اور دیانت اسی کو سمجھتا ہوں کہ جس شق کا حق ہونا محقق ہوا اسی کو اختیار کرے محض مال یا جاہ کی غرض سے اس کو ترک نہ کرے ہاں شرعاً اکراہ کا درجہ ہو جاوے خواہ حکام سے یا عوام سے اس وقت اکراہ کے مسائل پر عمل کرلے اور دوسری شق مختلف فیہ میں اختلاف والوں کی مخالفت یا ان کے خلاف کی کوشش نہ کرے اور یہی دوسرے مسلمانوں کو بھی مشورہ دیتا ہوں پھر باوجود میرے اس قدر صفائی اور نرمی کے اگر پھر بھی کوئی مجھ کو بدنام کرے تو بجز اس کے کیا کہہ سکتا ہوں وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ ○

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا ومولانا محمد واٰلہٖ واصحابہ اجمعین واٰخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین۔

نصف ربیع الاول ۱۳۴۰ھ۔ (افادات اشرفیہ ص ۱۴)

حضرت اقدس تھانویؒ پر چند الزامات اور حضرت تھانویؒ کا جواب

مولانا عبدالماجد صاحبؒ تھانویؒ کی خدمت میں ایک عریضہ میں تحریر فرماتے ہیں:

سوال: ''پچھلے دنوں جناب والا سے متعلق عجب عجب اتہامات سننے میں آئے، ایک صاحب نے ایک مشہور مولوی صاحب کے حوالہ سے بیان کیا کہ جناب نے یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ جب تک جسم پر ولایتی کپڑے کا کوئی جزء نہ ہوگا نماز درست نہ ہوگی، معاذ اللہ۔

ایک دوسرے صاحب نے بیان کیا کہ آپ نے بیان القرآن سورۂ مائدہ کی آیت وَلَتَجِدَنَّ اَشَدَّالنَّاسِ عَدَاوَۃً کے تحت میں گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ موالات ومودت فرض قراردی ہے، پہلے افتراء (بہتان) کی تو زبانی تردید کر کے خاموش رہا، اس دوسرے افتراء کی تردید اصل تفسیر سے اقتباس دے کر اب کی ہفتہ کے پرچہ سچ میں کر رہا ہوں''

حضرت اقدس تھانویؒ نے جواب تحریر فرمایا:

یہ آپ کی محبت ہے مگر مجھ کو تو طبعاً اچھا نہیں معلوم ہوتا، اس اتہام میں نہ ان کا ضرر نہ میرا، بلکہ جواب دینے میں ان کا یہ ضرر ہے کہ اب تو وہ اتہام میں معذور ہیں اور جب وہ جواب پر مطلع ہو کر قبول نہ کریں گے تو عاصی (گنہگار) ہوں گے تو ایک مسلمان کو عاصی بتانا کیا فائدہ۔

سوال: حیرت ہی ہوتی رہتی ہے کہ بعض لوگ افتراء کرنے پر اور بعض لوگ

ہرضعیف سے ضعیف بلکہ مہمل روایت کوقبول کرلینے پر کیسے آمادہ ومستعد رہتے ہیں

جــواب: حکمت نہ معلوم ہونے سے حیرت لازم ہے، مگر مجھ کو حیرت نہیں ہوتی، حکمت معلوم ہوگئی ہے اس حکمت کا حاصل ایک مثال سے سمجھ لیجئے کہ جس امام کے پیچھے جتنے مقتدی کم ہوں گے اگر غلطی بھی کرے گا تب بھی اس سے ہلکا رہے گا جس کے زیادہ مقتدی ہوں۔[1]

اسی نوع کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا

کوئی گھبرانے کی بات نہیں اس سے زیادہ سے زیادہ آثار پیش آتے ہیں، اور نہایت آسانی سے زائل ہوجاتے ہیں، انشاءاللہ تعالیٰ بہت جلد یہ شکایت زائل ہوجائے گی۔[2]

حضرت اقدس تھانویؒ پر ناانصافی وبداخلاقی کا الزام اوراس کا جواب

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے نام ایک صاحب نے ایک خط میں حضرت تھانویؒ کے متعلق یہ اعتراض تحریر فرمایا کہ

''خود حضرت مولانا (تھانویؒ) کا طرز عمل اپنی اس تعلیم سے مختلف کیوں نظر آتا ہے، آپ کے علم ومشاہدہ میں متعدد واقعات ایسے ہوں گے کہ ادنیٰ سے اختلاف پر مولانا (تھانویؒ) سخت ناخوش ہوگئے، اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ انقباض وتکدر محض طبعی رہا، بلکہ اس کا اثر تعلقاتِ تربیت پر پڑا، ایک آدھ مثال میرے علم میں ایسی ہے کہ حضرت نے ایک صاحبِ علم وفضل اور غایت درجہ معتقد سے محض اتنی بات پر قطع

[1] حکیم الامت نقوش وتاثرات ص۲۳۴ [2] ایضاً ص۳۶۴

تعلق فرمالیا کہ انہیں ایک اجتہادی فرعی مسئلہ بلکہ اس کے ایک جزئیہ میں دیانۃً مولانا سے اختلاف تھا، ایسے واقعات کی کیا توجیہ کی جائے، اگر میری سمجھ کا پھیر ہو تو ازراہ شفقت وکرم آپ مجھے تفصیل سے سمجھادیں"۔

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب نے اس مکتوب کو حضرت تھانویؒ کی خدمت میں پیش کرنے کے ساتھ یہ تحریر فرمایا کہ:

"تفصیلی جواب تو ان صاحب کو میں خود انشاءاللہ دے دوں گا، میری امداد صرف اجمالی نکات سے فرمادی جائے"۔

حضرت اقدس تھانویؒ کا جواب

ایسے سوالات کے جوابات دینے کا میرا مزاج نہیں

حضرت تھانویؒ نے تحریر فرمایا:

اصل میں تو میرا مذاق ایسے سوالات کے جوابات دینے کا نہیں کیونکہ اپنی ذات کے متعلق جواب دینا مرادف ہے کہ ہم اس نقص سے بری ہیں سوایسا دعویٰ کرنا خود فَلَاَ تُـزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ کے خلاف ہے، اس لئے ان کو اتنا ہی جواب کافی ہے، مگر آپ پر کشف واقعہ کی غرض سے اتنا جواب کافی اور دے سکتا ہوں کہ گول بات کا جواب ہو نہیں سکتا، نہ مجھ کو کوئی واقعہ ایسا یاد ہے اگر ان سے اس صاحب علم وفضل کا نام اور اس اجتہادی فرعی مسئلہ کی تعیین اور نوعیتِ اختلاف کی تحقیق فرمالی جائے اور مجھ کو یاد بھی آجاوے تو بے تکلف عرض کردوں گا خواہ ان کی غلطی ہو خواہ میری غلطی ہو۔[1]

---

[1] حکیم الامت نقوش وتاثرات ص ۳۵۴

ایک وعظ کی بعض باتوں پر اشکال اور حضرت تھانویؒ کا جواب

حضرت والا کے ایک وعظ کی بعض مثالوں پر یہ شکایت کی گئی ہے کہ اس میں (بعض برادریوں کی) دل آزاری کی گئی ہے۔۔۔۔حضرتؒ نے جواب تحریر فرمایا:

السلام علیکم اول تین وجہ سے جواب نہیں دیا گیا تھا ایک وجہ یہ کہ میں اس سے زیادہ اہم خدمات دینیہ میں فاقد الفرصت تھا۔

دوسری وجہ یہ کہ وہ سوال خلاف اصول تھا حقیقت کے اعتبار سے بھی کیونکہ میرا فعل میری رائے میں خلاف شریعت نہیں اور صحیح طریق کے اعتبار سے بھی اس لئے کہ صحیح طریق یہ ہے کہ جواب کے لئے ٹکٹ بھی رکھا جائے۔

تیسری وجہ یہ کہ غایت وضوح کے سبب یہ توقع تھی کہ خود ہی جواب ذہن میں آجائے گا لیکن بار بار کے سوال سے وہ توقع نہ رہی گو خلاف اصول ہونے کے سبب اب بھی جواب میرے ذمہ نہیں لیکن تفہیم کی مصلحت سے تبرعاً جواب لکھتا ہوں وہ یہ کہ: میرا یہ فعل اگر خلاف شریعت سمجھا جاتا ہے تو مستند علماء اہل فتویٰ سے استفتاء کر کے حکم حاصل کر لیا جائے، میں اس حکم کو دل وجان سے قبول کرنے کے لئے اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوں اور احتیاط یہ ہے کہ ان علماء کی خدمت میں یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ جواب لکھتے وقت احیاء العلوم ودرمختار مع ردالمحتار کو بھی ملاحظہ فرمالیں، نیز اس استفتاء کے ساتھ دوسرا استفتاء کر لینا بھی مناسب ہے کہ بدون دلیل شرعی کے کسی نسبت کا دعویٰ کرنا تحقیق سے یا تاویل سے کیسا ہے؟ اور اس دلیل اور تاویل کو بھی ظاہر کر دیا جائے اور اگر میرا فعل محض خلاف طبیعت ہی ہے تو میری قوم یعنی فاروقیین کی بزعم خود تنقیص کر کے دل ٹھنڈا کر لیا جائے آگے نیتوں کا حقیقی فیصلہ انما الاعمال بالنیات وقت پر ہو رہے گا اور اگر اس پر بھی قناعت نہ ہو تو احکام شرع وعقوبتِ آخرت کو پیش نظر رکھ کر اختیار ہے۔

والسلام ۲۵ ؍رجب ۱۳۵۱ھ یوم جمعہ (کمالات اشرفیہ ص ۳۹۷)

فصل (۸)

ضرورت کے وقت اہل افتاء کو بھی استفسار و تحقیق کی ضرورت

حکیم الامت حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

(تراویح میں پورا قرآن پاک ختم کرنے کے سلسلہ میں) مجھ کو دو تردد تھے، ایک یہ کہ آیا ختم کا سنت مؤکدہ ہونا اصل مذہب ہے یا صرف مشائخ کا قول، مراجعت کتب فقہیہ سے یہ ثابت ہوا کہ یہ علماء احناف میں مختلف فیہ ہے، اکثر کا قول تو تاکدّ ہی ہے، بعض کا قول عدم تأکد بھی ہے، دوسرا تردد یہ تھا اور ہے کہ قائلین بالتأکد کی دلیل کیا ہے ؟ سو اسی کو میں متعدد علماء سے استفسار کیا کرتا ہوں، جس سے مقصود تأکد کی نفی نہیں بلکہ اس پر طلب دلیل ہے، اگر اس پر بھی اعتراض ہے تو اس اعتراض کا حاصل تو یہ ہوا کہ جو امر معلوم نہ ہو اس کو طلب نہ کرنا چاہئے، تو اہل انصاف خود ہی غور کر لیں کہ آیا دین میں طلب علم مقصود ہے یا بقاء علی الجہل [1]

اپنی تحقیق و تحریر پر اصرار نہیں

شب برأت کے بعض اعمال کے متعلق ایک علمی وفقہی مکاتبت میں ایک بڑے محقق عالم کے خط کے جواب میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''یہ ہے (وہ تحقیق) جو اس باب میں میرے علم میں ہے، لیکن مجھ کو اس پر اصرار نہیں، اگر (معتبر اور جید) علمائے وقت دو چار بھی اس کو خطا فرما دیں، میں تقلیداً بھی قبول کرنے کو اور بعد قبول اعلان رجوع کو آمادہ ہوں [2]

---

[1] امداد الفتاویٰ ص ۵۰۱ ج ۱ سوال ۴۲۸ [2] امداد الفتاویٰ ص ۲۱ ج ۴ سوال ۱

فیصلہ کے لئے دیگر علماء محققین سے مراجعت

مذکورہ بحث سے متعلق حضرت اقدس تھانویؒ نے مزید تحقیق وفیصلہ کیلئے پوری مکاتبت مفتیانِ دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں بھیج دی جس میں تحریر فرماتے ہیں:

بعد اس تحریر کے حضرات علماء محققین کی خدمت میں عرض ہے کہ مجھ کو اس پر اصرار نہیں ہے، اپنی رائے اور معلومات کو ظاہر کر دیا اور جانبین کی تحریرات کو پیش کر دیا، اب امید کرتا ہوں کہ قواعد شرعیہ سے جو امر صحیح معلوم ہو اس کی تعیین فرمادی جائے، اگر میری رائے غلط ہوگی میں اپنے رجوع کا اعلان کر دوں گا، اور علماء کے فیصلہ کر دینے کے بعد ان سے دوبارہ مقاولت ومکاتبت نہ کی جاوے گی، اس کو فیصلہ اخیر سمجھ کر تسلیم کر لیا جائے گا، اگر تحقیقاً بھی سمجھ میں نہ آئے گا تقلیداً قبول کر لوں گا پس بلا تکلف اور بلا رعایت احقر کے اپنی رائے مبارک کا اظہار فرما دیا جائے، گو ادلہ بھی نہ فرمائی جاویں [1]

مراجعت کے بعد مزید بحث کو جاری رکھنے سے معذرت

مولانا المکرّم دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمت اللہ

چونکہ اس باب میں حضرات دیوبند کی تحقیق کا التزام کر چکا ہوں، جب تک اس تحقیق کا خطاء صریح ہونا دل کو نہ لگ جائے اس وقت تک اس کے قبول سے بھی اور باوجود گنجائش کلام کے اس میں کلام سے معذور ہوں، البتہ تحریر سامی کو اس غرض سے شائع کر دوں گا کہ ناظرین کو تحقیق کا موقع ملے، اور اگر کسی وقت میرے بھی جی کو لگ گیا تو اس التزام کو ترک کر دوں گا [2]

---

[1] امداد الفتاویٰ ص ۲۶ ج ۴ [2] امداد الفتاویٰ ص ۳۳ ج ۴

تردد کے بعد دوسروں کے فتوے کے ساتھ موافقت

حضرت مولانا صدیق احمد صاحب کاندھلویؒ سے ایک دوسرے مسئلہ میں طویل مکاتبت کے بعد اخیر میں حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

اس کے بعد پھر ایک بار مراجعت مکاتبت کی ہوئی جس کی نقل محفوظ نہیں، جس کے بعد خود اس احقر کو اپنے جواب میں تردد ہو گیا، اور عمل میں مولانا صدیق احمد صاحب کے ساتھ میں نے موافقت کی۔[1]

ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

مجھ کو اپنا جواب نہ یاد ہے نہ میرے سامنے ہے کہ اس کو دیکھتا، بہرحال اگر میرا جواب درمختاار کے خلاف ہے تو صحیح نہیں، درمختار پر عمل کیا جائے گا۔[2]

ہمارے اکابر اپنی غلطیوں کے اقرار سے کبھی نہیں شرمائے

حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

میں نے تو ''ترجیح الراجح'' کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے کہ جس کو جو غلطی میری تصانیف میں ملے اس سے مجھے مطلع کرے، تاکہ اگر مجھے اپنی غلطی کا اطمینان ہو جائے تو اس سے اعلان کے ساتھ رجوع کر لوں، چنانچہ مجھ سے جہاں کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے اس کا دل کھول کر فراخ دلی سے اقرار کیا ہے، اور جہاں مجھے اپنی غلطی کا شرح صدر نہیں ہوا، وہاں دوسرے کا قول بھی نقل کر دیا ہے تاکہ جو قول جس کے جی کو لگے وہ اسی کو اختیار کر لے، میں نے ہمیشہ یہی کیا کہ خواہ مخواہ اپنی بات کو بنایا نہیں اور یہ برکت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی ہے، ویسے تو یہ خصلت اپنے سب اکابر میں تھی، ہمارے اکابر اپنی غلطیوں کے اقرار سے کبھی نہیں شرمائے۔[3]

---

[1] امداد الفتاویٰ ۱/ ۶۳۰ سوال ۴۴۴ [2] امداد الفتاویٰ ۴/ ۳۶۳ [3] الافاضات الیومیہ ۹/ ۴۰۸ قسط: ۲، ملفوظ: ۲۳۱

فصل (۹)

تصحیح الاغلاط وترجیح الراجح کا سلسلہ

اپنی غلطی واضح ہوجانے کے بعد اس سے رجوع کا اعلان

(حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:)

مجھ کو اپنے فہم یا تحقیق پر وثوق تو کبھی نہیں ہوا، مگر اس کے ساتھ ہی اپنے ساتھ اتنی بدگمانی بھی نہ تھی کہ از خود اپنی زلات (لغزشوں) واغلاط کی تفتیش کا اہتمام کرتا، البتہ اگر کبھی اتفاقاً ہی کسی نے غلطی کی اطلاع دی تو بحمد اللہ فوراً رجوع کرلیا، اور کسی نہ کسی موقع پر اس کو شائع کردیا چنانچہ میری تحریرات سے یہ بات ظاہر ہے۔

خصوصاً امداد الفتاوی کے بعض حصص کے اخیر میں ایک طویل فہرست اس کی بھی ملحق ہے، پھر جب ان تنبیہات کی مقدار معتد بہ ہوگئی تو مصلحت معلوم ہوئی کہ اس کا ایک مستقل سلسلہ جاری رکھا جائے، چنانچہ ترجیح الراجح کی یہی حقیقت ہے۔

حضرت والا کی اعظم خصوصیات میں سے یہ ہے کہ اپنی تصانیف کے تسامحات کو جن کا علم خود یا کسی دوسرے کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے ان سے رجوع فرماتے رہتے ہیں اور اس رجوع کو شائع بھی فرماتے رہتے ہیں اور اس سلسلہ کا ایک خاص لقب ''ترجیح الراجح'' بھی تجویز کیا گیا ہے جو مستقل طور پر جاری ہے اس سلسلہ میں جہاں حضرت والا کو اپنے تسامح پر شرح صدر ہوجاتا ہے، وہاں رجوع فرمالیتے ہیں اور جہاں تردد رہتا ہے وہاں جواب لکھ کر یہ تحریر فرمادیتے ہیں کہ دیگر علماء سے بھی تحقیق کرلی جائے، اس سلسلہ کے متعلق ایک مولوی صاحب سے حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا یہ قول احقر نے سنا ہے کہ ''ترجیح الراجح'' اس زمانے میں بالکل ایک نرالی چیز ہے، یہ سلف صالحین کا معمول تھا مولانا تھانوی کی امتیازی شان اور کمال صدق واخلاص کے ظاہر کرنے کے لیے بس یہی کافی ہے۔[1]

[1] اشرف السوانح ۱۳۳/۳

ترجیح الراجح کی ایک مثال

استخارہ کا ثمرہ رجحانِ قلب

استخارہ کا یہ ثمرہ کہ ''جس طرف قلب متوجہ ہو اس کو اختیار کرے'' یہ مشہور قول ہے، اور نووی وغیرہ اسی طرف گئے ہیں **کما نقله الحافظ فی فتح الباری کتاب الدعوات باب الدعاء عندالاستخارہ قوله ثم رضی به مانصه ''ویفعل بعدالاستخارہ مانیشرح به صدره'۔**

مگر دلائل سے یہ راجح ثابت ہوا کہ اس انشراح کے انتظار کی ضرورت نہیں بلکہ جومناسب سمجھے کرلے، یہ قول عزالدین بن عبدالسلام کا ہے، اور اس کی ترجیح کے دلائل میرے ایک ملفوظ میں ہیں جو القول الجلیل حصہ دوم میں ضبط کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو بوادرالنوادر ص۴٦۴)

اس تحقیق مذکور کے ایک مدت کے بعد ایک فاضل دوست نے جامع صغیر سیوطیؒ کی ایک حدیث دکھلائی جس کے ظاہر الفاظ سے متبادر ہوتا ہے کہ استخارہ کے بعد میلان قلب (یعنی دلی رجحان) کا انتظار کیا جائے وہ حدیث یہ ہے:

فی شرح الجامع الصغیر اذا هممت بامر فاستخرربک فیه سبعمرات ثم انظر الی الذی یسبق الی قلبک فان الخیرة فیه ،ابن السنی فی عمل یوم ولیلة (فر) عن انس)ض)

قال النووی وفیه ان یفعل یعدالااستخارہ مانیشرح له' صدره' لکنه' لایفعل ماینشرح له' صدره' ماکان له فیه هوقبل الاستخارہ[1]

---

[1] فیض القدیر ص٦ ۵۷ ج۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتو اپنے رب سے سات مرتبہ استخارہ کرو پھر غور کرو، تمہارا قلبی رجحان جس جانب ہو اس کو اختیار کرو، کیونکہ خیر اسی میں ہے، حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں:

استخارہ کے بعد جس جانب شرح صدر ہوجائے اس کو اختیار کرے، لیکن استخارہ سے پہلے ہی جس بات کی طرف قلبی رجحان تھا اس کو نہ کرے (کیونکہ وہ استخارہ کا ثمرہ نہیں) استخارہ کا کامل طریقہ نماز پڑھ کر ہے، بغیر نماز کے محض دعاء سے بھی اصل سنت ادا ہوجاتی ہے اور استخارہ ہوجاتا ہے۔[1]

حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

اب اس باب میں قول مشہور ہی کو ترجیح معلوم ہوتی ہے، واللہ اعلم، پس (اب میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ) استخارہ کے بعد اگر کسی شق کا رجحان قلب میں آجائے تو اس پر عمل کرے، اور اگر کسی کا رجحان نہ ہو تو جس شق پر چاہے عمل کرے۔

نوٹ: احوط یہ ہے کہ دونوں فصلیں دکھلا کر دوسرے علماء سے بھی مشورہ کرلیا جائے۔[2]

بہشتی زیور اور تعلیم الدین کے بعض مقامات کی اصلاح

مقام اول: بہشتی زیور میں عشاء کے بعد چار سنتیں لکھ دی ہیں، صحیح یہ ہے کہ دو سنت ہیں اور دو نفل۔

مقام دوم: بہشتی زیور میں ایام بیض ۱۲۔۱۳۔۱۴ تاریخوں کو لکھ دیا ہے صحیح ۱۳۔۱۴۔۱۵ ہیں۔

مقام سوم: تعلیم الدین و بہشتی زیور میں تیجے چالیسویں وغیرہ کے بدعت

[1] فیض القدیر ص ۵۷۶ [2] بوادر النوادر ص ۶۷۶ ج ۲ نادرہ ۶۷

ہونے کے ذکر میں یہ لفظ لکھا گیا ہے ''ضروری سمجھ کر کرنا'' اس سے شبہ ہوسکتا ہے کہ شاید غیر ضروری سمجھ کر کرنا جائز ہو، سو یہ قید واقعی تھی احترازی نہ تھی، حکم یہ ہے کہ خواہ کسی طرح سے کرے بدعت ہے۔

مقام چہارم: تعلیم الدین میں قبروں پر چراغ جلانے کے بارہ میں یہ لفظ لکھا گیا ہے ''کثرت سے چراغ جلانا'' اس میں بھی مثل مقام سوم کے سمجھنا چاہئے حکم یہ ہے کہ ایک چراغ رکھنا بھی بدعت ہے۔[1]

حضرت تھانویؒ کی اپنی تصنیفات وتحریرات سے متعلق

اطلاع اور دو ضابطے

حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

تالیفات کے بعض مقامات میں مجھ سے اختصار موہم یا زیادت موہمہ یا غفلت سے کچھ لغزشیں بھی ہوئی ہیں جو اس وقت ذہن میں حاضر ہیں ان کی اطلاع جزئی طور پر دیتا ہوں اور جو اس وقت ذہن میں حاضر نہیں ان کے لئے دو قاعدے عرض کرتا ہوں۔

ایک یہ کہ میری کسی ایسی تصنیف میں جو اس محل لغزش سے متاخر ہو اس کی اصلاح کردی گئی ہو، اور متاخر ہونا تاریخ کے ملانے سے جو کہ ہر تصنیف کے آخر میں التزاماً لکھی گئی ہے معلوم ہوسکتا ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم کر لینا چاہئے کہ میری تالیفات میں جو مضمون متعارض ہو اس میں اخیر کا قول میرا سمجھا جائے۔

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ ایسے مواقع مشتبہ کو دوسرے علماء محققین سے تحقیق کرلیا جائے اور ان کے قول کو میرے قول پر ترجیح دی جائے۔

[1] اشرف السوانح ص۱۱۲ ج۳

اسی طرح اگر میرا لکھا ہوا کوئی مشتبہ فتویٰ کسی کی نظر سے گذرے اس میں بھی یہی تقریر معروض ہے کیونکہ بعض اوقات لکھنے کے بعد خود مجھ کو بعض جوابوں کا غلط ہونا محقق ہوا ہے، میں نے سائل کا پتہ معلوم ہونے پر اس کو مطلع بھی کر دیا ہے، لیکن پتہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں یا اس سائل کے پاس میری تصحیح کے محفوظ نہ رہنے کی تقدیر پر احتمال غلطی میں پڑنے کا ہوسکتا ہے اس لئے احتیاطاً یہ عرض کیا گیا۔

میری تحریرات میں جو مضامین از قبیل علوم مکاشفہ ہیں جو کہ علم تصوف کی ایک قسم ہے جس کو حقائق ومعارف سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور حجج شرعیہ ان سے ساکت ہیں ان کو حسب قاعدہ اصولیہ وکلامیہ امور ثابتہ بدلائل شرعیہ کے درجہ میں نہ سمجھنا چاہئے، بلکہ بالکل اعتقاد نہ رکھنا بھی جائز ہے اور اگر اعتقاد رکھے تو محض احتمال کے درجے سے تجاوز نہ کرے۔

(چند تنبیہات) (۱) انوار الوجود کو عام لوگ نہ دیکھیں اور خواص بھی ان کو صرف ذوقیات ولطائف کے درجہ سے آگے نہ بڑھاویں۔

(۲) نیل الشفا کے متعلق النور نمبر ۹ ج ۳ میں ایک تنبیہ شائع ہوگئی ہے اس کے خلاف نہ کریں۔

(۳) بہشتی زیور وگوہر وامداد الفتاویٰ مع تتمات اور حوادث کے ساتھ ترجیح الراجح کا ضرور مطالعہ فرماویں کہ اس میں بہت مقامات کی اصلاح ہے اور مکمل ومدلل بہشتی زیور وگوہر کے طبع میں مولوی شبیر علی نے ان ضروری اصلاحات کو لیا بھی ہے۔

(۴) جمال القرآن میں متعدد تسامحات ہوگئے ہیں اب اصلاح کے بعد مولوی شبیر علی اس کو شائع کرنے والے ہیں اس کو اصل سمجھیں۔

آخر میں احباب سے دعاء کی استدعا ہے کہ حق تعالیٰ میری خطا وعمد کو معاف فرمائے اور میری تقریرات وتحریرات کو اضلال کا سبب نہ بناویں۔[۱]

---

[۱] اشرف السوانح ص ۱۱۲،۱۳۵ ج ۳، بوادر النوادر ۴۲۸

رجوع واعتراف کے چند نمونے

امام کے علاوہ سامع کو بھی تراویح میں اجرت لینا جائز نہیں

(حضرت تھانویؒ ایک وعظ میں ارشاد فرماتے ہیں) ایک مسئلہ اور ہے اس میں مجھ سے غلطی ہو چکی ہے وہ یہ ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ سامع کو (یعنی امام کے پیچھے حافظ مقتدی جو لقمہ دینے کی غرض سے متعین ہو اس کو) روپیہ لینا (بطور اجرت کے) جائز ہے، میں اس کو تعلیم پر قیاس کرتا تھا، (چنانچہ میں نے فتویٰ دیا تھا کہ)

''سماعت قرآن سے غرض یہ ہے کہ جہاں بھولے گا بتلائے گا پس یہ تعلیم ہوئی اور تعلیم پر اجرت لینے کے جواز پر فتویٰ ہے''۔[1]

لیکن پھر سمجھ میں آیا کہ یہ قیاس صحیح نہیں اس لئے کہ (بحالت صلوٰۃ) تعلیم سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور سامع کے بتلانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، اور نیز بھولے ہوئے کو بتلانا نماز کی اصلاح ہے اور اصلاحِ نماز عبادت ہے اس لئے نہ قاری کو (یعنی امام صاحب کو اجرت لینا) جائز ہے نہ سامع کو، یہ دونوں فتوے قواعد کلیہ سے دیئے گئے ہیں، اگر اس کے خلاف کسی کو جزئیہ معلوم ہو تو میں اس سے بھی رجوع کرلوں گا۔[2]

صوم یوم عاشورہ کے مسئلہ میں رجوع

بندہ اب تک یہ فتویٰ دیتا تھا کہ دسویں محرم کا ایک روزہ رکھنا بلا کراہت درست ہے، مگر درمختار وغیرہ میں اس کے خلاف جزئیہ نکلا لہٰذا میں اس سے رجوع کر کے اب اس جزئیہ کے موافق فتویٰ دیتا ہوں کہ:

''دسویں تاریخ محرم کو اکیلا روزہ رکھنا مکروہ ہے، اس کے ساتھ نویں کا بھی روزہ رکھنے سے کراہت دور ہو گی، اسی طرح اگر دسویں کے ساتھ گیارہویں کا بھی رکھ لے تب

---

[1] امدادالفتاویٰ ص۴۹۶ ج۱ [2] التہذیب ملحقہ حقوق وفرائض ص۲۱۵/۴

بھی کراہت نہ رہے گی، مگر اول صورت اولیٰ ہے، یعنی نویں دسویں کا'' [1]

شب برات میں خصوصیت سے ایصال ثواب سے متعلق رجوع

(شب برات کے موقع پر ایصال ثواب کے تعلق سے حضرت تھانویؒ نے تحریر فرمایا تھا کہ اس موقع پر)

''اگر کچھ صدقہ خیرات یا کھانا وغیرہ بھی پکا کر بخش دیا جائے کوئی مضائقہ نہیں'' (اس کے بعد یہ رجوع تحریر فرمایا)

تنبیہ: مضمون بالا میں بعض علماء نے کلام فرمایا ہے اور محاکمہ کے بعد احقر نے اس سے رجوع کرلیا ہے پس اس پر وقت کی تخصیص کے ساتھ عمل نہ کیا جائے [2]

احقر کے دعوے کا دوسرا جزیہ تھا کہ (قبرستان جاکر مردوں کے لئے) دعاء کرنا تو حدیث سے ثابت ہے اور اس دعاء پر ایصال ثواب کے دوسرے طریقوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے، اپنے (اس دوسرے) دعوے سے رجوع کرتا ہوں [3]

تمثال نعل شریف جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق رجوع

تمثال نعل شریف جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت اقدس تھانویؒ نے ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا ''**نیل الشفا بنعل المصطفی**'' اس کی وجہ سے بعض لوگ غلو کا شکار ہونے لگے، بعض اہل علم نے اس کی طرف توجہ دلائی، اس سلسلہ کی پوری مکاتبت امداد الفتاویٰ میں موجود ہے جس میں اخیر میں یہ تحریر موجود ہے:

''میں اعلان کرتا ہوں کہ دوسرے حضرات کی تحقیق پر عمل کیا جائے اور میری تحریر کو مرجوع بلکہ مجروح وممنوع عنہ بلکہ مرجوع عنہ سمجھا جاوے''

۔۔۔**بحکم دع مایریبک الیٰ مالا یریبک الحدیث** اپنے رسالہ ''**نیل الشفا بنعل المصطفی**'' سے رجوع کرتا ہوں اور کوئی درجہ تسبب

---

[1] امداد الفتاویٰ ۲/۱۲۰ [2] زوال السنۃ عن اعمال السنۃ ص ۱۷ [3] امداد الفتاویٰ ۴/ ۲۸

للضرر کا اگر واقع ہو گیا ہو تو اس سے استغفار کرتا ہوں۔

(نوٹ) اگر ممکن ہو کم از کم اس مضمون کو مکملاً یا ملخصاً جلد ہی شائع فرمادیں، پھر خواہ مستقلاً وہو اولیٰ، یا اخبار میں۔(اشرف علی)[1]

مزارعت کے ایک مسئلہ میں رجوع اور مستفتی کو اطلاع کا اہتمام

السلام علیکم

النور اور بدائع کو دیکھا آپ کی دونوں نقلیں صحیح ہیں، واقعی مجھ سے جواب میں غلطی ہوئی، کیونکہ النور ہی میں اس سے متصل اوپر کی سطروں میں مزارعت کی جائز صورتوں کو ضبط کیا گیا ہے، اور یہ صورت ان کے علاوہ ہے، تو اس میں جواز کا شبہ ہی نہیں ہوسکتا، اتنا قریب ذہول ہو جانا عجیب ہے، واللہ اعلم، ذہن کو کیوں خلط ہوا، بہر حال اس سے رجوع کرتا ہوں، اور انشاء اللہ تعالیٰ مستفتی مسئلہ مذکورہ کو بھی اطلاع کر دی جائے گی، اور ترجیح الراجح کے سلسلہ میں شائع بھی کر دیا جائے گا، احتیاطاً اس مقام کے متعلق درمختار وردالمحتار سے بھی بقدر ضرورت نقل کرتا ہوں تا کہ اس صورت کا حکم بھی معلوم ہو جائے اور جس قید کے ساتھ اس صورت میں جواز منقول ہے وہ بھی معلوم ہو جائے۔[2]

قبروں کے درمیان اور سامنے جنازہ کی نماز پڑھنے سے متعلق رجوع

حکیم الامت حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

میں نے ایک زمانہ میں اس کے جواز کا فتویٰ دیا تھا (کہ قبروں کے درمیان جنازہ کی نماز پڑھنا جائز ہے) چنانچہ تتمہ جلد اول فتاویٰ امدادیہ ص ۴۹ پر وہ فتویٰ درج ہے اور اس جواز کی تقویت میں اس سے استدلال کیا گیا تھا کہ قبر خود نعش سے زیادہ نہیں اور نعش کے سامنے جائز ہے تو قبر کے سامنے بدرجہ اولیٰ جائز ہے اھ۔

---

[1] امداد الفتاویٰ ۴/ ۳۷۸،۳۷۶ [2] امداد لفتاویٰ ص ۵۲۲ ج ۳

لیکن ایک عزیز نے شرح جامع صغیر میں یہ حدیث دکھلائی:

نهى ان يصلى على الجنائز بين القبور (طس عن انس) اوراس کی وجہ یہ بیان کی ہے: **فانها صلوٰة شرعية والصلوٰة فى المقبره مكروه تنزيها،**

اور یہ بھی کہا ہے **اسناده حسن**، یہ اس باب میں صریح روایت ہے، اور درایت محضہ پر روایت مقدم ہے لہٰذا اس فتوے سابقہ سے رجوع کرتا ہوں، گونماز ادا ہو جائے گی، مگر کراہت کا حکم کیا جائے گا جیسا کہ عزیزی کا قول اوپر نقل کیا گیا ہے اور غور کرنے سے اس درایت کا جواب بھی ذہن میں آ گیا وہ یہ کہ فقہاء نے نمازی کے سامنے شمع وسراج کے ہونے کو جائز فرمایا ہے اور انگارے کے سامنے ہونے کو مکروہ فرمایا ہے اور وجہ فرق یہ بیان کی ہے: **لانه لم يعبدهما احدو المجوس يعبدون الجمر لاالنار الموقدة** [1]

پس یہی فرق قبر اور نعش میں ہوسکتا ہے کہ قبر کی پرستش معتاد ہے، نعش کی معتاد نہیں، پس درایت کا شبہ بھی ساقط ہو گیا اور کراہت کا حکم محفوظ رہا، واللہ اعلم ۔[2]

رفع سبّابہ کے سلسلہ میں بہشتی زیور کے ایک مسئلہ سے رجوع

حالت تشہد میں کلمہ شہادت کے وقت اشارہ کرنے کے بعد حلقہ کی ہیئت کو اخیر تک باقی رکھے یا ختم کر دے؟ ایک صاحب کے سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

بہشتی زیور کے مسئلہ سے رجوع کرتا ہوں، اور اس کو اس طرح بدلتا ہوں ''تشہد میں لا الہ کے وقت انگلی اٹھاوے اور الا اللہ پر جھکا دے، مگر عقد اور حلقہ کی ہیئت کو اخیر نماز تک باقی رکھے، جزاکم اللہ علیٰ ہٰذا التنبیہ ۔[3]

فائدہ: بہشتی زیور میں اسی کے مطابق اصلاح کی جا چکی ہے۔

---

[1] درمختار وردالمحتار ۱/ ۶۱۰ [2] امداد الفتاویٰ ص ۳۳۷ سوال ۶۷۳ [3] امداد الفتاویٰ ص ۲۰۷ ج ۱ سوال نمبر ۱۹۶

حدیث لولاک الخ کے متعلق رجوع اور مزید تحقیق

سوال (۸۱) حضور نے فتاویٰ امدادیہ جلد۴ ص۹، ۱۰ حدیث لولاک الحدیث کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ:

ظاہراً موضوع معلوم ہوتی ہے، لیکن میں نے موضوعات کبیر لملاعلی قاری صفحہ ۵۹ مطبوعہ مجتبائی دہلی میں دیکھا کہ علامہ موصوف رقم طراز ہیں:

لکن معناه صحيح فقدروى الديلمي عن ابن عباسؓ مرفوعاً اتاني جبرئيل فقال يا محمد لولاک ماخلقت الجنة ولولاک ماخلقت النار وفي رواية ابن عساكر لولاک ماخلقت الدنيا،

اور بعض شروح نخبۃ الفکر میں دیکھا گیا کہ حدیث مذکور کی تصحیح کی گئی ہے۔

الجواب: اس کے قبل بھی یہ روایات نظر سے گذریں جس کو کشکول میں درج کردیا تھا، اب ترجیح الراجح میں لکھ دیا۔[1]

سوال: اب کی ترجیح الرجح صفحہ ۵۲ پر جوالنور نمبر ۲ و ۳ کا صفحہ ۸ ہے، کسی صاحب نے حدیث لولاک لما الخ کی کسی حد تک توثیق کرنا چاہی ہے، اس کے متعلق عرض ہے کہ شوکانی نے اپنی کتاب ''الفوائد المجموعة في بيان الاحاديث الموضوعة'' میں اسے موضوعات میں شمار کیا ہے، اور صفحہ ۱۱۶ (مطبوعہ محمدی پریس لاہور) پر اسے درج کرکے لکھا ہے وقال الصنعانی موضوع اور بعینہٖ یہی عبارت طاہر الفتنی کی ''تذکرۃ الموضوعات'' (مطبوعہ مصر) کے صفحہ ۸۶ پر درج ہے۔

جواب: اول تو بعض حضرات ان احکام میں متشدد ہوتے ہیں، دوسرے اگر نفی حدیث کو روایت باللفظ پر اور مشیئت حدیث کو روایت بالمعنی پر محمول کیا جائے تو کوئی تعارض باقی نہیں رہتا، پھر یہ احکام میں سے نہیں فضائل میں سے ہے جن میں توسع ہے۔[2]

[1] امداد الفتاویٰ ص ۹۷ ج ۵ [2] حکیم الامت نقوش وتاثرات ص ۲۶۹

قربانی سے متعلق دو مسئلوں میں رجوع

ایک نفلی قربانی متعدد لوگوں کی طرف سے کی جاسکتی ہے

سوال (۶۴۵) اگر فوت شدہ عزیزوں یا اہل بیت یا خاص رسول اللہ ﷺ کی طرف سے قربانی کی جائے تو اس کا کیا طریقہ ہے، آیا مثل دیگر شرکاء ہر ایک شخص کی طرف سے ایک ایک حصہ ہونا چاہئے یا ایک حصہ ہی میں چند کو شریک کردے؟

الجواب: ایک ہی میں سب کو ثواب بخش سکتے ہیں۔

میں نے گذشتہ سال زبانی فتویٰ دیا تھا کہ جس طرح اپنی طرف سے قربانی کرنے میں ایک حصہ دو شخص کی طرف سے جائز نہیں، اسی طرح غیر کی طرف سے تبرّعاً نفل قربانی کرنے میں خواہ زندہ کی طرف سے یا میت کی طرف سے ایک حصہ دو شخص کی طرف سے جائز نہیں، مگر روایات سے اس کے خلاف ثابت ہوا اس لئے میں اس سے رجوع کرکے اب فتویٰ دیتا ہوں کہ جو قربانی دوسرے کی طرف سے تبرعاً کی جائے، تبرّع کی قید سے وہ صورت نکل گئی کہ میت نے اپنے مال سے قربانی کرنے کی وصیت کی ہو اس صورت میں ایک حصہ ایک ہی کی طرف سے جائز ہے (اور تبرّعاً یعنی بغیر وصیت کے از خود اپنی طرف سے زندہ یا میت کو ثواب پہچانے کے لئے جو قربانی کی جاتی ہے) چونکہ وہ ملک ذابح (قربانی کرنے والے کی ملک) ہوتی ہے اور صرف اس سے دوسرے کو ثواب پہنچتا ہے اس لئے ایک حصہ کئی کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ مسلم میں ہے کہ اپنی طرف سے ایک حصہ قربانی کرکے متعدد کو ثواب پہچانا جائز ہے بس یہ بھی ویسا ہی ہے ۔
والروایات هذه .... الخ ۔

قال فی البدائع لأن الموت لایمنع التقرب عن المیت بدلیل انه‘

یجوز ان یتصدق عنه ویحج عنه،وقد صح ان رسول الله صلی الله علیه وسلم ضحی بکبشین احدهما عن نفسهٖ والاٰخر عمن لم یذبح من امتهٖ وان کان منهم من قدمات قبل ان یذبح(ردالمختار ص۳۱۸)

قلت: وقد دل الحدیث علیٰ جواز التضحیه عن الحی تبرعا وعلی جواز التضحیة الواحدة عن الکثیرین۔[1]

دوسرے کی طرف سے نفل قربانی اس کی اجازت کے بغیر بھی کی جاسکتی ہے

اوراسی وقوع الذبح عن الذابح وحصول الثواب للغیر (یعنی ذبح تو قربانی کرنے والے کی طرف سے ہوگا صرف ثواب غیر کو ملے گا اس مسئلہ) کی فرع یہ ہے کہ اس تضحیة نافلة عن الحی تبرعاً (یعنی کسی زندہ کی طرف سے نفل قربانی کرنے) میں اس زندہ کی اجازت کی ضرورت نہیں، میں اس میں بھی ضرورت بتلاتا تھا، اس سے بھی رجوع کرتا ہوں بخلاف زکوٰۃ وصدقات واجبہ وتضحیۃ واجبہ (یعنی واجب قربانی) کے کہ اس میں اذن غیر کا شرط ہے۔[2]

تفسیر سے متعلق بعض معروضات اور اصلاحات

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ حضرت تھانویؒ کی خدمت میں تحریر فرماتے ہیں: تفسیر بیان القرآن سے متعلق آج معروضات ذیل پیش کرتے ہیں۔

سوال: جلداول صفحہ۹۳س۱ ''مَنْ شَهِدَ مِنكُمْ'' کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

جواب: ترجمہ وتفسیر میں بنادیا ''شخص'' کے بعد ''تم میں سے'' لکھ دیا۔

---

[1] [2] امدادالفتاویٰ ص۵۷۴ ج۳ سوال نمبر ۶۴۵

سوال: ج۳ص۷۹ حَنِیۡفًا کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

جواب: تفسیر میں یہ غلطی ہوئی کہ اس کے ترجمہ کو بین القوسین کردیا، ناقل نے بین القوسین دیکھ کر ترجمہ سے خارج کردیا، اس کی یہ عبارت ہے ''میں سب طریقوں سے یکسو ہو کر اپنا رخ'' یہ حَنِیۡفًا کا ترجمہ ہے، دونوں طرف کے قوسین کاٹ دینا چاہئے بس ترجمہ متن میں رہ جائے گا۔

سوال: ج۳ص۸۰ بَلۡ بَدَا لَهُمۡ مَّا كَانُوۡا يُخۡفُوۡنَ مِنۡ قَبۡلُ، اس پر آپ ہی کے قلم کا عربی حاشیہ ہے **عبر بالاخفاء اشارة الیٰ أن قلوبهم كانت تصدق الخ** میرے دل کو تو یہی مضمون بہت لگا، لیکن ترجمہ اور تقریر ترجمہ کو پڑھ کر کسی کا ذہن اس طرف نہ جائے گا، میری فہم ناقص میں یہ حاشیہ والا مضمون متن میں آنا چاہئے تھا۔

جواب: اس کا طریقہ ذہن میں نہیں آیا، آپ پوری عبارت بنا کر بتلا دیجئے تا کہ غور کر سکوں۔ (ص۴۳۷)

سوال: ص۹۹س احَكِيۡمٌ عَلِيۡم کا ترجمہ ''بڑا علم والا بڑا حکمت والا'' درج ہے، یہ قلبِ ترتیب قصداً فرمایا گیا ہے یا محض سہو کتابت ہے؟

جواب: سہو ہے، اور سہو بھی میرا۔ (ص۴۶۸)

ایک سوال کے جواب تحریر فرماتے ہیں:

جواب: یہ دو سوال تاریخ سے متعلق ہیں، اگر فتح مصر مقدم ہے تو تفسیر موجودہ صحیح ہے اور اگر موخر ہے تو آپ کی تفسیر صحیح ہے میں نے قرائن سے تقدم فتح مصر کو راجح سمجھا، باقی احتیاطاً میں نے آپ کی تحقیق کو شائع کرنے کے لئے دے دیا، جو اس کو راجح سمجھے گا اختیار کرلے گا۔[1]

---

[1] حکیم الامت نقوش وتاثرات ص۴۹۸، ۵۸۶

نسب نامہ ہائے فاروقیاں سے متعلق رجوع

نسب نامہ فاروقیہ سے متعلق ایک صاحب کے مفصل سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

جواب :مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ آپ کے خط سے بڑی گنجلک رفع ہوئی، جزاکم اللہ تعالیٰ علیٰ ہٰذہ الافادۃ۔

اعلان:اس کے قبل جو کچھ اس تحقیق کے خلاف میری تحریر ہو اس سے رجوع کرتا ہوں جیسا کہ ایک بار مختصراً اس کے قبل بھی ضمیمہ تتمہ سادسہ میں بابت نصف آخر ۱۳۳۶ھ میں ایک اور دلیل کی بنا پر اسی طرح رجوع کر چکا ہوں، اب مکرر اس رجوع کو مؤکد کرتا ہوں۔[1]

بعض اغلاط کی تصحیح وتنبیہ پر شکریہ اور دعائیہ کلمات

سوال (۵۸۹) حضرت مولانا محمد صدیق صاحب مدظلہٗ نے فرمایا تھا کہ جب تو حضرت کی خدمت میں خط لکھے تو میرا بھی سلام لکھ دیجئے، اور یہ کہ میرا ارادہ کئی مرتبہ ہوا کہ اس قصہ کے متعلق لکھواؤں جو مرزا بیدل اور ایرانی کا ہے، کہ ایک ایرانی فاضل، مرزا کے مضامینِ تصوف دیکھ کر ان سے مستفید ہونے آیا تھا، اور ان کو ڈاڑھی تراشتے یا منڈواتے دیکھ کر کہا تھا کہ ’’آغا ریش می تراشی‘‘ الخ اس قصہ کو حضرت کی زبانی کسی وعظ میں قتیل کی طرف منسوب کرتے سنا تھا، حالانکہ مرزا بیدل کا قصہ ہے، قتیل تو ہندو بچہ تھا، مسلمان ہو کر رافضی ہو گیا تھا، اس کو تصوف سے کچھ تعلق نہ تھا، اھ یہ مضمون ان کے ارشاد کے موافق لکھ دیا۔

---

[1] امداد الفتاویٰ ج۴ ص۵۳۹

جواب: میرا سلام اور تصحیح قصہ کا شکریہ عرض کیجئے[1]

سوال (۵۹۳) رسالہ امواج طلب باباغ طرب کی تمہید ص۵س۲ میں ہے " اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول" الخ اس کے متعلق عرض ہے فی البخاری ص۴۵۰ **وقال عمر اذاقال مترس فقدامنه ان الله يعلم الالسنة كلها** اھ پس یہ اثر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ہے، اطلاعاً عرض ہے۔

الجواب: جزاكم الله دللتموني على الصواب[2]

سوال (۵۹۲) میں آج الامداد متعلقہ محرم ۱۳۳۶ھ سے متمتع تھا، صفحہ ۱۹ پر حضرت قطب عالم قدس سرہ العزیز کا قصہ متعلق بیعت کی نظر سے گذرا، مجھے اس کے متعلق اب تک یہ تحقیق تھی کہ حضرت قطب عالم قدس سرہ العزیز کی ولادت حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی قدس سرہ العزیز کی وصال سے تیس سال کے بعد ہوئی، سنا بھی تھا، اور عرصہ ہوا انوار العیون مصنفہ حضرت قطب عالم قدس سرہ میں دیکھا تھا، جناب کی تحقیق احق الی الحق، ہے، اگر جناب کو یہ امر کہ حضرت ممدوح نے ایک زمانہ پایا ہے متحقق ہے تو مجھے بھی مطلع فرمایا جاوے۔

جواب: جو قصہ اس پرچہ میں نقل کیا گیا ہے واقع میں تحقیق سے صحیح ثابت نہیں ہوا، میں نے مدت ہوئی یاد نہیں کسی کی زبان سے سنا تھا، غالباً راوی کی غلطی ہے یا میرے ذہن کو خلط ہوا ہے، میں نے اس سے رجوع کر کے اپنی اغلاط کی فہرست میں لکھ دیا ہے جو وقتاً فوقتاً بصورت ایک رسالہ مسمیٰ بہ "ترجیح الراجح" کے حصص کے شائع ہوتا رہتا ہے، **جزاكم الله تعالىٰ علىٰ اصلاحكم**[3]

ایک سوال کے جواب تحریر فرماتے ہیں: آج آپ کی تنبیہ سے (جزاکم اللہ تعالیٰ) کتاب دیکھی وہ بنا میری غلط ثابت ہوئی اب یہ توجیہ مدار جواز نہ رہی، ۔۔۔۔۔[4]

[1] امدادالفتاویٰ ج۴ص ۵۲۹ [2] امدادالفتاویٰ ج۴ص ۵۳۱ [3] امدادالفتاویٰ ۴/۵۳۱ [4] ایضاً ۳/۱۵۱

سونے چاندی کے بٹن کے سلسلہ میں احتیاطی رجوع

تردد کی صورت میں دوسرے علماء سے تحقیق کا مشورہ

سوال : (۱۳۶) آپ کی کتاب صفائی معاملات مطبوعہ رزاقی کانپور صفحہ۴ میں بیان بعضے متفرق حلال وحرام چیزوں کے بیان میں یہ مسئلہ ہے کہ:

''چاندی سونے کے بوتام یعنی بٹن اور گھنڈی لگانا جائز ہے''۔

اس مسئلہ میں آپ سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ واقعی سونے چاندی کے بوتام لگانا جائز ہے یا اس کتاب میں کاتب سے غلطی ہوئی ہے؟ آپ اس کا خلاصہ تحریر فرمائیں! اگر جائز ہے، اس کی تشریح ہوتو بہت بہتر ہوتا کہ اطمینان ہو۔

الجواب: کاتب کی تو غلطی نہیں ہے، میں نے ہی لکھا ہے اور اس میں کسی قدر قیاس سے بھی کام لیا ہے، اصل مسئلہ جو درمختار وغیرہ میں ہے اس کے الفاظ یہ ہیں ولا بأس بازرار الذهب الخ ازرار جمع زر کی ہے، اور زر کا ترجمہ ہے گھنڈی، اور علت لکھی ہے لأنه تابع للباس، پس اس علت کے اشتراک سے زر کے مفہوم میں توسع کر کے بوتام کو شامل سمجھا گیا ہے، اتنا تصرف اس میں قیاس کا ہے، پس یہ حقیقت ہے اس فتوی کی، مگر چند روز سے خود مجھ کو اس میں تردد ہو گیا، وجہ تردد یہ ہے کہ ایک بڑے محقق کا قول اس باب میں یہ سنا ہے کہ زر سے مراد گھنڈی ہے جو کلابتوں کے تاروں سے بنی ہوئی ہو، اور کپڑے میں سلی ہوئی ہو، بوتام مراد نہیں، اور پوری تابع ایسی ہی گھنڈی ہے، پس بہتر یہ ہوگا کہ اور علماء سے تحقیق مزید کر لیجئے۔

(ایضاً) مدت ہوئی حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا قول کہ اس ازرار سے مراد کلابتون کی گھنڈی ہے، بٹن اس میں داخل نہیں، ان کے

صاحبزادے قاری عبدالسلام مرحوم سے سن کر صفائی معاملات کے اس مسئلہ میں مجھ کو تردد ہو گیا ہے، اور اِس وقت احتیاط کے درجہ میں اس سے رجوع کرتا ہوں۔[1]

جدید مسئلہ کو حل کرنے کے بعد بھی اعتماد نہ ہونے کی صورت میں دوسرے علماء محققین کے حوالہ کرنا

سوال (۱۸۱) رسائل ماہواری جو ارسال ہوا کرتے ہیں وہ اگر ڈاک میں ضائع ہو جاویں تو مشتری بائع سے دوبارہ طلب کر سکتا ہے یا نہیں؟ شرعی حکم اس باب میں کیا ہے۔

جواب: پورا شرح صدر تو ہے نہیں لیکن قواعد سے رجحان اس طرف ہے کہ دوبارہ طلب کر سکتا ہے **لان الظاهر ان عملة البوسطة وكلاء للبائع لاللمشترى ،فليراجع الى العلماء الأخرين**۔[3]

سرکار کی ناجائز ملازمت کے متعلق سوال کا جواب تحریر فرمانے کے بعد اخیر میں تحریر فرماتے ہیں:

میں نے یہ مسئلہ، کسی نقل جزئی سے نہیں لکھا ہے، جس پر مجھ کو اعتماد نہیں، اس لئے مناسب بلکہ واجب ہے کہ دوسرے علماء محققین سے بھی اطمینان کر لیا جائے اور پھر بھی عمل کرتے وقت حضرت امام مالکؒ کے ارشاد نفعل و نستغفر کو معمول رکھیں۔[4]

ہوائی جہاز میں مسافت قصر کے متعلق سوال کا جواب تحریر فرمانے کے بعد اخیر میں تحریر فرمائے ہیں:

احتیاطاً اس میں دوسرے علماء سے بھی رجوع کر لیا جائے۔[4]

---

[1] امدادالفتاویٰ ج۴ص۱۲۹، ۱۳۲ [2] ایضاً ۳/ ۱۳۸ [3] امدادالفتاویٰ ص۴۰۹ج۳سوال ۴۱۰
[4] امدادالفتاویٰ ج اص۵۹۲سوال نمبر ۵۱۹

خاص حالات میں خاص نوع کے سوالات کو علماء محققین کی جماعت اوران کے مشورہ کے حوالہ کرنا

سوال:(۳۲۴) کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ایک فرقۂ ضالہ اپنی اذانوں میں اوراپنے جنازوں کے ساتھ اشہد ان علیاً ولی اللہ وصی رسول اللہ خلیفۃ بلافصل بآواز بلند پکارتا ہے تو کیا اس سے حضرات خلفائے ثلٰثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت حقہ کی تکذیب نہیں ہوتی ؟اور کیا فرقہ شاتمہ کی زبان سے اہل سنت والجماعت کے روبرو اس کلمہ کا اظہار ایک قسم کا تبرہ نہیں۔

۲۔کیا جس مقام پر علی الاعلان برسرراہ یہ کلمہ کہا جاتا ہو اور حکومتِ وقت نے اس کو جائز قرار دیا ہو وہاں کے اہل سنت والجماعت پر یہ لازم نہیں ہے کہ حضرات خلفائے کرام کی خلافت حقہ اور فضیلت بہ لحاظ ترتیب کو علی الاعلان وبرسرراہ واضح کریں؟ اور ان حضرات کے محامد وفضائل بیان کریں تا کہ جماعت اہل سنت کا کوئی ناواقف شخص فرقۂ ضالہ کی تبلیغ سے متاثر ہوکر عقیدۂ فاسدہ میں مبتلا نہ ہو؟ بینوا وتوجروا۔

جواب:ازحقر اشرف علی،السلام علیکم

اس سوال کی عبارت سے جہاں تک میں سمجھا ہوں غایت اس طریق خاص کی تجویز کرنے کی یہ قرار دی ہے کہ جماعت اہل سنت کا کوئی ناواقف شخص فرقہ ضالہ کی تبلیغ سے متاثر ہوکر عقیدہ فاسدہ میں مبتلا نہ ہو۔

تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ اول تو فرقہ شاتمہ کے اس طرز کو کوئی جاہل سے جاہل بھی تبلیغ نہیں سمجھتا کیونکہ تبلیغ کا متفق علیہ طرز دوسرا ہے، دوسرے اگر کوئی اس کو تبلیغ ہی سمجھے تو اس کے مفسدہ کے انسداد کا طریق اس میں منحصر نہیں، دوسرا طریق اس سے زیادہ مؤثر اور سہل بھی ہے وہ یہ کہ اطلاع عام کے بعد مساجد اور مجالس میں وقار اور متانت

کے ساتھ وعظ کہا جائے اور اس میں احقاق حق وابطال باطل کیا جائے جیسا اب تک بزرگوں کا طریق رہا ہے یا رسائل دینیہ کی صورت میں حدود شرعیہ کے اندر کہ تہذیب اس کے لوازم سے ہے اصلاحی مضامین شائع کئے جاویں یہ طریق نافع بھی زیادہ ہے اور بے خطر بھی ہے، اور قانون نقلی وعقلی ہے کہ جس مقصود کے دو طریق ہوں ایک صعب دوسرا ایسر تو ایسر کو اختیار کرنا چاہئے چنانچہ حدیث میں اس کا سنت ہونا مصرح بھی ہے **ماخیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی آمرین الا اختار ایسر ھما** او کماقال، پس اس قانون کی بناء پر اس طریق کو طریق مسئولہ عنہ پر ترجیح ہوگی۔

اور یہ سب کلام اس وقت ہے جب اس طریق کے اختیار کرنے کی صرف وہ غایت ہو جو سوال میں ذکر کی گئی ہے اور اگر کوئی انفراداً دوسری غایت ہو یا اشتراکاً دوسری غایت بھی ہو جو سوال میں مذکور نہیں مثلاً مقاومت ومصاومت آئینی یا غیر آئینی جیسا اس وقت بکثرت معتاد ہے۔

تو پھر یہ سوال اپنے اطراف وجوانب کے اعتبار سے متعدد تنقیحات کا محتاج ہے جس کے لئے ایک رائے خصوصی مجھ جیسے قلیل العلم کی کافی نہیں بلکہ علمائے محققین کی ایک معتد بہ جماعت کو جمع کر کے مشورہ کیا جائے واللہ اعلم۔[1]

اپنے فتوے پر دوسرے محقق سے تنقید کرانے کی رائے

ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

مجھ کو تتبع روایات کی فرصت نہیں، اس لئے درایت سے جو سمجھا ہوں اس کو نقل کرتا ہوں، بہتر یہ ہے کہ کسی محقق سے تنقید کرالی جائے، اگر کسی دلیل سے اس کا خطا ہونا معلوم ہو مجھ کو بھی اطلاع کر دی جائے۔[2]

---

[1] امداد الفتاویٰ ج۶ ص۳۳۴ [2] امداد الفتاویٰ ج۱ ص۱۶۳ سوال ۱۶۲

فصل (۱۰)

چند مفید نمونے

(۱) فرمایا: ایک شخص کا خط آیا ہے اس میں لکھا ہے کہ ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے اب اس نے بیس (۲۰) دن کے بعد اپنی سالی سے نکاح کرلیا ہے، یہ نکاح درست ہے یا نہیں، اور شامی میں جو مردوں کے واسطے بیس عدتیں لکھی ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟

میں نے لکھا ہے کہ نکاح تو ہوگیا اور شامی میں جو لکھا ہے خود دیکھ لو مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو[۱]

(۲) فرمایا: لوگوں کے دماغ خراب ہوگئے ہیں، ایک صاحب نے کچھ مسائل دریافت کئے ہیں لکھا ہے کہ ان کا جواب حدیث سے تحریر فرمایا جائے میں نے لکھ دیا ہے کہ فقہ میں تو اس کا جواب یاد ہے اور حدیث سے اس کا جواب یاد نہیں اس لیے معذور ہوں[۲]

(۳) ایک شخص نے اصحاب کہف کے نام خط میں پوچھے ہیں، میں نے لکھ دیا ہے کہ اصحاب کہف کے اعمال پوچھو، تم بھی اصحاب کہف کی طرح ہوجاؤ[۳]

(۴) ایک شخص نے خط میں سوال کیا کہ بیس رکعت تراویح کا کیا ثبوت ہے؛ اس کا جواب تحریر فرمایا کہ کیا مجتہدین پر اعتبار نہیں؟ یہ جواب لکھنے کے بعد فرمایا کہ اگر اس شخص نے یہ جواب لکھا کہ مجتہدین پر اعتبار نہیں؟

[۱] مزید المجید ص۶۲۔ [۲] مزید المجید ص۶۷۔ [۳] الکلام الحسن ص۶۳۔

تو یہ جواب لکھوں گا کہ پھر مجھ پر کیسے اعتبار کرلیا جب کہ امام ابوحنیفہ جیسے حضرات پر اعتماد نہیں کیا۔[1]

(۵) فرمایا: ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ میں نے عورت کو لفظ طلاق نہیں کہا بلکہ تلاک کہا فرمایا کہ نکاح کے وقت بھی تو نکاح نہ کہا تھا نکاہ کہا تھا اگر اس سے نکاح نہ ہوا تھا تو عورت نکاح نہ ہونے کے سبب جدا ہونا چاہئے۔[2]

(۶) کسی عورت نے مجھ سے اپنے نکاح کے متعلق مشورہ کیا...... میں نے جواب دیا کہ میرے دو کام ہیں ایک مسائل واحکام بتلانا جو مجھے یاد ہیں دوسرا کام یہ کہ دعا کر دیتا ہوں اور میں تیسرے کام کا نہیں ہوں خصوصاً مشورہ کی عادت کئی وجوہ سے نہیں ہے۔[3]

(۷) فرمایا: میرے پاس ایک خط آیا ہے کہ ایک لڑکا ہے اس سے ایک شخص کو پاک محبت ہے اس کے حال سے تعشق ہے اور صرف ایک دفعہ وہ تقبیل کی تمکین چاہتا ہے، لڑکا کہتا ہے کہ کسی معتبر عالم سے فتویٰ منگا دو مجھے عذر نہیں اور بلا اس کے ناممکن ہے، وہ شخص قسم کھاتا ہے کہ پاک محبت ہے تقبیل کے سوا اور کچھ ارادہ ہرگز نہیں اور بصورت عدم تمکین تقبیل کے اس کے مرجانے کا اندیشہ ہے تو آپ اگر فتویٰ دیدیں تو اس کی جان بچ جائے۔

میں نے جواب لکھا یہ محبت ہرگز پاک نہیں اور ایسے ناپاکوں کا مرجانا ہی بہتر ہے اور شاباش ہے اس لڑکے کو، امارد سے تعلق بہت ہی خبیث النفس کو ہوتا ہے۔[4]

(۸) ایک حجام میرے پاس آیا اور شیوخ ورؤساء کے مجمع میں تان کر بڑے زور سے سلام کیا پھر اس نے وہیں مجھ سے پوچھا کہ جو کوئی سلام علیکم کہنے سے بُرا مانے وہ کیسا ہے؟ یہ تعریض تھی شیخ زادوں پر اور مقصود تھا ان کو فتویٰ سنانا، میں سمجھ گیا، میں نے کہا سلام سے برا ماننے والا برا، اور متکبرانہ لہجہ میں سلام کرنے والا بھی بُرا، لہجہ تو بہرحال

[1] الکلام الحسن ص ۲۷۔ [2] الکلام الحسن ص ۱۰۱۔ [3] الکلام الحسن ص ۲۳۔ [4] حسن العزیز ۸۸/۴۔

نیازمندی کا ہونا چاہئے اپنی حیثیت سے بڑھنا نہیں چاہئے۔[1]

(۹) ایک وکیل صاحب کا خط آیا ہے کہ وکالت جائز ہے یا نہیں؟ میں نے جواب لکھا ہے کہ کیا آپ کے پاس کوئی اور ذریعۂ معاش ہے؟ دیکھئے کیا جواب آتا ہے جیسا وہاں سے جواب آئے گا ویسا ہی جواب جائے گا۔[2]

(۱۰) بعض علماء مسائل کے جواب میں عوام کے مذاق کی رعایت کرنے لگے مجھ کو تو اس طرز سے بے حد افسوس ہے یہ اہل علم کی شان کے بالکل خلاف ہے مسائل کے جواب کے وقت یہ شان ہونی چاہئے جیسے حاکم کے اجلاس پر ہونے کے وقت شان ہوتی ہے۔[3]

(۱۱) فرمایا کہ ظاہری علماء کو کوئی مشکل نہیں کہ ظاہری دلائل پر فتویٰ دے دیں اور کہہ دیں کہ ہمیں حال کی خبر نہیں، مشکل جامع بین الحقیقت والطریقت کو ہے جس کی یہ حالت ہے کہ ہر پہلو پر رعایت کرنا اس پر ضروری ہے۔[4]

(۱۲) ایک شخص نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ جن رسوم کو منع کرتے ہیں اور لوگ کیوں منع نہیں کرتے میں نے ان سے کہا کہ یہ سوال جیسے ہم سے کرتے ہیں اوروں سے کیوں نہیں کرتے کہ آپ جن رسوم کو منع نہیں کرتے فلاں کیوں منع کرتا ہے اگر یہ تحقیق ضروری ہے اور آپ کو تردد ہے تو جیسے ہم پر سوال ہوتا ہے ان پر بھی تو ہوتا ہے یہ عجیب اندھیر کی بات ہے۔[5]

(۱۳) ایک صاحب کا خط آیا ہے کہ جناب آپ خط کے ذریعہ لوگوں کو مرید کرتے ہیں اس کی کیا دلیل ہے اور یہ سنت سے ثابت ہے یا نہیں؟

میں نے جواب میں لکھا ہے کہ یہ میرا فعل ہے آپ میرے فعل کی دلیل کیوں دریافت کرتے ہیں، آپ کو کیا حق ہے آپ بلا دلیل کسی کو مرید نہ کریں۔[6]

---

[1] حسن العزیز ۴/۳۳۱۔ [2] الافاضات ۲/۳۸۳۔ [3] الافاضات ۲/۳۲۲۔ [4] الافاضات ۲/۳۲۲۔ [5] الافاضات ۲/۴/۲۷۔ [6] مزید المجید ص ۲۷۔

(۱۴) فرمایا کہ بعض لوگ مجھ سے سوال کیا کرتے ہیں کہ کوّا حلال ہے یا حرام؟ میں ان سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا اس کے کھانے کا ارادہ ہے وہ کہتے ہیں کہ صاحب: بھلا اس کو کب (کیوں) کھانے لگیں، میں کہتا ہوں جب ارادہ کھانے کا نہیں تو پھر کیوں پوچھتے ہو؟ کیونکہ یہ فروعی مسئلہ میں سے ہے، اصول وعقائد میں سے نہیں کہ قیامت میں پوچھ ہو کہ کیا اعتقاد رکھا تھا۔

غرض میری یہ تھی کہ عوام الناس کو علماء پر جرأت نہ ہو اور فضول میں مشغول نہ ہوں[۱]

(۱۵) فرمایا کہ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ جس جگہ چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں روزہ کس طرح رکھا جائے۔

اس کے جواب میں فرمایا: اس جگہ حیوانات کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہے جب کوئی وہاں زندہ بچے گا اور وہ سوال کرے گا اس وقت قواعد شرعیہ سے جواب کا الہام بھی ہو جائے گا اور بتلا دیا جائے گا[۲]

(۱۶) ایک مولوی صاحب نے لکھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا انتقال پہلے ہوا ہے یا حضرت حوّا کا، اور دونوں کے انتقال میں کس قدر زمانہ بیچ میں گذرا ہے؟

جواب: میں نے کہیں نہیں دیکھا[۳]

(۱۷) فرمایا: ایک خط آیا ہے پوچھتے ہیں کہ تصویر کا رکھنا گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟ میں نے جواب لکھا کہ کپڑوں کے بکس میں کبھی آگ رکھتے ہوئے بھی یہ تحقیق کی ہے کہ چھوٹی چنگاری ہے یا بڑا انگارہ[۴]

(۱۸) ایک صاحب نے کوئی مسئلہ پیش کر کے عرض کیا کہ فلاں صاحب نے دریافت کیا ہے ان کے حالات کے لحاظ سے فرمایا کہ خود آپ کو جو ضرورت ہو اس کو

---

[۱] دعوات عبدیت ۱۸/۱۴۔ [۲] دعوات عبدیت ۴۵/۱۴۔ [۳] دعوات عبدیت ۸۸/۱۹۔
[۴] ملفوظات حکیم الامت ۲۵/۱۔

معلوم کیجئے، دوسروں کے معاملات میں نہیں پڑنا چاہئے، بڑی ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنی فکر میں لگے آج کل یہ مرض عام ہوگیا ہے عوام میں بھی اور خواص میں بھی کہ دوسروں کی اصلاح کی تو فکر ہے اپنی خبر نہیں [1]

(۱۹) ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت! کشمیر کے متعلق اکثر لوگوں کو مالی وجانی مدد کرنے میں اشکال ہے شرعی حکم کیا ہے؟

اس سائل کا قصد خود عمل کا نہ تھا ویسے ہی مشغلہ کے طور پر پوچھا تھا اس لیے فرمایا کہ جس شخص کا امداد کرنے کا ارادہ ہو اس کو خود سوال کرنا چاہئے اگر آپ ہی کا ارادہ ہے تو ظاہر کیجئے کون سی امداد کرنا چاہتے ہیں تا کہ اس کا حکم ظاہر کروں۔

عرض کیا کہ بعض لوگ دریافت کرتے ہیں، فرمایا: سوال اسی شخص کو کرنا چاہئے جس کا کچھ کرنے کا ارادہ ہو دوسروں کو جواب دینے کی آپ کو کیا فکر؟ کہہ دیجئے ہم کو نہیں معلوم۔

دوسرے: جواب تو جب ہی ہوسکتا ہے جب سوال کی صورت متعین ہو وہاں کے واقعات کی تنقیح جب تک نہ کی جائے جواب کس بات کا ہو، اس کے متعلق یہاں پر بہت سے سوالات آتے ہیں میں لکھ دیتا ہوں کہ زبانی سمجھنے کی بات ہے، زبانی آکر سمجھ لو یہ عبارت سمجھ میں نہیں آئی، یہ اسی واسطے کہ سائل سے واقعات کی تنقیح کر لی جائے۔

(۲۰) فرمایا: ایک خط آیا ہے کہ ایک شخص ضد کر رہا ہے کہ مجھ کو بقرعید کے دن قربانی میں ذبح کر ڈالو، ورنہ میں کنویں میں کود کے مرجاؤں گا تو اس میں کیا مسئلہ ہے؟ میں نے لکھ دیا ہے کہ اگر ایسا کیا تو دونوں جہنم میں جاؤ گے اور اگر وہ کنوئیں میں کود گیا تو وہ خود جہنمی ہوگا۔

(۲۱) فرمایا: ایک خط آیا ہے لکھا ہے کہ ارواح انبیاء واولیاء در دنیا می آیند یا نہ؟ ...... میں نے لکھ دیا ہے کہ بدیں مسائل چہ حاجت در دیں ......اور اگر تصحیح عقائد کا شبہ ہو تو اللہ اعلم کا عقیدہ کافی ہے ایسے امور غیر مقصودہ میں [2]

[1] ملفوظات ۱/۱۱۔ [2] کلمۃ الحق ص ۱۸۰

(۲۲) مالیگاؤں سے ایک استفتاء آیا ہے اور اس سے قبل بھی آیا تھا لکھا ہے کہ ایک صاحب امام ہیں وہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن پر وقف نہیں کرتے بلکہ اس کے نون کو اھْدِنَا کی ھ سے ملا کر پڑھتے ہیں، اسی طرح قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پر بھی وقف نہیں کرتے اَحَدٌ کے نون تنوین کو اللہ الصَّمَد کے لام سے ملا کر پڑھتے ہیں نوبت یہاں تک پہنچی کہ فوجداری ہوگئی ہے، میں نے لکھا ہے اس طرح پڑھنا جائز تو ہے مگر جب کہ سب سمجھ دار ہوں ورنہ ایسے امام کو معزول کردو جو فتنہ برپا کرے اور موقع محل نہ سمجھے، یہ کم حوصلہ لوگوں کی باتیں ہیں اپنی علمی لیاقت جتلانے کے لیے نئے نئے کام کرتے ہیں۔[1]

(۲۳) میں ایک جگہ گیا تو ایک شخص نے گیارہویں کے متعلق سوال کیا میں نے جواب دیا کہ استفادہ مقصود ہے یا امتحان؟ اگر استفادہ کی ضرورت ہے تو اس کے لئے اعتماد شرط ہے کیونکہ جس پر اعتماد نہیں ممکن ہے کہ وہ مسئلہ غلط بتلا دے، اور اعتماد کے لئے واقفیت شرط ہے اور آپ میری اصلی حالت سے ناواقف ہیں، پس جن حضرات سے آپ کی واقفیت ہے ان سے دریافت کیجئے۔

اور اگر امتحان مقصود ہے تو میرا امتحان میرے اساتذہ لے چکے ہیں، آپ کو اس کا کوئی حق نہیں (یہ جواب حضرت والا نے اس واسطے دیا کہ قرائن سے اس سائل کی نیت معلوم کرلی تھی کہ محض امتحان مقصود ہے ورنہ یہ مطلب نہیں کہ ناواقف کو بالکل مسئلہ نہ بتلایا جائے) ایسے ہی واقعات کی بناپر میں سخت مزاجی میں بدنام ہوں، مگر میں کیا کروں جبکہ ایسے لوگوں کو تحقیق ہی مقصود نہیں ہوتی بلکہ محض یہ معلوم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اس کا مسلک کیا ہے اور جب جواب ملنے سے مسلک کا علم ہوگیا تو پھر مجیب سے کہتے ہیں کہ فلاں عالم تو اس کے خلاف کہتے ہیں، پھر اس مجیب نے اتفاقاً اس کو برا بھلا کہہ دیا، اس کو وہاں پہنچاتے ہیں اب دونوں میں لڑائی پیدا ہوگئی یہ نتیجہ ہے ان کی تحقیق کا۔[2]

---

[1] الکلام الحسن ص ۱۲ [2] وعظ شفاء العی ملحقہ تدبیر وتوکل ص ۲۲۳

(۲۴) فرمایا: شاہ عبدالعزیزؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ ہندوستان میں جمعہ کی نماز پڑھنا کیسا ہے، فرمایا: جیسے جمعرات کی نماز پڑھنا، اسی طرح کسی نے شاہ صاحب سے سوال کیا کہ فاحشہ عورت کی نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟

فرمایا: اس کے آشناؤں (یعنی زانیوں) کا کیسا سمجھتے ہو؟ حضرت شاہ صاحبؒ کو سائل کے فہم کے مطابق جواب دینے میں اللہ نے کمال عطا فرمایا تھا۔[۱]

(۲۵) ایک شخص نے بذریعۂ خط دریافت کیا کہ سحری کا وقت کب تک رہتا ہے فرمایا: جواب لکھا ہے کہ سحری و افطار کا وقت ہر روز کا جدا جدا ہے جس دن کا دریافت کرنا ہو اس دن کا غروب لکھو پھر میں جواب لکھوں گا۔[۲]

(۲۶) میں عید کا مصافحہ ابتداءً تو نہیں کرتا لیکن دوسرے کی درخواست پر کر بھی لیتا ہوں (یعنی اگر دوسرا کرتا ہے تو کر لیتا ہوں) مگر مولانا گنگوہی نہیں کرتے تھے کیونکہ بدعت ہے اور میں مغلوب ہو جاتا ہوں۔[۳]

(۲۷) فرمایا: ایک موضع میں ایک میاں جی نے مجھ سے ترک جمعہ کے فتوے کے بارے میں یہ کہا کہ تم یوں کہہ دو کہ اگر جمعہ ترک کرنے پر عذاب ہو تو ہمارے ذمہ ہے پھر ہم جمعہ چھوڑ دیں گے۔

میں نے کہا کہ تم یوں کہہ دو اگر پڑھنے پر عذاب ہوا تو میرے ذمہ پھر ہم اجازت دے دیں گے پھر میں نے کہا بھلے مانس! جب کسی مولوی نے فتوی دیدیا تو وہ تو خود ذمہ دار ہو گیا زبان سے ذمہ دار بنے یا نہ بنے۔[۴]

(۲۸) ایک صاحب نے خط لکھا ہے کہ آپ کلکتہ کے فساد سے تو واقف ہوں گے بناءً علیہ اس کے متعلق یہ چند مسائل ہیں ان کے جواب سے مطلع فرمائیں، اور اخیر میں تحریر فرمایا ہے کہ اپنا قول تحریر کیجئے گا کسی دوسرے بزرگ کا حوالہ نہ دیجئے گا۔

میں نے جواب لکھا ہے کہ اس تمہید کے بغیر کیا مسئلہ کا جواب نہ ہو سکتا تھا؟ اسی پر

---

[۱] کلمۃ الحق ص ۵۰۔ [۲] کلمۃ الحق ص ۸۴۔ [۳] کلمۃ الحق ص ۱۲۳۔ [۴] کلمۃ الحق ص ۱۲۸۔

بناء کرنے کی کیا ضرورت ہوئی؟ اور دوسرے بزرگوں سے کیوں نہ نقل کروں اگر وہ بزرگ مجھ سے زیادہ جانتے ہوں تو کیوں نہ ان کا حوالہ دوں اس کی کیا وجہ ہے؟[1]

(۲۹) فرمایا: امریکہ میں ایک شخص نے اشتہار دیا ہے کہ میرے دو دل ہیں، اکثر لوگوں نے اس کا انکار کیا اور تمام عالم میں اس کا شور مچ گیا لوگوں نے سوالات تیار کر کے بھیجے میرے پاس بھی اس کے متعلق سوال آیا تھا، میں نے اس کے دو جواب لکھے ایک تو ظاہر نظر میں نہایت وقیع تھا اور دوسرا واقعی وقیع تھا، شبہ کا منشاء یہ تھا کہ قرآن مجید میں ہے: "مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ".

تو یہ دعویٰ اس آیت کے خلاف ہوا...... پہلا جواب یہ تھا کہ کلام اللہ میں ماضی کے لفظ سے ارشاد فرمایا ہے اور مراد یہ ہے کہ وحی کے نازل ہونے کے زمانہ تک ایسا نہیں ہوا تھا اس سے مستقبل کی نفی لازم نہیں آتی۔

دوسرا جواب جو واقعی جواب ہے یہ ہے کہ کلام اللہ میں بطور مثال کے فرمایا ہے زید بن حارثہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّٰی کی زوجہ کے قصہ میں مقصود یہ ہے کہ نبوت اور عدم نبوت دونوں وصف جمع نہیں ہو سکتے جیسے ایک شخص کے دو دل نہیں ہو سکتے اور تمام مثالوں میں اکثریت کا اعتبار ہوتا ہے اس میں کلیت ضروری نہیں، یہ جواب میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اور بلا ضرورت واقعہ کی تکذیب اور انکار کرنا میرے نزدیک مشکل ہے۔[2]

(۳۰) دیوبند میں ایک مرتبہ گورنر صاحب کے استقبال کے لیے ظاہری آرائش اور حشمت بہت ہوئی تھی اس کے چند روز بعد ایک جلسہ میں علماء دیوبند کو مدعو کیا گیا میں کسی عذر کی وجہ سے نہیں جا سکتا تھا، علماء دیوبند خصوصاً مولانا محمود حسن صاحب خرافات کو دیکھ کر واپس تشریف لے گئے، داعی صاحب نے بطور شکایت کے ایک سوال تیار کیا کہ غیر مذہب آدمی کے لیے جو اہتمام کیا گیا اگر وہی ہم نے علماء

[1] کلمۃ الحق ص ۱۲۸۔ [2] دعوات عبدیت ۱۲/۱۳۴۔

دیوبند کے لیے کرلیا تو اس کو ناجائز کہا گیا اس کی کیا وجہ ہے؟

میں نے جواب میں لکھا ہے کہ اکرام ضیف ضروری ہے لیکن ہر مہمان کا اکرام اس کے مذاق کے موافق ہوتا ہے نہ کہ داعی کے مذاق کے موافق، دیوبند میں جو کچھ کیا گیا اس میں گورنر صاحب کے مذاق کی رعایت تھی اور آپ کے جلسہ میں جو کچھ ہوا وہ آپ کے مہمان (علماء) کے مذاق کے بالکل خلاف تھا اس لیے یہ جائز نہ تھا لیکن یہ جواب میں نے اس لیے دیا کہ معترض کی نیت درست نہ تھی باقی فی نفسہ اتنا تکلف کہیں بھی مناسب نہ تھا۔[1]

(۳۱) ایک شخص نے کارڈ میں ایک طویل مسئلہ پوچھا ہے اور دفع دخل کے لیے لکھتے ہیں کہ یہ تکلیف کی بات تو ہے مگر رنجیدہ نہ ہونا۔

میں نے لکھ دیا ہے کہ ایسے جواب کے واسطے لفافہ آنا چاہئے اور یہ نصیحت کی بات ہے رنجیدہ نہ ہونا۔[2]

(۳۲) فرمایا: ایک ہیڈ ماسٹر صاحب کا خط آیا ہے درود شریف اور قراءۃ خلف الامام پر کچھ شبہ ظاہر کیا ہے مگر اس شخص کو لیاقت کچھ نہیں، سمجھے گا کیا، میں نے لکھ دیا ہے کہ پہلے مبادی سیکھ لو تب جواب لکھوں گا ورنہ نہیں۔

اسی طرح ایک اور انجینئر صاحب تھے وہ ان مبادی کے سیکھنے کے بارے میں فرمانے لگے کہ کیا اب ہم پھر سے بچوں کے ساتھ الف با پڑھیں۔

میں نے کہا کہ اگر نہ پڑھو تو مقلد بنو، محقق بننے کا ارادہ نہ کرو۔[3]

(۳۳) ایک صاحب نے عجیب بیہودہ سوال کیا ہے...... لکھتے ہیں کہ میرے لیے میری اصلاح بہتر ہے یا میرے اہل وعیال کی میں نے جواب لکھ دیا ہے کہ کلیات لکھ کر سوال کرنا اصول کے خلاف ہے جزئیات ظاہر کر کے اپنی پوری حالت لکھو، اور پھر رائے معلوم کرو۔[4]

---

[1] دعوات عبدیت ۱۳۵/۱۴ [2] کلمۃ الحق ص ۱۸۳۔ [3] کلمۃ الحق ص ۱۳۲ [4] الافاضات ۳۵۳/۲

(۳۴) ایک صاحب نے لکھا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے؟ میں نے جواب میں لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ لوگ علماء سے ربط نہیں رکھتے، اگر ایسا کریں تو بہت سے شبہات حل ہو جائیں۔[۲]

(۳۵) مجھ سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ سود کیوں حرام ہے......؟ میں نے کہا اس واسطے کہ حق تعالیٰ نے اس کو حرام کیا ہے، کہا کہ حق تعالیٰ نے کیوں حرام کیا؟ میں نے کہا کہ میں اس وقت مشورہ میں شریک نہ تھا جو وجہ پوچھ لیتا، اور اگر شریک ہوتا تب بھی یہی کہتا جو آپ لوگ حکام دنیا کے مشوروں میں رات دن کہا کرتے ہیں کہ جو ہجور کی رائے ہو، یا شاید یہ بھی کہہ دیتا کہ مسلمانوں پر ایک وقت افلاس کا آنے والا ہے لہٰذا اس کو حرام نہ کیجئے مگر مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔

اب وہ صاحب کہنے لگے کہ حکم خداوندی تو حکمت سے خالی ہوگا نہیں وہ حکمت معلوم ہونا چاہئے، میں نے کہا حکمت ضرور ہے مگر میں بیان سے معذور ہوں کیونکہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔

کہنے لگے بیان تو کیجئے میری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، میں نے کہا میرے پاس ایسا فالتو دماغ نہیں ہے، ہاں اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی سمجھ دار طالب علم کو میرے پاس لے آؤ جو کم از کم ہدایہ پڑھتا ہو وہ مجھ سے یہی سوال کرے تو میں اس کو حکمت بتا دوں گا، آپ بھی سن لیں، اس صورت میں میرا بیکار وقت تو ضائع نہ ہوگا کیونکہ صحیح مخاطب سامنے ہوگا، اس وقت آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ آپ ان حکمتوں کے سمجھنے کے قابل نہیں، افسوس آج کل تو پوچھنے والوں کی یہ حالت ہے کہ اس غرض سے مسئلہ پوچھتے ہیں کہ ہمارے خیال کے موافق اس مسئلہ کو کر دیا جائے اور جو لوگ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ اور ریفارمر سمجھتے ہیں وہ تو پوچھتے ہی نہیں بلکہ خود بے دھڑک تحریف کرتے ہیں گویا دین ان کے گھر کا قانون ہے جو چاہا بنا دیا۔[۳]

---

[۱] [۲] دعوات عبدیت ص۱۴۴ [۳] التبلیغ ۱/۱۳۲۔

(۳۶) ایک صاحب نے خط میں دریافت کیا ہے کہ آپ کے یہاں رویت ہلال کس دن ہوئی؟ جواب میں تحریر فرمایا کہ اگر میں لکھ دوں تو کیا آپ کے لیے حجت ہوگا کہ اس پر عمل کرسکیں اور جب یہ نہیں تو سوال جواب فضول ہے۔[۱]

(۳۷) آج کل یہ حالت ہے کہ لوگ ضروری باتیں تو دریافت کرتے نہیں وہ مسائل پوچھتے ہیں جن سے کبھی نہ واسطہ پڑے یا وہ مسائل پوچھتے ہیں جو پہلے سے معلوم ہیں تاکہ مولوی صاحب کا امتحان ہوسکے۔

چنانچہ رام پور میں ایک صاحب نے مجھ سے اختلافی مسائل پوچھے، جن میں میرا مسلک ان کو معلوم بھی تھا، میں سمجھ گیا کہ اس سوال سے میرا امتحان مقصود ہے، میں نے کہا کہ آپ امتحان کے لیے پوچھتے ہیں یا عمل کے لیے، اگر عمل کے لیے پوچھتے ہیں تو اس کے لیے مسئول سے اعتقاد ہونا شرط ہے اور آپ مجھے جانتے بھی نہیں تو میرے معتقد کیسے ہوگئے اور محض نام سننا کافی نہیں، نام تو نامعلوم کتنوں کا سنا ہوگا اور اگر امتحان کے لیے پوچھتے ہیں تو آپ کو میرے امتحان کا کیا حق ہے پس وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے، میں ایسا روگ نہیں پالتا کہ ہر شخص کے سوال کا اس کی مرضی کے مطابق جواب دیا کروں۔[۲]

(۳۸) مجھ سے ایک وکیل نے پوچھا کہ نمازیں پانچ کیوں مقرر ہوئیں؟ میں نے کہا کہ تمہاری ناک منہ پر کیوں ہے؟ پشت پر کیوں نہیں؟ اس نے جواب دیا کہ اگر پشت پر ہوتی تو بدصورت معلوم ہوتی، میں نے کہا کہ بالکل غلط ہے اگر سب کی ناک پشت ہی پر ہوا کرتی تو ہرگز بری نہ لگتی بس چپ رہ گیا۔[۳]

(۳۹) ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ وضو میں جو پاؤں دھونا فرض ہے اس کی دلیل کیا ہے؟ قرآن میں پیروں کے واسطے مسح کا حکم ہے، میں نے کہا قرآن میں کہاں ہے؟ کہنے لگے شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ سے معلوم

۱ مجالس حکیم الامت ص ۱۲۲۔ ۲ التبلیغ اسباب الفتنہ ۱۰/۱۲۷۔ ۳ فیوض الخالق ص ۲۸۔

ہوتا ہے پھر وہ مترجم قرآن میرے پاس لائے اور آیت فَاغْسِلُوا الخ دکھلائی۔

میں بہت پریشان ہوا کہ اس شکال کا جواب تو نحوی قاعدہ پر موقوف ہے جس کو یہ سمجھ ہی نہیں سکتے، آخر میں نے ان سے کہا کہ جس کلام کا یہ ترجمہ ہے یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ کلام اللہ ہے؟ بولے علماء کے کہنے سے میں نے کہا افسوس! یا تو علماء اتنے ایماندار ہیں کہ اگر وہ ایک عربی عبارت کو کلام اللہ کہہ دیں تو سچے اور یا تو اتنے بے ایمان کہ اگر وہ ایک فعل کو مضمر کہہ دیں تو وہ جھوٹے، اس پر وہ چپ ہو گئے۔[۲]

(۴۰) ایک شخص کا خط آیا تھا لکھا تھا کہ چھوٹی قومیں کیوں ذلیل ہیں؟ میں نے لکھا کہ دنیا میں یا آخرت میں؟ جواب آیا کہ شافی جواب نہ ملا اور کچھ اعتراض بھی لکھے تھے، میں نے لکھ دیا کہ جہاں سے شفاء ہو وہاں سے سوال کرلو، بیہودہ اپنا تابع بنانا چاہتے ہیں۔

(۴۱) میں مسائل کے جواب میں بھی سائل کی حیثیت کی موافق جواب دیتا ہوں، گو اس سوال کا جواب نہ ہو، چنانچہ ایک بار ایک صاحب نے مجھ سے مسئلہ پوچھا تھا کہ ایک شخص کا انتقال ہوا، ایک بھتیجا ایک بھتیجی چھوڑے، میراث کا کیا حکم ہے؟ میں نے جواب دیا کہ بھتیجا میراث پائے گا بھتیجی کو کچھ نہ ملے گا، اس پر اس نے سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ؟ وہ پٹواری تھے، میں نے کہا کہ بستہ پٹوار گیری کا تو طاق میں رکھو اور طالب علمی شروع کرو، تین برس کے بعد اس کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوگی کہ اس کی کیا وجہ، اب بتلایئے ایسے بدفہم اور بدعقل لوگوں کا بجز اس کے کیا علاج؟[۳]

(۴۲) فرمایا کہ ایک شخص کا خط آیا ہے لکھا ہے کہ ایک شخص نے اپنی سالی سے بدفعلی کی تو اس کی بیوی نکاح میں رہی یا نہیں؟ میں نے لکھا ہے کہ نکاح کو تو پوچھا اور یہ نہ پوچھا کہ اس نالائق حرکت پر جو گناہ ہوا اس سے نجات کی کیا صورت ہے، اگر وہ اس طرح سوال کرے کہ ایک شخص سے یہ حرکت ہوئی اس کے متعلق دو سوال ہیں کہ اس حرکت کا کیا تدارک ہے (یعنی توبہ اور معافی کی کیا صورت ہے) اور نکاح رہا یا نہیں؟

[۱] ملفوظات حکیم الامت ج ۵ ص ۱۶۵ ملفوظ نمبر ۱۸۹۔ [۲] ایضاً ج ۵ ص ۱۲۴ ملفوظ نمبر ۱۳۱

تو اس طرح کا سوال جواب کے قابل ہوتا، باقی اور جگہ سے تو یہی فتویٰ جاتا کہ نکاح نہیں ٹوٹا جس کا اثر یہ ہوتا کہ صاحب واقعہ بالکل بےفکر (اور دلیر) ہو جاتا۔[1]

(۴۳) ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت فلاں شخص نے حضرت کے پاس ایک سوال بھیجا تھا کہ ایک شخص ہے وہ تمام نیک کام کرتا ہے صرف رسالت کو تسلیم نہیں کرتا اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ حضرت نے جواب میں لکھا تھا کہ قرآن پاک میں ہے محمد رسول اللّٰہ تو یہ شخص خدا کو نعوذ باللہ جھوٹا سمجھتا ہے اس لئے کافر ہے اور (ایسے شخص کا) کوئی عمل اور نیکی مقبول نہیں۔[2]

(۴۴) کاندھلہ کے قریب ایک گاؤں ہے اس میں ایک سنّی عورت کا انتقال ہوا، بڑی مالدار عورت تھی، خاوند شیعی تھا تو اس عورت کے بھائی نے چاہا کہ سب ترکہ مجھ کو ملے، اس کے خاوند کو کچھ نہ ملے، تو اس کی یہ تدبیر سوچی کہ مجھ کو ایک استفتاء لکھ کر دیا اور حکم شرعی اس طرح پوچھا کہ سنی عورت کا شیعی مرد سے نکاح تو جائز نہیں، جب نکاح نہیں ہوا تو اس عورت کی میراث بھی اس مرد کو نہ ملے گی، میں نے کہا کہ کیا یہ مسئلہ آج معلوم ہوا ہے پہلے سے کہاں سو رہے تھے، جب بہن نے نکاح کیا تھا اس وقت نہ بولے اور ساری عمر بہن کے لئے حرام کو گوارا کرتے رہے، شرم نہیں آتی، دنیا کی غرض سے تو یہ بات نکالی اور دین کا کچھ خیال نہ کیا، یہ نفس ایسا استاد ہے، دوسری بات میں نے یہ کہی کہ اگر اسی واقعہ میں مرد مالدار ہوتا اور پہلے مر جاتا اور تم کو یہ امید ہوتی کہ پھر عورت کے مرنے پر میں مستحق ہوں گا تو ایمان سے کہو کیا اس وقت بھی اس نکاح کو ناجائز قرار دے کر عورت کو میراث سے محروم کرتے جس کا نتیجہ تمہارا حرمان ہوتا؟ بس یہ ہیں وہ باتیں جن کی وجہ سے لوگ مجھ سے ناراض ہیں، مگر ہوا کریں ناراض، مجھ کو ان کی ناراضی یا خوشی سے لینا ہی کیا ہے، اللہ تعالیٰ راضی ہیں پھر چاہے سارا عالم ناخوش اور ناراض

---

[1] ملفوظات حکیم الامت ص ۱۴۱ ج ۴ قسط ۲۔ [2] القول الجلیل ص ۵۱

رہے، بحمد اللہ اس کا مجھ پر کچھ اثر نہیں مجھ سے کتمانِ حق نہیں ہوتا نہ کسی کی للّو پتّو ہوتی ہے، میں تو ایک سیدھا سادھا مسلمان ہوں صاف اور سچی بات کہنا جانتا ہوں، اپنے بزرگوں کا یہی طرز دیکھا یہی پسند ہے۔[1]

(۴۵) سوال (۱۲۸) زید ذیل کی عربی عبارت کو ''صحیح حدیث'' کہتا ہے، برائے خدا مطلع فرماویں کہ یہ صحیح حدیث ہے یا مصنوعی؟

''واذا تحیر تم فی الامور فاستعینو اباھل القبور''۔

الجواب: جو اس کو حدیث کہتا ہے اسی سے سند پوچھو، اور اگر ہو بھی تو اس سے کیا ثابت ہوا؟ دوسرے اہل قبور سے مراد مطلق اہل قبور ہیں خواہ عوام وجہلاء ہی کیوں نہ ہوں، یا خاص اولیاء ومشائخ؟ اگر ثانی ہے تو کیا دلیل؟ اس شخص سے ان سب سوالوں کے جواب لو۔[2]

(۴۶) ایک شخص نے دریافت کیا کہ غیر مقلد امام کے پیچھے ہم حنفیوں کی نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟ جواباً تحریر فرمایا کہ وہ خلافیات میں مقتدیوں کے مذہب کی رعایت کرتا ہے یا نہیں اور تقلید کو جائز سمجھتا ہے یا نہیں؟ اور سلف کی شان میں گستاخی کرتا ہے یا نہیں؟ اور مقلدین کو مشرک یا بدعتی کہتا ہے یا نہیں؟۔[3]

(۴۷) ایک صاحب نے کہا کہ ایک شخص نے کہا کہ اب کوئی بزرگ نہیں رہا، فرمایا یہ دریافت کرنا چاہئے کہ بزرگی سے تمہاری کیا مراد ہے؟ اگر ریاضت ومجاہدہ مراد ہے تو بیشک اب ریاضت کرنے والے نہیں رہے اور اگر بزرگی سے مراد مقبولیت عنداللہ ہے تو اب بھی ہزاروں ہیں اور ریاضت ومجاہدہ خود مقصود تھوڑا ہی ہے، ریاضت ومجاہدہ سے تو بس یہ مقصود ہے کہ نفس کی سرکشی کم ہوجائے اور اطاعت میں آسانی سے لگ سکے سو خود نفوس میں بھی پہلی سی قوت سرکشی کی نہیں رہی نہ اب پہلے جیسے قویٰ رہے، اس لئے مجاہدہ کی کمی مضر بھی نہیں۔[4]

---

[1] ملفوظات حکیم الامت ۳۲۲/۲ [2] امداد الفتاویٰ ۱۲۹/۵ [3] کمالات اشرفیہ ۳۹۶م ۲۲۲ [4] القول الجلیل ص ۵۱

(۴۸) ایک صاحب نے استفتاء پیش کر کے عرض کیا کہ اگلے جمعہ کو اس کا جواب لے لیا جائے گا اس لئے کہ جلدی جواب ہو نہیں سکتا فرمایا کہ یہ صحیح ہے، مگر اگلے جمعہ تک یہ کاغذات امانت کس کے پاس رہے گا، کیونکہ کام کی کثرت کی وجہ سے مجھ پر اس کا بار ہوتا ہے، عرض کیا کہ حضرت کی سہولت کے لئے ایسا عرض کیا گیا، فرمایا: یہ بھی صحیح ہے مگر جس وقت لکھ کر تیار ہو جائے آخر کس کو دوں تا کہ امانت کا بار نہ رہے، عرض کیا کہ حافظ صاحب کو دیدیں فرمایا کہ آپ یہی بات ان سے کہلوا دیں کیا خبر ان کو قبول بھی ہے یا نہیں اگر آ کر وہ مجھے کہہ دیں میں ان کو دیدوں گا حافظ صاحب نے آ کر عرض کیا کہ حضرت جواب تحریر فرما کر مجھ کو دیدیا جائے، فرمایا: دیکھئے میں اس قدر احتیاط کرتا ہوں کہ براہ راست ان سے کہنا نہیں چاہا شاید میرے اثر سے عذر نہ کرتے، انتظام ایسا ہونا چاہئے کہ کسی کو تکلیف نہ ہو، اب حافظ صاحب نے ان کے کہنے سے بار اٹھایا اگر میں خود ان کے سپرد کرتا تو اس وقت میری طرف سے سمجھا جاتا، اس صورت میں ان کا جی چاہتا یا نہ چاہتا قبول کرتے مجھ کو اتنا بھی کسی پر بار ڈالنا گوارا نہیں، حاصل انتظام کا یہ ہے کہ نہ اپنی طرف سے کسی دوسرے پر بار ہو، نہ دوسرے کا اپنے اوپر بلا ضرورت بار ہو، اس قدر تو میں رعایتیں کرتا ہوں اور پھر بھی سخت مشہور کیا جاتا ہوں۔[۲]

(۴۹) مجھے ایک شخص نے خط لکھا کہ میں دوا کی دکان کروں یا بانوں کی؟ میں نے جواب میں لکھا کہ میرا باپ نہ عطار تھا نہ کھٹ بنا جو میں اس میں مشورہ دوں، ہم سے تو محبوب حقیقی کے راضی کرنے کا طریقہ دریافت کرو، بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ بزرگ صاحب تجربہ نہیں رکھتے مگر الہام سے بتلا دیں گے اور وہ بالکل صحیح ہوگا، سو یاد رکھنا چاہئے کہ اول تو الہام اختیاری نہیں اور پھر ہمیشہ نہیں ہوتا۔

پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ جو ان کے منہ سے نکلے گا اس کا پورا کرنا اللہ تعالیٰ کے

---

[۱] [۲] کمالات اشرفیہ: ص۳۹۰ ج:۲

ذمہ واجب ہی ہوگیا نعوذ باللہ منہ، خدا بچاوے شرک سے۔[1]

(۵۰) ایک جگہ تقریب میں پہونچا تو ایک شخص نے نواب صدیق حسن خاں صاحب کی ایک کتاب میں تقلید کے خلاف ایک مضمون دکھلایا اور پوچھا کہ آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ میں نے کہا کہ آپ کو نواب صاحب کے لکھے ہوئے مضمون میں کچھ تردد ہے یا نہیں؟ وہ آدمی ہوشیار تھا میری غرض سمجھ گیا اور خاموش ہوگیا۔[2]

(۵۱) مکہ میں مجھے ایک جاہل نے امر بالمعروف کیا کہ تم عمامہ کیوں نہیں باندھتے یہ سنت ہے؟ میں نے کہا تم لنگی کیوں نہیں باندھتے یہ بھی سنت ہے؟ سوچ کر کہنے لگے میں بوڑھا ہوں لنگی میرے جسم پر ٹھہرتی نہیں، میں نے کہا میں جوان ہوں، عمامہ سے گرمی لگتی ہے اس پر بہت جھلّائے، کہنے لگے خدا کرے تمہارے دماغ میں اور گرمی بڑھ جائے۔[3]

(۵۲) میں نے ایک مرتبہ شریعت کا مسئلہ عام مجمع میں ظاہر کردیا لیکن ان ظالموں نے بجائے قدر کرنے کے اعتراض شروع کردیا کہ ہم نے تو کبھی سنا ہی نہ تھا ، یہ خوب جاہلوں نے سیکھ لیا ہے کہ ہم نے کبھی نہیں سنا، ارے کیا سب مسئلے تمہارے سننے میں آنا ضروری ہیں؟ اگر سب مسئلے سن لیتے تو تم بھی عالم نہ ہوجاتے۔[4]

(۵۳) فرمایا کہ مجھ کو ڈاک کا بڑا اہتمام ہے کہ روز کے روز فارغ ہوجاؤں اس میں طرفین کو راحت ہوتی ہے، ادھر تو میں فارغ مجھے راحت، ادھر خط کا جواب پہنچ جائے اس کو راحت، انتظار کی تکلیف نہ ہو، دور دراز سے خطوط آتے ہیں، جن میں نئی نئی ضروریات ہوتی ہیں اس لئے روزانہ ڈاک نمٹا دیتا ہوں، اپنی طرف سے اس کا انتظام رکھتا ہوں کہ دوسرے کو تکلیف نہ ہو اور انتظار کی تکلیف تو مشہور ہی ہے۔[5]

---

[1] وعظ شفاء العی ص ۲۲۵ [2] مجالس حکیم الامت ص ۱۹۹ [3] الحدود والقیود ص ۳۵ [4] التبلیغ ص ۶۱ ج ۲۰
[5] کمالات اشرفیہ ص ۳۹۰

باب۴

بعض مسائل میں قاضی شرعی کی ضرورت اور اس کا حل[۱]

شریعت محمدیہ اور ملت اسلامیہ میں بعض معاملات ایسے ہیں جن میں قاضی شرعی یعنی حاکم مسلم کا فیصلہ ہی معاملہ کو فیصل کرسکتا ہے حاکم غیر مسلم کا فیصلہ ان معاملات میں کسی درجہ میں بھی مفید نہیں ہوسکتا بلکہ شرعاً حاکم غیر مسلم کا فیصلہ ان معاملات میں کالعدم اور غیر قابل اعتبار ہے نمونہ کے لئے میں چند مسائل کا ذکر کرتا ہوں جن میں مسلمانانِ ہند کو قاضی شرعی کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔

چند وہ مسائل جن میں قاضی کا ہونا ضروری ہے، مفتی کچھ نہیں کرسکتا

(۱) کسی لڑکی کا نکاح بلوغ سے پہلے اس کے ولی نے جو باپ دادا کے سوا ہو کر دیا اور بالغ ہونے پر لڑکی اس نکاح سے راضی نہیں تو اس نکاح کو قاضی شرعی چند شرائط کے ساتھ فسخ کرسکتا ہے، حاکم غیر مسلم اگر فسخ کرے گا تو وہ فسخ معتبر نہیں ہوگا۔[۲]

(۲) کسی بالغ عورت نے اپنا نکاح خاندانی مہر سے کم مقدار پر یا کسی غیر کفو سے بدون رضائے ولی کے کرلیا تو اصل مذہب میں خاندان والوں کو حق دیا گیا ہے کہ وہ قاضی کی عدالت میں دعویٰ کرکے پہلی صورت میں مہر پورا کرالیں اور دوسری صورت میں نکاح کو فسخ کرادیں (شامی معہ درمختار ص۴۸۶ ج۲ وص۵۳۱ ج۲)

یہ نکاح فسخ کرنا قاضی ہی کا کام ہے دوسرے کا نہیں۔

(۳) کسی شخص نے اپنے بیٹے کی بیوی سے زنا کیا یا بدنیتی سے ہاتھ لگایا تو یہ عورت اپنے شوہر کے لئے حلال نہیں رہی مگر نکاح اس وقت تک نہیں ٹوٹتا جب تک

---

[۱] ماخوذ از رسالہ ''القول الماضی فی نصب القاضی'' [۲] شامی معہ درمختار ص۴۸۶ ج۲، وہدایہ ص۲۹۷ ج۲

قاضی نکاح کو فسخ نہ کرے یا زوجین خود قطع تعلق نہ کر دیں اور آج کل بعض دفعہ شوہر قطع تعلق نہیں کرتا تو بدون قاضی شرعی کے ایسی عورتوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔

(شامی معہ درالمختار ص۴۶۳ ج۲)

(۴) شوہر نامرد ہو اور بیوی کو طلاق بھی نہ دیتا ہو تو اس نکاح کو ایک سال کی مہلت دینے کے بعد قاضی فسخ کر سکتا ہے۔ (عالمگیری ص ۱۵۷ ج۲)

بدون قاضی کے ایسی صورت میں عنین کی بیوی کو سخت مصیبت کا سامنا ہے

(۵) اسی طرح شوہر مجنون ہو جائے تو اس کے نکاح کو بھی قاضی ہی فسخ کر سکتا ہے۔ (عالمگیری ص ۱۵۷ ج۲)

(۶) کسی عورت کا خاوند لا پتہ ہو جائے تو اس کی بیوی کو ایک خاص مدت کے بعد جس کی تحقیق کتب مذہب میں ہے، قاضی شرعی مفقود کے نکاح سے خارج کر سکتا ہے۔

(عالمگیری ص ۱۷۶ ج۳)

(۷) اگر شوہر کسی وقت اپنی بیوی کو زنا سے متہم کرے یا اس کی اولاد کو غیر مرد کی بتلاوے تو عورت عدالتِ قاضی میں مرافعہ کر کے لعان کر سکتی اور اپنی ہتک حرمت کا بدلہ لے سکتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو شوہر کو اگر وہ جھوٹا ہوا اس تہمت کی سزا ملے گی یا نکاح فسخ کرا دیا جائے گا۔ (عالمگیری ص ۱۵۱ و ۱۵۲ ج۲)

(۸) اگر کسی نابالغ لڑکی کا کوئی ولی نہ ہو اور پرورش کے لئے جلدی نکاح کرنے کی ضرورت ہو تو ایسی لاوارث لڑکیوں کا ولی قاضی ہے۔

(عالمگیری ص ۱۱ ج۲)

بدون قاضی شرعی کے ان مسائل میں مسلمانوں کو بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے، ہم نے مدارس عربیہ میں ایسے سوالات کے جوابات میں علماء کو یہی لکھتے ہوئے دیکھا ہے کہ اگر قاضی شرعی مفقود کی موت کا حکم کر دے یا عنین کا نکاح فسخ کر دے تو عورت دوسرے

مرد سے نکاح کرسکتی ہے اور قاضی شرعی نہ ہوتو عورت کو بجز صبر کے کچھ چارہ نہیں۔

(۹) اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دے کر یہ دعویٰ کرے کہ میں نے ہوش وحواس کی حالت میں طلاق نہیں دی بلکہ میں مدہوش یا مغلوب الغضب تھا تو اس صورت میں عورت کو شوہر کے اس قول کی تصدیق جائز نہیں بلکہ اس مقدمہ کا مرافعہ قاضی کی عدالت میں لازم ہے اگر وہ اس طلاق کو طلاق تسلیم نہ کرے جس کے خاص شرائط ہیں تب تو عورت شوہر کے پاس رہ سکتی ہے ورنہ نہیں رہ سکتی۔

(شامی معہ الدر، باب طلاق المدہوش ج ۲)

(۱۰) کسی نے نکاح فاسد کرلیا تو اس نکاح کو قاضی ہی فسخ کرسکتا ہے یا شوہر بیوی کو خود چھوڑ دے۔ (عالمگیری ص ۴۰ ج ۲)

اگر وہ نہ چھوڑے تو بدون قاضی کے عورتوں کو اس حالت میں سخت مصیبت کا سامنا ہے۔

یہ چند مسائل صرف باب نکاح وطلاق کے بطور نمونہ کے عرض کئے گئے ہیں باقی ابواب نسب وقف ومیراث وغیرہ میں جو مسائل قاضی شرعی کے وجود پر موقوف ہیں وہ اس سے بھی زیادہ ہیں جن میں بدون قاضی کے مسلمانان ہند کو سخت تکلیف ہے اور اس تکلیف کو وہ بدون گورنمنٹ کی امداد کے حل نہیں کرسکتے، کیونکہ قاضی کے لئے مسلم ہونے کے ساتھ صاحب حکومت ہونا بھی ضروری ہے۔

(**تنبیہ**) جن مسائل میں قضاء قاضی شرط ہے ایسے مسائل میں حاکم کافر کا فیصلہ ہرگز کافی نہیں حاکم کافر کے فیصلے سے نہ نکاح ہوسکتا ہے نہ طلاق واقع ہوسکتی ہے نہ ثبوت نسب ہوسکتا ہے نہ مفقود کو میت کہا جاسکتا ہے۔

(القول الماضی فی نصب القاضی ص ۲۱،۲۲،۲۳)

قاضی شرعی کے لئے مسلمان اور صاحب حکومت ہونا شرط ہے

فریقین کی رضامندی سے حَکَم بھی قاضی کے قائم مقام ہوتا ہے

قاضی اور حَکَم کا فرق

اگر کسی جگہ کے مسلمان از خود کسی کو قاضی بنانا چاہیں تو وہ قاضی نہ ہوگا محض حَکَم اور ثالث ہوگا جس کا فیصلہ اسی وقت مفید ہوسکتا ہے جب کہ مدعی ومدعی علیہ دونوں اپنا معاملہ اس کے سپرد کردیں اور اگر ایک فریق سپرد کرنا چاہے دوسرا نہ چاہے تو اس صورت میں ثالث اور حکم کا فیصلہ کسی درجہ میں بھی معتبر نہیں۔

قال فی العالمگیریة :والقضاء فی الشرع قول ملزم یصدرعن ولایة عامة ولا تصح ولایة القاضی حتٰی یجتمع فی المولیٰ شرائط الشهادة کذافی الهدایة من الاسلام والتکلیف والحریة الخ (ص ١٦٠ ج ۴)

وفیها ایضا واذااجتمع اهل بلدة علی رجل وجعلوه قاضیایقضی فهما بینهم لایصیر قاضیا الخ۔ (ص ۱۶۴ ج ۴)

ان عبارات میں تصریح ہے کہ قاضی کے لئے مسلمان ہونا صاحب حکومت ہونا شرط ہے اور یہ کہ کسی جگہ کے مسلمان از خود کسی کو قاضی بنالیں تو وہ قاضی نہ ہوگا، اور ظاہر ہے کہ صاحب حکومت قاضی وہی ہوسکتا ہے جو سلطنت کی طرف سے مقرر کیا جائے، اس لئے گورنمنٹ کی امداد کے اس مسئلہ میں مسلمانانِ ہند سخت محتاج ہیں، کیونکہ بدون قاضی کے بعض مسائل میں ان کا دین برباد ہوتا ہے اور غیر مسلم حکّام کا فیصلہ ان مسائل میں جو قضاء قاضی کے محتاج ہیں محض لغو اور کالعدم ہے۔ (القول الماضی ص ۲۳)

(الغرض) قاضی کے لئے صاحب حکومت ہونا رکنِ قضا ہے کہ جس مقام پر وہ

قضا کرتا ہے وہاں پر اس کی ولایت وحکومت عام ہو (گوکسی خاص فرقہ ہی پر ہو) اور گو خاص خاص معاملات ہی میں ہو۔

قال فی ردالمختار **ثم القاضی تتقیدو لا یته بالزمان و المکان و الحوادث** اھ ص ۴۶۲ ج ۴) غیر صاحب حکومت قاضی نہ ہوگا۔[1]

مسلمانوں کے کرنے کا کام

مسلمانوں کو نہایت التجا کے ساتھ گورنمنٹ سے درخواست کرنا چاہئے کہ وہ ہندوستان میں منصبِ قضاء کو قائم کر کے اپنی مسلم رعایا کو ان مشکلات سے نجات دے اور جب تک منصبِ قضا کی تجویز مکمل نہ ہو اس وقت تک کے لئے کم از کم یہی قانون مقرر کر دیا جائے کہ جو مسائل قضاءِ قاضی کے محتاج ہیں ان کا فیصلہ غیر مسلم حکّام نہ کریں، بلکہ ایسے مقدمات مسلم حکام ہی کے سپرد ہوں اور مسلم حکام کو ہدایت کی جائے کہ ان مسائل میں علماء سے صورتِ مقدمہ بیان کر کے شرعی حکم حاصل کریں اور شرعی فتوے کے مطابق مقدمہ کا فیصلہ کر دیں اور اپنے فیصلہ کے ساتھ عالم کے فتوے کو بھی نتھی کر دیا کریں ، جیسا کہ میراث و تقسیمِ ترکہ کے مقدمات میں اب بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے اگر یہ صورت بھی ہو جائے تو مسلمانانِ ہند کی مشکلات بہت کچھ کم ہو جائیں گی، ہمیں قوی امید ہے کہ گورنمنٹ ہماری اس درخواست پر ضرور توجہ کرے گی اور اپنی مسلم رعایا کو شکر و امتنان کا موقع دے گی **واللہ المستعان فی کل باب وھو المیسر لکل صعاب**۔[2]

(فائدہ: یہ تحریر اس وقت کی ہے جب کہ ہندوستان میں غیر اسلامی یعنی برطانیہ کی حکومت تھی، اور اب تو جمہوری حکومت ہے، آئین کے مطابق جمہوری حکومت میں ہم کو اپنے حقوق کے مطالبات کا پورا حق ہے لہٰذا اس کی پرزور کوشش کرنی چاہئے۔)

---

[1] القول الماضی ص ۲۰ [2] القول الماضی ص ۲۴

غیر مسلم حکومت کا مقرر کردہ مسلمان قاضی بھی شرعی قاضی ہے

قال فی الدرویجوزتقلدالقضاء من السلطان العادل والجائرولو کان کافراً ذکرہ مسکین وغیرہ الااذاکان یمنعه عن القضاء بالحق فیحرم اھ. (ص ۴۶۸ ج ۴)

وفی العالمگیریة والا سلام لیس بشرط ای فی السلطان الذی یقلد کذا فی التاتر خانیة اھ (ص ۱۶۰ ج ۴)

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں اگر گورنمنٹ اپنی طرف سے کسی مسلمان کو قاضی بنادے اور جن مسائل میں قضاءِ قاضی کی ضرورت ہے ان میں اس کو فیصلہ کا اختیار دے دے تو وہ شرعی قاضی ہوجائے گا اور اس کے فیصلے فسخِ نکاح وایقاعِ طلاق وثبوتِ نسب وحکمِ موتِ مفقودوغیرہ میں نافذ ہوں گے بشرطیکہ اس کو موافق حکمِ شرع فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے، خلاف حکم شرع فیصلہ پر مجبور نہ کیا جائے۔[1]

کافر حکومت کے طرف سے مقرر کردہ قاضی کی صحت پر ایک اشکال اور اس کا جواب

(ایک بڑے عالم حضرت مولانا سجاد صاحب نے) ایک خط میں **تقلد قضاء من الکافر** پر اشکال لکھ کر بھیجا کہ یہ خلاف ہے نص قرآنی **لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْکَافِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلاً** کے۔

اس کا جواب یہاں سے لکھا گیا کہ: **تقلد قضا من الکافر** ولایت سلطانیہ کی بناء پر نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نصب قاضی کا فریضہ جو مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے وہ اس

[1] القول الماضی ص ۲۴

کو قوت تنفیذ ہاتھ میں نہ ہونے کے سبب ادا نہیں کر سکتے، مگر جب حکومتِ کافرہ نے کسی کو قاضی یا والی بنا دیا تو عدم قدرت کا مانع مرتفع ہو گیا، لہٰذا اس کی تعبیر یوں کی جائے گی کہ سلطان یا والی کافر نے جو کسی کو عہدۂ قضا وغیرہ سپرد کیا ہے دراصل وہ سپردگی اہل اسلام کی جانب سے ہے (جس پر عامہ مسلمین کا سکوت بھی دال ہو سکتا ہے۔ مولانا) اور حکومت کافرہ صرف پیام رساں ہے اور اس منظوری و پیام رسانی کی شرط رفع مانع یعنی قوت تنفیذ حاصل ہونے کے واسطے ہے۔

حاصل یہ ہے کہ حکومت کافرہ کی طرف سے جو تقرر قاضی کا ہوا ہو وہ تولیت قضا نہیں، بلکہ تولیت قضا کی شرط ہے پس اس تقریر سے اہل اسلام پر کفار کی ولایت کا شبہ بحمد اللہ بالکل رفع ہو گیا فتدبر و تشکر۔

نیز یہاں کے جواب میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اس کی نظیر **تقلد قضا من الباغی المتغلب** ہے اور اس میں شمس الائمہ نے یہی توجیہ کی ہے جو ابھی مذکور ہوئی، عبارت شمس ائمہ کی تتمہ رفاق کے حاشیہ میں مذکور ہے۔

(تحریر مولانا عبدالکریم صاحب حسبِ حکم حکیم الامت حضرت تھانویؒ،
تصویب حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، الحیلۃ الناجزۃ ص ۲۱)

تراضیٔ مسلمین سے قاضی کا تقرر درست نہیں

تراضیٔ مسلمین سے قاضی کا تقرر درست نہیں، چنانچہ شامی نے بزازیہ سے نقل کیا ہے: **لو اجتمع اهل بلدة على تولية واحد القضاء لم يصح** الخ اور علامہ شامی نے جو اس کے بعد فرمایا ہے **قلت وهذا حيث لا ضرورة والا فلهم تولية القاضي كما ياتي بعده** اس میں اول تو سخت اشکال یہ ہے کہ عبارت آئندہ جس کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں **يجعلونه واليا فيولي قاضيا** ہے اور براہ راست عامہ کی طرف سے تقرر قاضی کا اس میں کوئی ذکر ہی نہیں، پس مدعا ثابت نہ ہوا۔

دوسری یہ عرض ہے کہ جس ملک میں تراضیٔ مسلمین سے قاضی کو قوت وشوکت حاصل ہوجائے وہاں تو کچھ گنجائش بھی ہوسکتی ہے، مگر اس ملک میں تقرر عامہ سے کچھ کام نہیں چل سکتا بلکہ ایک اختلاف جدید کا وسیع باب کھل جائے گا اس لئے اس کو صحیح کہنا کسی طرح قرین قیاس نہیں۔

(تحریر مولانا عبدالکریم صاحب حسبِ حکم حکیم الامت حضرت تھانویؒ، تصویب حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، [1] الحیلۃ الناجزۃ ص ۲۲۷)

ایسا کیوں؟

نصب خلیفہ (یعنی امیر مقرر کرنا) واجب ہے، لیکن واجب کے لئے قدرت شرط ہے اور قدرت اس وقت مفقود ہے اس واسطے گو عالَم اس وقت خلیفہ سے خالی ہے لیکن بایں حالات خلیفہ کے نہ ہونے سے کوئی گناہ نہیں۔ [2]

(الغرض) امام کا مقرر کرنا دیگر دلائل سے واجب ہے اور تمام واجبات کا وجوب قدرت کے ساتھ مشروط ہے اور امام مقرر کرنے پر قدرت کی شرائط میں مسلمانوں کا اتفاق بھی ہے اور وہ موجودہ حالت میں (قدرت قہریہ نہ ہونے کی بناپر) کبریت احمر (گویا محال) ہے، لہٰذا نہ گناہ لازم آئے گا نہ جاہلیت کی موت لازم آئے گی۔ [3]

جس طرح امام خلیفہ کی اطاعت واجب ہے اسی طرح سلطان کی بھی یعنی جس کو تسلط وشوکت (اور غلبہ) حاصل ہوجائے اور مسلمان اس کے سایۂ حمایت میں امن وعافیت سے رہ سکیں، سوسلطان ہونے کے لئے وہ شرائط نہیں جو امامت وخلافت کے لئے ہیں البتہ اسلام شرط ہے، لقولہ تعالیٰ **وَاُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ**۔ [4]

اس کام میں ضرورت ہے اتفاق کی ـــــ اس کے لئے ارادت کافی نہیں

[1] الحیلۃ الناجزہ ص ۲۲۷ [2] الکلام الحسن ص: ۱۵ [3] امداد الفتاویٰ ۴/۳۶۹ سوال ۴۶۱ [4] فروع الایمان ص ۷۷

قہروقوت کی ضرورت ہے اور وہ قوت امیر المؤمنین ہے اور اس وقت مسلمانوں کا کوئی (ایسا) امیر یا سردار نہیں جو ان کی قوت کو ایک مرکز پر جمع رکھ سکے جو روح ہے اس کام کو کرنے کی، سب سے بڑا اور اہم مسئلہ یہ ہے۔(الافاضات الیومیہ ص۱۱۹)

مسئلہ مذکورہ سے متعلق اکابر علماء کا تھانہ بھون میں اجتماع

بعد ازاں حضرت مولانا سجاد صاحب غالباً جمادی الاولیٰ ۵۳ھ میں تھانہ بھون تشریف لائے، مولانا کفایت اللہ صاحب وغیرہ بھی ہمراہ تھے اس وقت بھی مولانا سجاد صاحبؒ نے ''نصب القاضی من العامہ'' کو صحیح قرار دینے کی بہت سعی فرمائی اور ''تقلد قضا من الکافر'' پر اشکال مذکور کا اہتمام سے اعادہ فرمایا۔

حضرت حکیم الامت مدظلہم نے احقر سے ارشاد فرمایا کہ غالباً یہاں سے کچھ جواب بھی تو لکھا گیا تھا، احقر نے تتمہ ''امداد الاحکام'' جلد دوم میں تلاش کر کے وہ جواب سنایا جس میں ہر دو مسئلہ یعنی ''نصب القاضی من العامہ'' کی عدم صحت اور ''تقلد قضا من الکافر'' کی صحت پر کافی تقریر ہے، اس کو سنتے ہی مولانا حسین احمد صاحبؒ نے فرمایا کہ اس باب میں اب کوئی اشکال نہیں رہا، مولانا کفایت اللہ صاحب نے اول تو اس فرمانے پر حیرت سے سوال کیا، پھر مختصر مکالمت کے بعد خود بھی تسلیم کر لیا۔ (الحیلۃ الناجزہ ص۲۱)

حکومت کے بغیر قاضی نہیں بن سکتا، حَکَم بن سکتا ہے

حَکَم کے فیصلہ کا شرعی درجہ

قال فی العالمگیریة واذا اجتمع اهل بلدة علی رجل وجعلوه قاضیا، یقضی فیما بینهم لایصیر قاضیا ولو اجتمعوا علی رجل وعقدوا معه عقدالسلطنة او الخلافة یصیر خلیفة وسلطانا اه(ص۱۶۴ج۴)

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں کسی جگہ کے مسلمان بطور خود بدون گورنمنٹ کی اجازت کے اگر کسی کو قاضی بنالیں تو وہ قاضی نہ ہوگا کیونکہ اس کی ولایت عامہ نہ ہوگی۔

البتہ حَکَم ہو جائے گا جس کا فیصلہ اسی وقت معتبر ہوگا جب کہ مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں رضا مندی سے اپنے معاملہ کو اس کے سپرد کردیں اور اگر ایک نے معاملہ سپرد کیا اور دوسرے نے سپرد نہ کیا تو اس صورت میں حَکَم کا فیصلہ کالعدم ہے۔

فریقین کی رضامندی سے حَکَم کے ذریعہ بھی فسخِ نکاح کرایا جاسکتا ہے

اور فریقین باہمی رضامندی سے اگر کسی کو حَکَم بنالیں اور وہ موافق حکمِ شرع فیصلہ کرتے تو اسے بھی فسخ نکاح وغیرہ کا اختیار ہوگا اور اس کے فسخ سے نکاح فسخ ہوجائے گا، یعنی جب معاملہ سپرد کردیا گیا اور فیصلہ تک تحکیم سے کسی فریق نے رجوع نہ کیا تو اب حکم کا فیصلہ بھی مثل قاضی کے فیصلہ کے لازم ونافذ ہوجائے گا پھر کوئی فریق اس کو توڑ نہیں سکتا بشرطیکہ فیصلہ موافق حکمِ شرع ہو۔

قال الشامی اماالمحکم فشرطه اهلیة القضاویقضی فیما سوی الحدود والقصاص اه (ص ۴۶۲ ج۴)

وفیه ایضًا التحکیم عرفاتولیة الخصمین حاکما یحکم بینهمابینة اواقرار أونکول، ورضیابحکمه (قوله الی ان حکم) احتراز عمالورجعاعن تحکیمه قبل الحکم اوعمالورضی احدهما فقط (ص ۲ ۱ شامی) صح ولو فی غیر حدوقودودیة علی عاقلة لان حکم المحکم بمنزلة الصلح وهذا لاتجوز بالصلح فلاتجوز بالتحکیم،

وينفرد احد هما بنقضه اى التحكيم قبل وقوعه، فان حكم لزمهم ولا يبطل حكمه بعزلهما لصدوره عن ولاية شرعية اه(ص۵۴۰ج۴)

قلت فلا يردعليه مافى رد المحتار (ص۴۷۷ج۴) وهذاحيث لاضرورة والافلهم اى للعامة تولية القاضى ايضا كمايأتى بعده وقال بعداسطرو أما بلادعليهاولاة كفارفيجوز للمسلمين اقامة الجمع والأعياد،ويصير القاضى قاضيًا بتراضى المسلمين اه.

فان معناه أنه يصير قاضيابتراضى المسلمين اذا حصلت له ولاية عامة فى محل قضائه لماعرفت أن الولاية احد اركان القضاء واهل العهد لوجعلوا قاضيا منهم بتراضيتهم لا يكون له ولاية على احداصلا كما هومشاهدمن حالهم فافهم (ظفر احمد)۔ (القول الماضی فی نصب القاضی ص۲۵)

اگر زوجین اپنے اپنے حکم کو طلاق یا خلع کا اختیار بھی دے دیں تو وکالۃً وہ اس کے مختار بھی ہوجاویں گے۔ (بیان القرآن ص۵ سورہ نساء)

مولانا عبدالماجد صاحبؒ حضرت تھانویؒ کی خدمت میں تحریر فرماتے ہیں:

سوال: عزیزوں میں ایک نوجوان کی شادی ابھی چندروز ہوئے ہوئی تھی، اب بیوی شوہر کے ناکارہ ہونے کی بناپر خلع کا مطالبہ کررہی ہے، شوہر کو اس دعویٰ سے قطعی انکار ہے، اب حل کی شرعی صورت کیا ہوگی؟

جواب: جداگانہ کاغذ پر مرقوم ہے، مگر یہ فیصلہ اس وقت نافذ ہوگا جب زوجین بہ تراضی کسی کو حَکَم بنالیں، یعنی شرعی فیصلہ کے نافذ کرنے کا اختیار دیدیں وہ حکم بجائے قاضی کے ہوجائے گا۔ (حکیم الامت نقوش وتاثرات ص۱۹۷)

(**تنبیہ:**) مفقود (کے مسئلہ) میں تحکیم (یعنی حکم کے ذریعہ مسئلہ کا حل) متصور ہی نہیں کیونکہ تحکیم میں تراضی فریقین شرط ہے اور مفقود کی رضا بھی مفقود ہے

لہٰذا (مفقود کے مسئلہ میں) تحکیم کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا واللہ اعلم۔ [1]

تنبیہ: مفقود کا مال اس کے ورثہ میں اس وقت تقسیم ہوتا ہے جب قاضی (حاکم مسلم) اس کی موت کا حکم کردے۔ [2]

عنین کے مسئلے میں فسخ نکاح کی دوصورتیں

سوال (۵۹۱) ہندہ کے ولیوں نے اس کا نکاح زید کے ساتھ کردیا دونوں جوان اور بالغ تھے، زید رجولیت سے خالی تھا (یعنی نامرد تھا) ہندہ کے ولیوں نے زید کے ولیوں سے خلع کی درخواست کی، انہوں نے علاج کے غرض سے مہلتیں لیں لیکن ناکامی ہوئی۔۔۔۔۔٦ سال صبر کیا اب ہندہ اور اس کے ولی طلاق چاہتے ہیں اور زید اور اس کے ولی طلاق دینے سے گریز کرتے ہیں، ایسی صورت میں علماء دین اور مفتیان شرح کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

جواب: چونکہ انکارِ طلاق کے وقت حاکم شرعی کی تفریق کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ اس ملک میں نہیں ہے لہٰذا تفریق کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں، یا تو شوہر طلاق دیدے یا دونوں زن وشوہر برضامندی کسی عالم یا فہیم کو اپنی طرف سے اس مقدمہ میں حَکَم مقرر کرکے اس کے روبرو پیش کریں اور وہ اگر عالم ہو تو خود موافق قواعد شرعیہ اور اگر عالم نہ ہو تو کسی عالم سے اس کا طریقہ دریافت کرکے اسی کے موافق دونوں میں تفریق کرادے۔

البتہ اگر کوئی مسلمان حاکم جو منجانب گورنمنٹ مامور ہو اور ایسے معاملات کے قانوناً اس کو اختیارات دیئے گئے ہوں بعد رجوع نالش کسی عالم سے تفریق کا شرعی طریقہ دریافت کرکے بلا رضامندی شوہر بھی تفریق کردے وہ تفریق بھی مثل تفریق قاضی کے معتبر ہے۔ اور اگر شوہر نہ طلاق دے نہ دونوں برضاءِ خود کسی کو حَکَم ٹھہرادیں

[1] الحیلۃ الناجزہ ص ۲۲۷ [2] امداد الفتاویٰ ص ۳۶۲ ج ۴

نہ کوئی مسلمان حاکم اس قسم کا میسر ہو تو عورت یا اس کے اولیاء بجز صبر کے کچھ نہیں کر سکتے۔ (عربی عبارتیں اصل کتاب میں ملاحظہ فرمائیں)[1]

مسلمانوں سے گذارش

جب یہ معلوم ہو چکا کہ قاضی شرعی کا قائم کرنا مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے اور یہ بھی ثابت ہو چکا کہ بعض معاملات میں حاکم غیر مسلم کا فیصلہ شرعاً معتبر نہیں، بلکہ حاکم مسلم کا فیصلہ ضروری ہے تو عامۂ مسلمین پر ضروری ہے کہ وہ اپنی اس شرعی ضرورت کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کر کے درخواست کریں کہ ہندوستان میں منصب قضاء کو قائم کر کے اپنی مسلم رعایا کو مشکلات سے نجات دے، چونکہ گورنمنٹ اپنی رعایا کی راحت رسانی کا بہت زیادہ خیال کرتی ہے بالخصوص مذہبی معاملات میں اس کو ہر طرح آسانی بہم پہونچاتی ہے، اس لئے قوی امید ہے کہ یہ درخواست منظور ہوگی۔

نیز جو مسلم ممبران کونسل اس مسئلہ کو کونسل میں پیش کرنے والے ہیں ان کے ساتھ سب مسلمانوں کو اتفاق رائے ظاہر کرنا چاہئے اور ہر ضلع کے مسلمانوں کو اپنی طرف سے الگ الگ اس مسئلہ کی ضرورت ظاہر کرنا چاہئے کیونکہ گورنمنٹ کی طرف سے جو بے توجہی اب تک اس مسئلہ میں ہوئی ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کو ہنوز ضرورت کی اطلاع اہمیت کے ساتھ کسی نے نہیں کی، ضرورت پر مطلع ہو کر امید ہے کہ گورنمنٹ بہت جلد مسلمانوں کے حال پر توجہ فرمائے گی۔

حررہ الاحقر ظفر احمد عفی عنہ، خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ۴ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ

الجواب صواب بلا ارتیاب اشرف علی ۴ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ

(رسالہ القول الماضی فی نصب القاضی، ماخوذ از رسالہ النور ماہ محرم ۴۵ھ ص ۱۹ تا ۲۶)

[1] امداد الفتاویٰ ص ۵۰۱ ج ۲ سوال ۵۰۱

شرعی قاضی کا تقرر اور اس کی تدبیر

بہت سے مسائل میں شرعاً حاکم مسلم کا فیصلہ شرط ہے جس کو قضاء قاضی سے تعبیر کیا جاتا ہے، پھر کتاب القضاء میں اس قاضی کے شرائط میں سے اسلام کو کہا ہے گو اس کا تقرر غیر مسلم حکام کی طرف سے ہو، درمختار اور ردالمحتار میں اس عموم کی تصریح موجود ہے، جیسے مفقود یعنی بےنشان (لاپتہ) شخص کی زوجہ کے نکاح اول کے فسخ کرنے میں، یا خیار بلوغ کی بناء پر فسخ کرنے میں اور بھی بہت سے مسائل ہیں۔

سو اگر حکام سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ ہر ضلع یا ہر تحصیل میں علماء اسلام کے مشورہ وانتخاب سے ایک عالم متدین ومتیقظ (دیندار وہوشیار) بنام قاضی محض ایسے مقدمات کی سماعت کے لئے مقرر کردیں، اور اس کی تنخواہ مسلمانوں سے اپنے طور پر وصول کرلی جائے۔

اگر یہ صورت ہوجائے تو مسلمانوں کو ایسے معاملات میں بہت آسانی ہوجائے ورنہ بڑی تنگی پیش آتی ہے، مثال کے طور پر احقر نے زن مفقود (لاپتہ شخص کی بیوی کے بارے میں) ایک جگہ فتویٰ لکھا کہ بعد انقضاء میعاد مقرر عندالامام مالکؒ (یعنی امام مالکؒ کی مقرر کردہ مدت پوری ہوجانے کے بعد) حکام سے یہ درخواست کرو کہ وہ خاص اس مقدمہ کی سماعت کا اختیار کسی عالم کو دیدیں، اور وہ عالم یہ کہہ دے کہ میری رائے میں وہ مفقود مرگیا ہے پھر اس کہنے کے بعد وہ عورت عدتِ وفات پوری کر کے نکاح ثانی کرلے، چنانچہ ان لوگوں نے اطلاع دی کہ ہم نے ضلع کے حاکم سے کہا تھا انہوں نے جواب دیا کہ ہم مذہبی معاملات میں دخل نہیں دیتے تو دیکھئے کیسی تنگی پیش آئی۔

اور بعض مواقع میں ظاہراً تو تنگی نہیں مگر شرعاً تنگی ہوتی ہے مثلاً خیار بلوغ میں

ایک حاکم غیر مسلم نے نکاح اول کے فسخ ہونے کا حکم دے کر نکاح ثانی کی اجازت دے دی تو ظاہراً کارروائی ہوگئی مگر شرعاً یہ کارروائی معتبر نہیں ہوئی یعنی اس سے نکاح اول فسخ نہیں ہوا اور نکاح ثانی صحیح نہیں ہوا، تو تمام عمر ناجائز ہمبستری کا گناہ زوجین کو رہا، اس لئے اس کی کوشش تو بہت زیادہ ضروری ہے، حلال وحرام کا قصہ ہے جو بہت نازک ہے اور اس کی ضرورت تمام قوم کے لئے عام ہے اس لئے اس کا اہتمام بہت زیادہ موجب ثواب ہوگا، اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اہل قلم اس کی مصلحتوں (ضرورتوں) کو ظاہر کریں اور پھر درخواست لکھ کر اس پر کثرت سے دستخط کرا کر پیش کریں، اور حکومت سے منظور کرائیں امید ہے کہ گورنمنٹ ضرور اس پر توجہ کرے گی۔[1]

آج کل فسخ نکاح کی صورت اور اس کا طریقہ

آج کل اس کی صورت یہ ہے کہ اگر ایسا واقعہ پیش آئے تو کسی مسلمان حاکم کے یہاں جس کو یہ اختیارات حاصل ہوں نالش کردو، اگرچہ وہ کافر کا مقرر کیا ہوا ہو، اگر اس کو ایسے اختیارات نہیں دیئے گئے تو حاکم بالا سے رجوع کرو کہ اس کو اختیار دے دیں خواہ اسی ایک مقدمہ کے واسطے پھر اگر وہ فسخ نکاح کردے گا تو فسخ ہوجائے گا، اور ریاستوں میں قاضی کا فسخ کردینا کافی ہے۔

غرض حاکم کے فسخ کرنے سے نکاح فسخ ہوگا محض باپ کے کہہ دینے سے کہ میں راضی نہیں ہوں کچھ نہ ہوگا۔[2]

سوال: جن مسائل میں قاضی کی ضرورت ہے ان میں انگریزی عدالت کا حکم وفیصلہ وہی حکم رکھتا ہے یا نہیں؟

جواب: اگر صاحب اجلاس مسلم ہو وہ شرعاً قاضی ہے۔[3]

---

[1] بوادر النوادر ص ۴۵ ج ۱ [2] عضل الجاہلیہ ملحقہ حقوق الزوجین ص ۳۸۰ [3] امداد الفتاویٰ ص ۳۳۴ ج ۳

زوجۂ مفقود کی چار حالتیں اور ہر ایک کا جداگانہ حکم

اس مذہب کی ایک معتبر کتاب شرح الشیخ الدردیر علی مختصر الشیخ الخلیل ص ۱۳۹۹ موجود کتب خانہ دیوبند میں اس مسئلہ میں یہ تفصیل نظر سے گذری کہ زوجۂ مفقود کی چار حالتیں ہیں۔

ایک یہ کہ دارالاسلام میں ہو اور مفقود اتنا مال چھوڑ گیا ہو کہ اس عورت کے نفقہ کا انتظام اس سے ہو سکے۔

دوسری یہ کہ دارالاسلام میں ہو اور نفقہ کا انتظام اس کے مال سے نہ ہو سکے۔

تیسرے یہ کہ دارالکفر میں ہو اور مفقود کے مال سے نفقہ کا انتظام ہو سکے۔

چوتھی یہ کہ دارالکفر میں ہو اور نفقہ کا انتظام اس کے مال سے نہ ہو سکے۔

صورت اول کا حکم یہ ہے کہ عورت حاکم اسلام سے استغاثہ کرے ورنہ جماعت مسلمین سے رجوع کرے اور حاکم یا جماعۃ المسلمین اس مفقود کی خوب اہتمام سے تلاش کریں، اگر خبر نہ معلوم ہو اس وقت چار سال کی مہلت مقرر کریں اور چار سال کے بعد بھی اگر پتہ نہ لگے تو پھر عورت عدت وفات پوری کرے اور نکاح ثانی کر سکتی ہے۔

اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ عجز عن النفقہ کے سبب منجانب حاکم شرع یا نائب حاکم طلاق واقع کر دی جائے اور عدت طلاق پوری کرے۔

اور تیسری صورت کا حکم یہ ہے کہ مرد کی ستر سال کی عمر تک انتظار کریں۔

اور چوتھی صورت کا حکم مثل دوسری صورت کے ہے، اسی طرح خوف زنا میں بھی یہی حکم ہے۔ یہ حاصل ہے اس کی عبارت کا، تطویل کے سبب عبارت نقل نہیں کی۔

بعد اس کے نقل کرنے کے عرض یہ ہے کہ بعض اہل فتویٰ جو زوجہ مفقود کے لئے علی الاطلاق چار سال کے انتظار کا حکم دے دیتے ہیں یہ اس مذہب کے بھی خلاف ہے،

واقعہ میں سب صورتوں کی تحقیق کر لینا ضروری ہے اور اشتراط قضاء قاضی کی بحث اس پر علاوہ ہے۔ کتبہٗ اشرف علی ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ

سوال: زید عرصہ دس سال سے مفقود الخبر ہے اس کی موت وحیات کی کچھ خبر نہیں ملتی ہے حتی الوسع تلاش کی گئی کچھ پتہ نہیں ملتا، اس کی زوجہ ہندہ نوجوان ہے، زمانہ کی حالت نازک دیکھ کر اس کے والد صاحب اور برادر صاحب کا ارادہ ہے کہ اس کا عقد ثانی کسی دوسرے شخص نیک بخت کے ساتھ کر دیا جائے اور فتاویٰ رشیدیہ میں شاید یہ لکھا ہے کہ امام مالک صاحبؒ یا امام شافعی صاحبؒ کے یہاں یہ درست ہے کہ اس قدر مدت کے بعد اس کا عقد کر دیا جائے اور ضرورتاً حنفی المذہب بھی اس مسئلہ پر عمل کر سکتے ہیں، حضور والا کا اس مسئلہ میں کیا ارشاد ہے تاکہ اس کے موافق اس کا عمل درآمد کیا جائے؟

الجواب: فی شرح الزرقانی المالکی علیٰ موطا الامام مالک فی عدة التی فقد زوجهامانصه' وضعف الاول (ای الوجه الاول للتحدید باربع سنین) بقول مالک لواقامت عشرین سنة ثم رفعت یستانف لها الاجل ثم قال والثانی(ای الوجه الثانی) لقول مالکؒ تستانف الاربع من بعد الیأس وانها من یوم الرفع ثم قال فلا سبیل لزوجها الاول الیها اذاجاء اوثبت انه حی لان الحاکم اباح للمرأة الزواج الی قولهٖ ثم رجع مالک عن هٰذاقبل موتهٖ بعام وقال لایفتیها علی الاول الا دخول الثانی غیر عالم بحیاتهٖ ثم قال وفرق بینها(ای المرأة یطلقها زوجها وهوغائب عنها الخ) وبین امرأة المفقود بانه لم یکن فی هٰذهٖ امر ولا قضیة من حاکم بخلاف امرأة المفقود (کان فیها قضاء من الحاکم)

اس عبارت میں چار جگہ تصریح ہے کہ مفقود کی بی بی امام مالکؒ کے مذہب میں بدون قضاء قاضی یعنی بدون حکم حاکم اسلام کے نکاح ثانی نہیں کر سکتی پس امام مالکؒ کے قول پر عمل کرنا یہ ہے کہ اس قید پر بھی عمل ہو اور جب ایسا نہ کیا جائے تو نکاح ثانی ناجائز ہے اور ظاہر ہے کہ اب کوئی اس کا اہتمام نہیں پس ایسے نکاح ان کے مذہب پر بھی جائز نہیں ہیں۔ ۲۶ رمضان ۱۳۳۲ھ (بوادر النوادر ص ۲۲۲)

فصل

چند مشکلات جن میں قضاء قاضی کی ضرورت پیش آتی ہے

نکاح ہو جانے کے بعد جو مشکلات عورتوں کو شوہر کی طرف سے پیش آتی ہیں اور جن میں ابتلاء عام اور ضرر شدید ہے وہ چند ہیں:

(۱) ایک یہ کہ خاوند نامردی وغیرہ کی وجہ سے عورت کے قابل نہ ہو جس کو اصطلاح فقہ میں عنین کہتے ہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ مرد مجنون ہو۔

(۳) تیسرے یہ کہ مفقود ولاپتہ ہو جائے۔

(۴) چوتھے یہ کہ موجود ہے اور نان نفقہ دینے پر قدرت بھی ہے مگر ظلم کرتا ہے نہ نان نفقہ دیتا ہے اور نہ طلاق۔

(۵) پانچویں یہ کہ لاپتہ تو نہیں مگر بیوی بچوں کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا گیا نہ نان نفقہ غیرہ کا کچھ انتظام کرتا ہے نہ خود آتا ہے نہ ان کو اپنے پاس بلاتا ہے اور نہ طلاق دیتا ہے۔

ان سب صورتوں میں عورت کی رہائی کے لئے شرعی صورتیں جدا جدا ہیں جن کو بالتفصیل لکھا جائے گا، لیکن ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ اس رہائی میں عورت یا اس کے اولیاء خود مختار نہیں بلکہ قضائے قاضی شرط ہے، یعنی ضروری ہے کہ عورت اپنا مقدمہ قاضی کی عدالت میں دائر کرے اور قاضی با قاعدہ شرعی تحقیق کے بعد تفریق وغیرہ کا حکم کرے، مگر ہندوستان میں بحالت موجودہ چونکہ عموماً قاضی شرعی کا وجود نہیں اس لئے اس کی شرعی تدبیر بتلانا سب سے مقدم ہے۔ (الحیلۃ الناجزہ)

ان مشکلات کے حل کا طریقہ

ہندوستان کی جن ریاستوں میں قاضی شرعی موجود ہیں وہاں تو معاملہ سہل ہے، لیکن گورنمنٹی علاقوں میں جہاں یہ صورت نہیں ان میں وہ حکام جج وغیرہ جولوگ گورنمنٹ کی طرف سے اس قسم کے معاملات میں فیصلہ کا اختیار رکھتے ہیں اگر وہ مسلمان ہوں اور شرعی قاعدہ کے موافق فیصلہ کریں تو ان کا حکم بھی قضائے قاضی کے قائم مقام ہو جاتا ہے، اور اگر مسلمان نہ ہوں تو ان کا فیصلہ کالعدم ہے حتیٰ کہ اگر کوئی ججوں یا ممبروں وغیرہ کی کمیٹی فیصلہ کرے تو ان سب کا مسلمان ہونا شرط ہے، اگر ایک جج یا ممبر وغیرہ بھی غیر مسلم ہو تو شرعاً فیصلہ معتبر نہیں۔

قاضی نہ ہونے کی صورت میں شرعی پنچایت کے ذریعہ مسئلہ کا حل

اور اگر کسی جگہ مسلمان حاکم موجود نہ ہو یا مسلمان حاکم کی عدالت میں مقدمہ لے جانے کا قانوناً اختیار نہ ہو یا مسلمان حاکم قواعد شرعیہ کے مطابق فیصلہ نہ کرتا ہو تو اس صورت میں مذہب حنفی کے مطابق عورت کی علیحدگی کے لئے بجز خاوند کی طلاق یا خلع کے کوئی صورت نہیں، لیکن اگر خاوند طلاق اور خلع پر بھی کسی طرح راضی نہ ہو یا مفقود یا مجنون یا نابالغ ہونے کی وجہ سے اس سے طلاق وخلع نہ ہو سکے تو اس وقت مذہب امام مالکؒ کے موافق جس کا اختیار کرنا بضرورت شدیدہ حنفیہ کے نزدیک بھی جائز ہے، مسلمانوں کی جماعت کا حکم بھی قضائے قاضی کے قائم مقام ہو جائے گا۔

اور اس کی صورت یہ ہے کہ محلّہ یا بستی کے دیندار (اور بااثر) مسلمانوں کی ایک جماعت کے سامنے جن کا عدد کم از کم تین ہو اپنا معاملہ پیش کیا جائے اور وہ جماعت واقعہ کی تحقیق کر کے شریعت کے موافق حکم کر دے۔[1]

---

[1] الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ

جماعت مسلمین کے شرائط

اس جماعت کو قاضی کے قائم مقام کرنے کے لئے چند شرائط ہیں، جس جماعت میں یہ شرطیں موجود نہ ہوں وہ شرعاً معتبر نہ ہوگی۔

(۱) کم از کم تین آدمیوں کی جماعت ہو ایک یا دو آدمی فیصلہ کریں تو وہ معتبر نہیں۔

(۲) اس جماعت کے سب ارکان کا عادل ہونا شرط ہے، اور عادل وہ شخص ہے جو تمام کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو اور صغائر پر مصر نہ ہو اور اگر کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہو تو فوراً توبہ کر لیتا ہو، لہٰذا سود خور اور رشوت لینے والا ڈاڑھی منڈانے والا، جھوٹ بولنے والا اور بے نمازی اس جماعت کا رکن نہیں بن سکتا (اگر بدقسمتی سے کسی جگہ کے بااثر لوگ دیندار نہ ہوں تو یہ تدبیر کر لی جائے کہ وہ بااثر اشخاص چند دینداروں کو اختیار دیدیں، تاکہ شرعاً فیصلہ کی نسبت دیندار جماعت کی طرف ہو اور ان بااثر اشخاص کو کوشش کا ثواب حاصل ہو جائے۔

(۳) فیصلہ میں علماء کی شرکت لازم اور شرط ہے، صرف عوام کی جماعت کا فیصلہ حکم قاضی کے قائم مقام نہیں ہو سکتا، اس لئے اولاً تو یہ چاہئے کہ جماعت کے سب ارکان اہل علم ہوں اور اگر یہ میسر نہ ہو تو کم از کم ایک معاملہ فہم عالم کو ضرور جماعت کا رکن بنائیں اور دوسرے ارکان معاملہ کے تمام پہلوؤں کو ان عالم صاحب سے خوب سمجھ کر رائے قائم کریں، اور اگر کسی جگہ یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر یہ لازم ہے کہ جماعت کے ارکان معاملہ کی روداد مکمل کر کے علماء محققین سے ہر ہر جزئی کا حکم دریافت کریں اور جو ان کا فتویٰ ہو اس کے موافق فیصلہ کیا جائے، اگر ایسا نہ کیا بلکہ عوام نے محض اپنی رائے سے فیصلہ کر دیا تو وہ حکم نافذ نہ ہوگا اور فیصلہ بالکل بے کار

اور غیر معتبر رہے گا، اگر چہ وہ فیصلہ شریعت کے موافق بھی ہو۔

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ جماعت مسلمین کے سب ارکان متفقہ فیصلہ دیں، اگر رائے مختلف رہے اور کثرت رائے کی بنا پر فیصلہ کرنا چاہیں تو وہ فیصلہ معتبر نہ ہوگا ،پس اگر ارکان میں اختلاف رہے تو مقدمہ خارج کر دیا جائے۔

فائدہ: اگر اختلاف رائے کی وجہ سے کسی درخواست پر تفریق کا حکم نہ ہوسکا تھا تو وہ درخواست ہمیشہ کے لئے مسترد نہ ہوجائے گی بلکہ مستغیثہ کو اختیار ہوگا کہ معاملہ کی حالت بدل جائے یا ضرورت کی شدت بڑھ جائے تو دوبارہ درخواست پیش کرے اور دوبارہ درخواست دینے پر اگر ارکان کی رائے متفق ہوجائے تو تفریق کر دی جائے۔

چند ضروری تنبیہات

تنبیہ اول: فتاویٰ مالکیہ میں **جماعت المسلمین العدول** کے الفاظ ہیں اور عدل سے مراد وہ شخص ہے جو فاسق نہ ہو یعنی تمام گناہوں سے مجتنب ہو، اور صغائر پر بھی مصر (اصرار کرنے والا) نہ ہو، اور اگر کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہو تو فوراً توبہ کر لیتا ہو۔

لہٰذا وہ شخص جو سود یا رشوت وغیرہ لیتا ہو یا ڈاڑھی منڈواتا ہو یا جھوٹ بولتا ہو، یا نماز روزہ کا پابند نہ ہو وہ اس جماعت کا رکن نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ مسئلہ مالکیہ سے لیا گیا ہے، اس واسطے اس کی سب شرطیں مذہب مالکیہ سے لینا لازم ہے، اور ان کے نزدیک قاضی وغیرہ کے لئے عادل ہونا شرط ہے اس لئے غیر عادل کا حکم نافذ نہ ہوگا۔

اور حنفیہ کے نزدیک گو قاضی کا عادل ہونا شرط کے درجہ میں نہیں لیکن غیر عادل سے فیصلہ کرانا حرام ہے، اس لئے ان کے نزدیک بھی غیر عادل کو اس پنچایت کا رکن بنانا جائز نہیں، غرض پنچایت کا دیندار ہونا ضروری ہے۔ (الحیلۃ الناجزہ ص ۵۷ وغیرہ)

عوام کی شرعی پنچایت کا اعتبار نہیں

تنبیہ دوم: اگر فیصلہ پنچایت کے سپرد کیا جائے تو چونکہ عوام کی پنچایت کا کچھ اعتبار نہیں نہ معلوم کہاں کہاں قواعد شرعیہ کے خلاف کر بیٹھیں، اس لئے اولاً تو یہ چاہئے کہ پنچایت کے سب ارکان اہل علم ہوں، اور اگر میسر نہ ہوں تو کم از کم ایک عالم معاملہ شناس کو پنچایت میں اس طرح شریک کرلیں کہ اول سے آخر تک جو کچھ بھی کریں ان سے پوچھ کر کریں۔

اگر عالم میسر نہ ہو

اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس پنچایت کا فیصلہ نافذ و معتبر ہونے کی کوئی صورت نہیں سوائے اس کے کہ معاملہ کی مکمل روداد دکھلا کر ہر ہر جزئی کے حکم کو معاملہ فہم علماء محققین سے دریافت کر کے ان کے فتوے کے مطابق فیصلہ کیا جائے، اگر ایسا نہ کیا گیا بلکہ عوام نے محض اپنی رائے سے حکم کر دیا تو وہ حکم نافذ نہ ہوگا، اگرچہ اتفاقاً حکم صحیح بھی ہو گیا ہو جیسا کہ فقہاء مالکیہ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔[1]

اگر بااثر اور دیندار ارکان میسر نہ ہوں

اور اگر بدقسمتی سے کسی جگہ کے بااثر لوگ دیندار نہ ہوں تو یہ تدبیر کرلی جائے کہ وہ بااثر اشخاص چند دینداروں کو اختیار دے دیں تاکہ شرعاً فیصلہ کی نسبت دیندار جماعت کی طرف ہو، اور بااثر اشخاص کی شرکت گو ضروری نہیں مگر ان کے اثر سے کام میں سہولت ہوتی ہے، اس طرح کام بھی بن جائے گا، اور ان بااثر اشخاص کو ثواب بھی ملے گا۔[2]

---

[1] شرح الدردیر ص ۲۸۶ [2] الحیلۃ الناجزۃ

شرعی پنچایت کے فیصلہ کا حکم

تنبیہ سوم: یہ شرعی پنچایت جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اگر کسی معاملہ میں متفق ہو کر تفریق کردے، تو اس کا حکم قاضی کے قائم مقام ہوگا، اور تفریق وغیرہ صحیح ہوجائے گی، اور اگر پھر خدانخواستہ کسی واقعہ کے متعلق پنچایت کے ارکان میں اختلاف رہا تو تفریق وغیرہ نہ ہوسکے گی، اور اگر بعض نے فیصلہ کردیا تو کالعدم متصور ہوگا (یعنی اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے)۔

جماعت المسلمین کا صرف وہ فیصلہ معتبر ہوگا جو باتفاق ہو، کثرت رائے کا اعتبار نہ ہوگا، کیونکہ اس (کثرت رائے) کے معتبر ہونے کی دلیل نہیں اور بغیر دلیل کے کوئی حکم ثابت نہیں ہوسکتا۔

شرعی پنچایت کے فیصلہ پر عورت کو حق اعتراض

البتہ عورت کو نظر ثانی کی درخواست کا حق ہوگا، پھر نظر ثانی میں اس پنچایت کے ارکان کو اگر کوئی وجہ قوی عورت کے مطالبہ کی موید ظاہر ہو (یعنی ارکان کے نزدیک عورت کے مطالبہ کی قوی وجہ سمجھ میں آتی ہو) اور ارکان پنچایت اب تفریق پر متفق ہوکر تفریق کردیں تو یہ تفریق نافذ ہوجائے گی اور اگر مقدمہ کی روداد بالکل وہی ہے کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوئی تو تفریق نہ کی جائے گی۔[1]

مقدمہ پیش کرنے کی بابت اگر فریقین میں اختلاف ہوجائے

اضافہ: عنوان بالا تنبیہ سوم کے بالکل ختم پر متن میں سوال وجواب ذیل کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

---

[1] دلائل کے لئے اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں، الحیلۃ الناجزۃ ص ۵۱ تا ۵۳

سوال

اگر مقدمہ پیش کرنے کی بابت فریقین میں اختلاف ہو،ایک فریق ایک جماعت کے پاس مقدمہ لے جانا چاہے، دوسرا فریق دوسری جماعت کے پاس تو کس فریق کو ترجیح دی جائے گی؟ اور کس جماعت کو سماعتِ دعویٰ کا حق ہوگا؟ اور اگر ایک جماعت فیصلہ کر چکے اس کے بعد دوسرا فریق کسی اور جماعت کے پاس اس فیصلہ کے خلاف درخواست دے تو دوسری جماعت کو سابق فیصلہ کے خلاف فیصلہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

مقدمہ پیش کرنے کا اس کو حق ہے جو از روئے شریعت مدعی قرار دیا جائے دوسرے فریق کو اس میں اختلاف کا کوئی حق نہیں۔

اور اگر کوئی ایسا معاملہ ہو کہ اس میں دونوں فریق شرعاً مدعی تصور کئے جاتے ہیں تو جس جگہ سے طلبی کا پیام پہلے پہنچ جائے دونوں کو اس کے یہاں جانا لازم ہے اور اگر دونوں جگہ سے طلبی کا حکم ایک دم پہنچ گیا تو پھر قرعہ ڈالا جائے جس کا نام قرعہ میں نکل آئے اس کے یہاں مقدمہ پیش ہوگا۔

اور جب ایک جماعت فیصلہ کر چکے اس کے بعد دوسرا فریق اس کے خلاف درخواست دے تو اس میں تفصیل ہے اگر پہلا فیصلہ شریعت کے قطعاً خلاف ہے تب تو اس فیصلہ کے خلاف صحیح فیصلہ کیا جائے ،اور اگر وہ فیصلہ ایسا ہے جو قطعی طور پر شریعت کے خلاف نہیں بلکہ کسی نہ کسی قول کے موافق ہے تو اس فیصلہ کو توڑنا جائز نہیں گو دوسری جماعت کی تحقیق میں وہ صحیح نہ ہو کماھو المصرح فی الجوابین عن الاستفتاء بالمرۃ الخامسۃ۔

عدالت کے فیصلے کے ساتھ شرعی پنچایت سے بھی فیصلہ کرائیے

اگر کسی جگہ حکومت کی طرف سے ایسا حاکم متعین ہو جس کا فیصلہ شرعاً معتبر نہیں (یعنی حاکم غیر مسلم ہو یا احکام شرعیہ کی رعایت نہ کرتا ہو، یا مذہب مالکیہ کے مطابق فیصلہ کرنے کی صورت میں حاکم عادل نہ ہو یا عالم نہ ہو اور علماء سے مراجعت بھی نہ کرے تو اس کا فیصلہ معتبر نہیں جیسا کہ اصل رسالہ میں مفصل معلوم ہو چکا ہے) مگر قانونی خطرہ سے حفاظت کے لئے اس کے یہاں مقدمہ دائر کرنا پڑے تو مقدمہ دائر کرنے کا مضائقہ نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازم ہے کہ جماعتِ مسلمین سے بھی فسخ کا حکم حاصل کیا جائے اور عمل کا تمام تر مدار جماعتِ مسلمین ہی کے فیصلہ پر رکھا جائے پھر خواہ اول حکومت سے فیصلہ حاصل کیا جائے خواہ جماعتِ مسلمین سے اول حکم حاصل کیا جائے خواہ دونوں جگہ ایک ہی ساتھ مقدمہ پیش کر دیا جائے مگر ہر حال میں جماعت مسلمین کے فیصلے سے پیشتر صرف ایسے حاکم کے فیصلے کو ہرگز کافی نہ سمجھیں جس کا فیصلہ شرعاً معتبر نہیں۔[1]

اہل حل وعقد حاکم کے قائم مقام ہوں گے

شریعت نے بہت سے احکام میں ضرورت کے وقت عامۃ المسلمین (یعنی عام مسلمانوں) کو سلطان کے قائم مقام ٹھہرایا ہے جیسے نصب امام خطیب جمعہ اور وقف کے متولی کا نصب کرنا وغیرہ **لفقدان السلطان المسلم**۔[2]

لیکن اب عام مومنین کا اجتماع تو مشکل ہے اسی لیے وہ لوگ ان کے قائم مقام ہوں گے جن کو عام مومنین سمجھیں گے کہ یہ ہمارے بڑے ہیں ان کو زبان حال سے مانتے ہوں خواہ ان کا دینی اثر ہو یا دنیاوی اثر۔ وہ کون لوگ ہیں؟ اتقیاء واہل حل وعقد۔[3]

[1] الحیلۃ الناجزۃ ص ۱۵۶ [2] ملفوظات اشرفیہ ص ۴۰۲ [3] حسن العزیز ۴۳/۳ ،۱۷۳ سوم۔

خلاصہ یہ کہ عام مومنین کا اجتماع ہر وقت دشوار ہے تو اس صورت سے عام مؤمنین میں جو ذی اثر لوگ ہوں گے جیسے علماء ورؤساء، امراء، سلاطین جن کو اہل حل و عقد کہا جاتا ہے وہ ان کے قائم مقام سمجھے جائیں گے اوران ذی اثر لوگوں کا اجتماع (واتفاق) عام مومنین کا اجتماع قرار دیا جائے گا۔[1]

(جمعہ کی نماز کی صحت کے لئے) شرط وجودِ سلطان مقصود لذاتہٖ نہیں ہے بلکہ بحکمت سدِّ فتنہ کے ہے، پس اگر تراضیٔ مسلمین سے یہ حکمت حاصل ہوجائے تو معنیً یہ شرط مفقود نہ ہوگی۔[2]

جماعت المسلمین کی نیابت صرف انتظامی امور میں ہے

اور نیابت جماعت کی مناب سلطان کے (یعنی جماعت المسلمین سلطان کے قائم مقام ہے یہ) صرف امور انتظامیہ میں ہے، سوچونکہ جمعہ کے لئے وجود سلطان کا مقصوداً شرط نہیں صرف رفع نزاع فی التقدیم والتقدم ہے، چنانچہ ہدایہ میں مصرح ہے اور یہ امر انتظامی ہے اس میں جماعت (المسلمین) امام کے قائم مقام ہوجائے گی۔[3]

جماعت المسلمین کے کرنے کا ایک کام

بستی کے کسی ایک بااثر دیندار کو یا چند بااثر دینداروں کی جماعت کو اپنا بڑا بنالیا جائے (اوراگر وہ دیندار نہ ہوتو اس سے کہا جائے کہ اگر آپ پابندیٔ احکامِ اسلام کا وعدہ کریں تو ہم آپ کو اپنا بڑا بناتے ہیں ورنہ دوسرے کو اپنا بڑا بنالیں گے، یقین ہے کہ اس کے بعد وہ دیندار بن جائے گا تو اسی کو بڑا بنالیں۔ منہ) جن کا کام یہ ہو کہ لوگوں میں اتحاد واتفاق قائم رکھیں اور جب کسی معاملہ میں نزاع ہو اس کا شریعت کے موافق علماء سے پوچھ کر فیصلہ کردیں، اورسب اس فیصلے کی تائید کریں۔[4]

---

[1] الافاضات الیومیہ ۲۲۰/۱۰ [2] امداد الفتاویٰ ۶۳۰/۱ [3] ایضاً ۱۶۹۰/۱ [4] امداد الفتاویٰ ۶۳۷/۴

باب۵

مسئلۂ تکفیر سے متعلق چند ضروری اہم ہدایات

علماءِ اہل فتویٰ کو مجبور ہونا پڑتا ہے کہ یہ فیصلہ کریں کہ کون مسلم ہے کون کافر، کون صالح، کون فاسق، مگر کسی معین شخص کے لیے ایسا حکم کرنا بڑا کٹھن کام ہے بڑی احتیاط لازم ہے۔[1] میں اہل علم کو تنبیہ کرتا ہوں کہ فتویٰ میں یہ طریق اختیار کریں کہ کسی کے کہنے سے دوسرے پر فتویٰ نہ لگائیں اسی طرح کسی پر کفر کا فتویٰ نہ دیں۔[2]

کفر کی دو قسمیں، کفر اعتقادی، کفر عملی

قال اللہ تعالیٰ :یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تُطِیْعُوْافَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوْاالْکِتَابَ یَرُدُّوْکُمْ بَعْدَاِیْمَانِکُمْ کٰفِرِیْن. (آل عمران آیت نمبر۱۰۰)

اے ایمان والو! اگر تم کہنا مانوگے کسی فرقہ کا ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی یعنی اہل کتاب میں سے تو وہ لوگ تم کو تمہارے ایمان لائے پیچھے اعتقاداً یا عملاً کافر بنادیں گے۔

فائدہ: اثناء ترجمہ میں تعمیم کفر کیلئے جو اعتقاداً وعملاً کہا گیا اس کا حاصل یہ ہے کہ ایک معنی کفر کے تو متعارف ہیں اور وہ کفر اعتقادی ہے، اور ایک معنی یہ ہیں کہ اعتقاداً تو مومن ہومگر کام کافروں کے سے کرے اس کو بھی مجازاً کفر کہہ دیتے ہیں، کفر عملی سے یہی مراد ہے، قرآن وحدیث میں اس کا بھی استعمال بہت آیا ہے، پس مطلب آیت کا یہ ہے کہ اہل کتاب کی اطاعت سے کفر کا ڈر ہے، اگر اطاعت عقائد میں کی جائے تو کفر اعتقادی ہوگا، اور اگر اطاعت اعمال ومعاصی میں کی جائے جیسے ان کے اشتعال سے لڑنے کو تیار ہوگئے تو یہ عمل کافروں کا سا ہوگیا۔[3]

۱؎ مجالس حکیم الامت ص:۱۰۸ ۲؎ کلمۃ الحق ص ۳۳ ۳؎ بیان القرآن، آل عمران پ۴

نماز کو چھوڑنے والا کیا کافر ہو جائے گا؟

حضرات صحابہ فرماتے ہیں مَا کُنَّا نَریٰ تَرْکَ شَیْئٍ کُفْراً سِوَی الصَّلٰوۃِ۔ کہ ہم کسی کام کے چھوڑنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے بجز نماز کے کہ اس کا چھوڑنا اس وقت کفر سمجھا جاتا تھا۔

کیونکہ کہ نماز ایسی ہی چیز ہے کہ مسلمانوں کا قومی امتیاز ہے، اس لئے اس زمانہ میں اس امتیاز کی ہر مسلمان حفاظت کرتا تھا، اور جو شخص نماز نہ پڑھتا اس کے اوپر کفر کا شبہ ہوتا تھا۔

ترک صلوٰۃ عہد صحابہ میں کفر ہی کی علامت تھی پس اس کا حاصل کفر ہی ہوا، جیسے شدّ زُنّار کو فقہاء نے شعار کفر فرمایا ہے، اس سے تمام احکام کفر کے جاری کردیئے جائیں گے، اور اس زمانہ میں ترک صلوٰۃ کی علامت کفر ہونے کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے، **بین العبد وبین الکفر الخ العهدالذی بیننا وبینهم الصلوٰۃ الخ** (مشکوٰۃ شریف کتاب الصلوٰۃ)[1]

اور حضرات صحابہ نے جو فرمایا کہ ہم ترک صلوٰۃ کو کفر سمجھتے تھے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تارک صلوٰۃ (نماز کا چھوڑنے والا) کافر ہو جاتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس پر کافر ہونے کا شبہ ہوتا تھا کیوں کہ اسلامی علامت کے فوت ہونے سے صورت تو کفر کی ہوگئی۔[2]

قرآن کی ایک آیت میں نماز ترک کرنے کو شرک میں داخل کیا گیا ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

مُنِیْبِیْنَ اِلَیْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلاَ تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔

(ترجمہ) یعنی اللہ سے ڈرو، نماز قائم کرو، اور مشرکین میں سے مت بنو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز نہ پڑھنا مشرک بننا ہے اور حدیث میں تو یہ مضمون بہت صاف آیا ہے مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّداً فَقَدْ کَفَرَ یعنی جس نے نماز کو قصداً ترک کردیا وہ کافر ہوگیا، گو جمہور علماء نے ان آیات واحادیث میں تاویل کی ہے، مطلب یہ ہے کہ نماز چھوڑنا کافروں کا سا کام ہے۔

---

[1] بوادر النوادر ص ۶۴۰ [2] الصبر والصلوٰۃ ص ۲۲۷

مگر صاحبو! اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ظاہر الفاظ میں ایسے شخص کو کافر کہہ دیا ہے، گو علماء تاویل کرتے ہیں، میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ تاویل غلط ہے لیکن ہم کو اس تاویل کے بھروسہ پر بےفکر نہ ہونا چاہئے کیوں کہ خدا اور رسول جس بات کو کفر فرمارہے ہیں اگر واقع میں وہ کفر بھی نہیں تو کفر سے بہت قریب تو یقیناً ہے اور کفر کا انجام جو کچھ ہے سب کو معلوم ہے کہ ہمیشہ ہمیش کے لئے جہنم کی سزا ہوگی، تو جو کام اس سے قریب کرنے والا ہو، مسلمان کو اس سے کوسوں دور بھاگنا چاہئے۔[1]

تکفیر کے چند اہم اصول

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ ایک مدعیٔ اسلام کی تکفیر کیسے ہوسکتی ہے؟ کافر اور مسلمان ہونے کا آخر معیار کیا ہے؟

فرمایا کہ اصول ذیل اس امتیاز کیلئے کارآمد ہوں گے جو بدلائل ثابت ہیں

۱: حلول کا قائل ہونا کفر ہے جیسا کہ بعض لوگ سر آغا خاں کے اندر خدائی حلول کے قائل ہیں لِقَوْلِهٖ تَعَالیٰ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ بْنُ مَرْيَمَ۔ (مائدہ پ۶)

۲: جو رسوم و عادات کفار کے ساتھ ایسی خصوصیت رکھتے ہیں کہ بمنزلہ ان کے شعار کے ہوگئے ہوں، اگر عرفاً وہ شعار مذہبی سمجھے جاتے ہوں وہ بھی کفر ہیں، اسی اصل پر فقہاء نے شدِّ زُنّار کو کفر فرمایا ہے، اسی طرح تصویر کی پرستش کرنا یا کرشن کی تصویر عبادت خانہ میں رکھنا جو کفار کا شعار تھا، یا بجائے بسم اللہ کے لفظ اوم لکھنا کہ یہ بھی ان کا شعار ہے لِقَوْلِهٖ تَعَالیٰ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَائِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۔ (سورہ مائدہ پ۷)

۳۔ اگر وہ رسوم و عادات کفار شعار مذہبی نہ سمجھے جاتے ہوں تو تشبہ بالکفار ہونے

---

[1] الکمال فی الدین ۱۰۳

کے سبب معصیت وحرام ہیں جیسے دیوالی سے بہی کھاتا کا حساب شروع کرنا، یا مقتداؤں کو لفظ خدواند سے خطاب کرنا یا ان سے دعا مانگنا جیسا کہ آغا خانیوں کا طرز ہے، **لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی وَلَاتَرْکَنُوْا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ۔پ۱۲)**

۴۔ عادات مخصوصہ بالمسلمین دلیل اسلام ہیں بشرطیکہ کوئی یقینی دلیل کفر کی نہ ہو، ورنہ کفر ہی کا حکم کیا جاوے گا اور اسلام کی وجہ واحد کو کفر کی وجود متعددہ پر ترجیح اسی وقت ہے جب کہ وہ جوہ کفر محتمل ہوں متیقن نہ ہوں، **لِقَوْلِهٖ صَلَّی اللّٰهُ علیه وسلم من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذلک المسلم (رواه البخاری) ولقوله تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلاً اُوْلٰئِکَ هُمُ الْکَافِرُوْنَ حَقًّا۔(پ۶)**

۵۔موجباتِ کفر کے ہوتے ہوئے محض دعویٰ اسلام وصلوٰۃ واستقبال بیت الحرام ترتب احکام اسلام (مثلاً اس پر نماز جنازہ کا پڑھنا اور مقابر مسلمین میں دفن کرنا) کے لئے کافی نہیں جب تک کہ ان موجبات سے تائب نہ ہوجائے، **لقول النبی ﷺ آیة المنافق ثلث رواه الشیخان زاد مسلم وان صام وصلی وزعم انه مسلم ۔(تأمّلْ)**

۶۔باوجود ثابت کفر کے اسلام ظاہر کرنے والوں کے ساتھ بنا بر مصالح اسلامیہ مسلمانوں کا برتاؤ کرنا مخصوص تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کے ساتھ اب وہ حکم باقی نہیں رہا، **عن حذیفة قال انما النفاق کان علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فاما الیوم فانما هو الکفر او الایمان وفی اللمعات فی شرح الحدیث ای حکمه بعدم التعرض لاهله.**

والستر علیهم کان علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم لمصالح کانت مقتصرةً علی ذالک الزمان، اما الیوم فلم تبق تلک المصالح فنحن ان علمنا انه کافر سرا قتلناه حتی یومن :

بلکہ بعض احکام کے اعتبار سے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیر عہد میں معاملہ

کالمسلمین میں تغیر ہوگیا۔ چنانچہ آیت وَلاَتُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍمِّنْهُمْ مَاتَ اَبَدًاوَّ لاتَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ مصرح ہے۔

۷۔ جو کافر اصول اسلامیہ کا بھی مقر ہو، اسکے حکم بالاسلام کے لئے محض تلفظ بکلمتی الشہادہ کافی نہیں جب تک اپنی کفریات سے تبری کا اعلان نہ کردے کمافی ردالمحتار احکام المرتد تحت قوله الدر المختار لان التلفظ بها صار علامة على الاسلام مانصه افادبقوله صار الى ان ما كان فى زمن الامام محمدتغير لانهم فى زمنه ما كانو ايتمتعون عن النطق بها فلم تكن علامة الاسلام فلذا شرطوامعهاالتبرى لها فى زمن قارى الهداية فقد صارت علامة الاسلام لانه لاياتى بهاالا المسلم۔

۸۔ جس شخص کا کفر ثابت ہوجائے اس کے اقوال وافعال محتملہ للکفر والاسلام میں تاویل کرنے سے اس کا کفر مانع نہ ہوگا ،مثلاً دیوالی سے بہی کھاتہ کا شروع کرنا یا مقتداؤں کو لفظ خداوند سے خطاب کرنا، ان سے دعا مانگنا، ان کا صدور اگر مسلمان سے ہوتا تو اس میں تاویل کرکے مباح یا معصیت پر محمول کیا جاتا، مگر جب اس کا صدور کافر سے ہے تو تاویل کی ضرورت نہیں، فى مختصر المعانى بحث الاسناد مانصه وقولنا فى التعريف بتاويل يخرج نحومامرمن قول الجاهل انبت الربيع البقل الخ وفيه بحث وجوب القرينة واسناد المجازى مانصه عطف على الاستحالة اى وكصدورعن الموحد فى مثل الشاب الصغير پس کسی مصلحتِ دنیوی کے سبب کافر کو مسلمان کہنا اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کرنا ہرگز مناسب نہیں کیونکہ جب کفریات کے ہوتے ہوئے کسی کو مسلمان کہا جائے گا تو ناواقف مسلمانوں کی نظر میں ان کفریات کا قبح خفیف ہوجائے گا اور وہ آسانی سے ایسے گمراہوں کے شکار ہوسکیں گے تو کافروں کو اسلام میں داخل کہنے کا انجام یہ ہوگا کہ بہت سے مسلمان اسلام سے خارج ہوجاویں گے، کیا کوئی مصلحت اس مفسدہ کی مقاومت

کر سکے گی چنانچہ ارشاد ہے قُلْ فِیْهِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ الخ ۔[1]

دینی وشرعی حکم کا استخفاف موجبِ تکفیر ہے

امور دین خواہ اصول ہوں یا فروع، فرائض وواجبات ہوں یا سنن ومستحبات، عبادات ہوں یا عادات حتیٰ کے عمامہ کی ہیئت مسنونہ، قصداً استخفاف ہو یا دلالۃً (ان سب سے کفر ہو جائے گا) تفصیل کے لئے اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں ۔[2]

کفر کا فتویٰ دینے میں احتیاط کے حدود

امام ابوحنیفہؒ نے کسی اسلامی فرقہ کو جب تک کہ وہ ضروریات دین کا منکر نہ ہو، کافر نہیں کہا، اور یہ قاعدہ مقرر کیا ہے لَانُکَفِّرُ اَهْلَ الْقِبْلَةِ (کہ ہم اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کرتے)

بعض لوگ تشدد کرتے ہیں کہ مسلمان کو کافر اور منافق کہہ دیتے ہیں یہ بڑی غلطی اور جرأت کی بات ہے، جب وہ زبان سے اسلام ظاہر کرتا ہے اور آج کل کوئی وجہ اس بات کی نہیں رہی کہ نفاق کا وتیرہ اختیار کیا جائے پھر کسی کو کافر اور منافق کہنے کے کیا معنیٰ؟

کافر بڑا سخت لفظ ہے بڑی احتیاط چاہئے، کسی کو کافر اس وقت کہہ سکتے ہیں جب کہ وہ کوئی فعل ایسا کرتا ہو جو محتمل تاویل نہ ہو، مثلاً کوئی شخص بت پرستی بلا اکراہ کھلم کھلا کرتا ہو، تو اس وقت اس کو کافر کہہ سکتے ہیں اور جب ایک شخص بت پرستی سے نفرت رکھتا ہے زبان سے کلمہ پڑھتا ہے تو اس کی تکذیب کرنا اور کافر کہنا کیا معنیٰ؟

ظاہر بات ہے کہ کافر اصل میں اس کو کہتے ہیں جو دل سے حق تعالیٰ کا منکر ہو، اور جو شخص زبان سے انکار کرتا ہے اس کو کافر اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے نزدیک وہ دل سے منکر ہے کیوں کہ اس کی زبان سے انکار سنا گیا اور زبان دل کی ترجمان سے تو کفر کا حکم اس واسطے لگایا گیا ہے کہ زبان کے ذریعہ سے اس کا انکار قلبی معلوم ہو گیا۔

غرض کسی کو کفر لسانی کی وجہ سے کافر کہنا بھی دراصل کفر قلبی ہی کی وجہ سے ہے مگر

[1] کمالات اشرفیہ ۳۹۸ امداد الفتاویٰ ۶/۱۰۷ [2] بوادر النوادر ص ۹۴۲ رسالہ جزل الکلام فی عزل الامام

چونکہ ہم کو انکار قلب کا علم ظاہر (کے ذریعہ) سے ہوتا ہے یعنی زبان سے اس واسطے زبان سے انکار کرنے والے کو کافر کہہ دیتے ہیں تو اس سے ثابت ہو گیا کہ ہم حکم اسی بات پر لگا سکتے ہیں جو ظاہر ہو اور زبان سے کہی جائے، پس جب ایک شخص زبان سے اسلام ظاہر کرتا ہے اس کو ہم کافر کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ گو یہ اسلام ظاہر کرتا ہے مگر ہم کو کسی اور ذریعہ سے دل کا حال معلوم ہو گیا ہے کہ اس میں کفر ہے سو وہ کون سا ذریعہ ہے؟ ہمارے پاس وحی نہیں آتی جس سے دل کا حال معلوم ہو جائے اور نہ کسی صاحب وحی نے ہم کو بتلایا جیسا کہ حضرت حذیفہؓ کو بتلا دیا تھا پھر دل پر کیسے حکم لگایا جا سکتا ہے، یہ سخت غلطی ہے اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔[1]

یاد رکھو! جو شخص اسلام کا دعویٰ کرتا ہو یعنی زبان سے مسلمان ہونے کا اقرار کرتا ہو تو وہ اس وقت تک کافر نہیں ہوتا جب تک کہ کسی ایسی بات کا انکار نہ کرے جو ضروریات دین میں سے ہو، ان میں کسی کا انکار کرے تب تو البتہ اسلام سے خروج ہوتا ہے اور جو ضروریات کا انکار نہ کرے ہاں عمل میں سستی کرتا ہے تو وہ گنہ گار ہے اس پر ایسا سخت حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ بالکل اسلام سے خارج ہو گیا، آخر کفر سے پہلے گناہ کا مرتبہ بھی تو ہے اور اس میں دو درجہ ہیں، صغیرہ اور کبیرہ، اہل حق کا عقیدہ ہے کہ گناہ کبیرہ سے بھی خروج عن الاسلام نہیں ہوتا اور اس پر خلود فی النار نہ ہوگا، اور یہ بھی عقیدہ ہے کہ شفاعت اہل کبائر کو پہنچے گی۔

آج کل جن مسائل میں اختلاف ہے ان میں اکثر جانبین میں گنجائش ہے تو کوئی فریق اپنے مقابل پر کوئی قطعی حکم کیسے لگا سکتا ہے اور حکم بھی کون سا، کفر کا، لطف یہ ہے کہ ان مسائل میں اختلاف کفر و عدم کفر کا ہے ہی نہیں جو کچھ اختلاف ہے وہ سنت اور بدعت کا ہے، ایک فریق اس کو سنت کہتا ہے او دوسرا اس کو بدعت اور معصیت کہتا ہے ابھی تو خود معصیت و عدم معصیت ہی میں اختلاف ہے کفر و عدم کفر کا کیا ذکر؟ اگر سنت

[1] الاسلام الحقیقی ص۴۵۴

کہنے والوں نے بہت زور مارا اور اس فعل کو سنت اور اس کے خلاف کو بدعت ثابت کر ہی دیا تب بھی سنت کے تارک پر خلود فی النار کی وعید کہاں آئی ہے؟

تارک سنت اور کافر کو برابر کیسے کیا جاسکتا ہے؟ دونوں کے واسطے خلود فی النار کا حکم کیسے لگایا جاسکتا ہے؟ ضروری ہے کہ دونوں میں فرق کیا جائے، اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ہر بات پر کفر کا حکم لگا دینا عقل وشریعت کی رو سے کہاں تک صحیح ہے۔[1]

اہلِ حق کا طریقہ

اہلِ حق کا طریقہ یہی ہے کہ حتی الامکان جب تک کوئی بھی تاویل بن سکے کسی کو کافر نہ بتائیں، ہاں اگر کوئی خود ہی تاویل کو بھی رد کردے تو مجبوری ہے، اب مدعی سست اور گواہ چست کا قصہ ہے، باقی اپنی طرف سے کبھی کسی کو کافر نہیں بناتے۔

وہ تو ادنیٰ سا گناہ بھی کسی کے ذمہ لگانا پسند نہیں کرتے چہ جائیکہ کفر، کیوں کہ کسی کے لئے کفر ثابت کردینے کے یہی معنیٰ ہیں کہ اس کو ابدالآباد (ہمیشہ) کے لئے رحمت خداوندی سے مایوس اور محروم بنا دیا جائے یہ ان سے کب ہوسکتا ہے، ان کا اگر اختیار ہو تو مسلمان کو تو کافر کہنا درکنار، کافر کو بھی کافر نہ رہنے دیں۔

غرض کفر بہت بڑا حکم ہے اس کا نام بھی ان کی زبان پر آنا مشکل ہے، یہ اور بات ہے کہ کوئی خود ہی کافر بننا اور رحمت الٰہی سے خارج ہونا چاہے، یہ (اہل حق) اس وقت بھی دل سے چاہتے ہیں کہ یہ کافر نہ بنے، مگر جب وہ خود ہی ڈوبنا چاہتا ہے تو کسی کا کیا بس ہے، حکم شرعی کو تو یہ بدل نہیں سکتے، بدرجۂ مجبوری فتویٰ دے دیں گے تو اس وقت انہوں نے کافر نہیں بنایا بلکہ وہ خود ہی کافر بنا انہوں نے صرف بتلا دیا ہے کہ یہ کفر ہوگیا، انہوں نے بالکل ہی مضطر ہوکر یہ فتویٰ دیا ہے اگر بعید سے بعید بھی تاویل ان کو مل جائے تو وہ اس کو کفر کے حکم سے بچا دیتے ہیں، اللہ والوں کا یہی طریقہ ہے۔[2]

---

[1] الاسلام الحقیقی ص۴۸۲، ۴۶۴ [2] الاسلام الحقیقی ملحقہ محاسن اسلام ص۴۵۸

تکفیر کے مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کی غایت احتیاط

ہم نے آج کل یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنا جو ایک مسلک قرار دے لیا ہے بس وہی اسلام ہے اور وہی ایمان ہے اور جو اس کے خلاف ہو وہ کافر ہے، یہ بہت سخت بات ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کو دیکھئے صاحب مذہب تھے، مجتہد تھے انکا منصب یہ تھا کہ ایک مسلک قرار دے لیتے ہم تو اس کے اہل نہیں، مگر ان کی احتیاط دیکھئے۔

ان کے زمانہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ اس شخص کے حق میں کیا فرماتے ہیں جو یہ کہتا ہے لَایَدْخُلُ النَّارَ کَافِرٌ یعنی کوئی کافر دوزخ میں نہیں جائیگا، آپ نے شاگردوں سے پوچھا سب نے اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا کیوں کہ یہ لفظ صراحۃً خدا تعالیٰ کے قول کے خلاف ہے، قرآن شریف میں صاف آیا ہے کہ کفار دوزخ میں جائیں گے اور یہ شخص کہتا ہے کہ کوئی کافر دوزخ میں نہ جائے گا تو اس نے حق تعالیٰ کے قول کی تکذیب کی اور اس کا کفر ہونا ظاہر ہے، امام صاحب نے فرمایا کہ ظاہری معنی تو یہی ہیں مگر اس میں کوئی تاویل بھی تو ہو سکتی ہے یا نہیں؟ لوگوں نے کہا: ایسے صریح لفظ میں کیا تاویل ہو سکتی ہے فرمایا: نہیں! میرے نزدیک ایک تاویل ہو سکتی ہے اس کا یہ کہنا کہ دوزخ میں کوئی کافر نہ جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دوزخ میں جاتے وقت کوئی کافر نہ رہے گا، کیونکہ قیامت میں کفار کو حق ظاہر ہو جائے گا اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہم غلطی پر تھے، جب اپنی غلطی ظاہر ہو جائے گی تو اس وقت انبیاء کی بھی تصدیق کریں گے اور جنت کی بھی اور نار کی بھی، تو وہ منکر نہ رہے، تو اب یہ کہنا ٹھیک ہو گیا کہ دوزخ میں جو کوئی جائے گا وہ منکر اور کافر نہ ہو گا، یہ اور بات ہے کہ اس وقت کا ایمان نفع نہ دے گا۔ (کیونکہ) یہ ایمان بالغیب نہیں لہٰذا مقبول نہیں تو گو اس شخص کا ایمان کارآمد تو بے شک نہیں لیکن ایمان تو ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ وہ شخص گویا شرعاً کافر ہے مگر لغۃً کافر نہیں پس یہ جملہ تو صادق ہوگیا کہ وہ نار میں داخل ہوتے وقت بمعنی لغوی کافر اور منکر نہ ہوگا سو ''لا یدخل النار کافر'' کہنے والے کو کیسے کافر کہتے ہو جب کہ اس کے قول میں یہ تاویل ہوسکتی ہے دیکھئے امام صاحب نے کس قدر احتیاط کی حالانکہ ایسا صریح کلمۂ کفر تھا۔[1]

اسلاف واکابر کی احتیاط

سلف نے اس بارہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے یہی حالت ہمارے اساتذہ اور مشائخ اور بزرگوں کی تھی کہ کسی کو کافر کہنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے، میں نے ایک حکایت ایک کتاب میں دیکھی اور اس کو دیکھ کر مجھے بڑا غصہ آیا اور اس کا حکم فوراً ذہن میں یہی آیا کہ یہ شخص کافر ہوگیا، اور فوراً حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے پاس گیا کہ دیکھئے حضرت! اس شخص کے کفر میں کیا کلام ہے؟ وہ حکایت یہ ہے کہ ایک شیخ نے اپنے مرید سے پوچھا کہ تو خدا کو جانتا ہے؟ اس نے کہا جی میں کیا جانوں خدا کو، میں تو آپ کو جانتا ہوں، یہ کس قدر بے ہودہ کلمہ ہے یہ شخص خدا کا انکار کرتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ پیر کو سمجھتا ہے تو اس کے کفر میں کیا کلام ہے۔

مولانا ہنسے اور کہا: کیا اس لفظ کے کوئی صحیح معنی نہیں ہوسکتے؟ میں نے کہا حضرت! اس کے کیا معنی ہوسکتے ہیں جب ایک شخص خدا ہی کو جاننے کا منکر ہے تو اس کا ایمان کہاں؟ فرمانے لگے اچھا، تم جانتے ہو خدا کو؟ بتلاؤ اللہ میاں کیسے ہیں؟ بس یہ سوال کرنا تھا، اب تو ہوش درست ہوگئے، میں حقیقت کو سمجھ گیا کہ مطلب (تاویل) یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت بلا واسطہ مجھ کو نہیں ہے بلکہ مجھے شیخ کے ذریعہ سے حاصل ہوئی اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔

(مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا) بھائی خدا کو جاننا تو بڑا مشکل ہے وہ کون

---

[1] الاسلام الحقیقی ص ۴۵۶

شخص ہے جو دعویٰ کرے کہ میں خدا کو جانتا ہوں، یہی تو وہ مسئلہ ہے جس میں تمام فلاسفر گمراہ ہوگئے اور ہزاروں اب بھی گمراہ ہیں، جو حق پر ہیں وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا تعالیٰ کو اجمالاً کچھ پہنچانتے ہیں، باقی جس کا نام علم اور جاننا اور پہچاننا ہے اس کی تو خیر صلاً ہے یہی بات تو وہ شخص بھی کہتا ہے کہ میں خدا کو کیا جانوں، میں تو تم کو جانوں، یعنی خدا کا راستہ بتلانے والے کو، تو وہ کیا بے جا کہتا ہے پھر بے چارے کو کیوں کافر بناتے ہو، دیکھئے مولانا نے ایسے سخت کلمہ کو کیسے ہلکا کر دیا، ایک بعید تاویل کر کے اس کو بچالیا۔[۱]

حضرت تھانویؒ کا معمول

میرے پاس بہت فتوے آتے ہیں لوگ پوچھتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کلمہ کہا ہے اس میں کفر عائد ہوا یا نہیں، میں اکثر یہ جواب دے دیتا ہوں کہ یہ کلمہ گستاخی کا ہے یہ شخص بہت بے ادب ہے اس نے بڑا گناہ کیا مگر کفر نہیں، کفر کا نام لیتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی کو کافر کہنا حق تعالیٰ کی رحمت سے بالکل نکال دینا ہے اور حق تعالیٰ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔[۲]

تکفیر کے مسئلہ میں اس درجہ احتیاط کی وجہ

کفر بہت بڑا حکم ہے کسی کے لئے کفر ثابت کر دینے کے یہی معنی ہیں کہ اس کو ابدالآباد کے لئے رحمت خداوندی سے مایوس اور محروم بنا دیا جائے اور ہمیشہ ہمیش کی تکالیف اور عذاب اس کے لئے ثابت ہو جائیں، کسی کو کافر کہنا حق تعالیٰ کی رحمت سے بالکل نکال دینا ہے اور حق تعالیٰ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔

اس کا پتہ اس حدیث سے چلتا ہے، بڑی عبرت کی حدیث ہے اور وہ

[۱] الاسلام الحقیقی ص ۴۵۶ المرابطہ ص ۸۴ [۲] الاسلام الحقیقی ص ۴۵۸

مشہور حدیث شفاعت کی ہے اس سے ہم لوگوں کو سبق لینا چاہئے اور ذرا زبان اور قلم کو قابو میں رکھنا چاہئے وہ حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن جب شفاعت کی اجازت ہوگی تو سب علی قدر مراتب شفاعت کریں گے، انبیاء علیہم السلام بھی کریں گے اور امتی بھی جب سب کی شفاعت ختم ہوجائے گی تو حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ انبیاء بھی شفاعت کر چکے اور ملائکہ بھی کر چکے، اب ارحم الراحمین باقی ہیں، یہ فرما کر دولپ بھر کر دوزخیوں کو جنت میں داخل کر دیں گے۔۔۔۔۔۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بہت سے ان دوزخیوں کو جہنم سے نکالیں گے جن کو نہ امتیوں کی شفاعت پہونچی ہوگی، نہ ملائکہ کی، نہ انبیاء علیہم السلام کی، اور اسی حدیث میں یہ لفظ بھی ہے اَخرِجُوْ امِنَ النَّارِ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ مِّنْ اِیْمَان یعنی انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کو حکم ہوگا کہ دوزخ سے اس شخص کو بھی نکال لو جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو۔

ان دونوں کے ملانے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ شفاعت سے رہ گئے تھے ان میں ذرہ برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔

تو اب اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ لوگ مومن ہوں گے یا کافر؟ اگر کافر ہوں گے تو ان کی مغفرت بعد میں بھی کیسے ہوگی کیوں کہ کافر کی مغفرت ممتنع ہے اور اگر مومن ہیں تو کسی شفاعت کرنے والے نے مؤمنین نے یا ملائکہ نے یا کسی نبی نے کیوں شفاعت نہیں کی، جب کہ یہ حکم ہوا تھا کہ جن کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے ان کو بھی نکال لیا جائے۔

اس اشکال کا جواب یہی ہے کہ یہ شق تو باطل ہے کہ وہ کفار ہوں کیونکہ کافر کی بخشش نہیں ہوسکتی بلکہ وہ مومن ہی ہوں گے لیکن ان کا ایمان اتنا ضعیف اور اس قدر مخفی ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کے ادراک میں بھی نہ آئے گا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو علم کامل عطا فرمایا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ بعض کا ایمان ایسا ضعیف بھی ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم

السلام کو بھی اس کا پتہ چلنا مشکل ہے، پھر مولویوں کو کیسے پتہ چل جائے گا، اور عوام تو کسی شمار ہی میں نہیں۔ اس لئے بات بات پر کسی پر کفر کا فتویٰ لگا دینا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ یہ تو حق تعالیٰ کی رحمت کو تنگ کر دینا ہے۔[1]

انتظاماً للشریعہ کفر کا فتویٰ دینا

ایک مرتبہ حضرت گنگوہیؒ کے یہاں اہل باطل کی تکفیر کا ذکر تھا فرمایا: کیا کافر کافر لئے پھرتے ہو، قیامت میں دیکھو گے ایسوں کی مغفرت ہوگی جنہیں تم دنیا میں قطعی کافر کہتے ہو اور واقع میں وہ کافر نہ ہوں گے مگر نہایت ضعیف الایمان ہوں گے۔

پھر فرمایا: لیکن اگر ڈرانے دھمکانے کیلئے شرعی انتظام کے لئے کسی وقت کافر کہہ دیا جائے اس کا مضائقہ نہیں، اس میں انتظامی شان کا ظہور ہو گیا۔[2]

لَانُکَفِّرُ اَھْلَ الْقِبْلَۃِ کی تشریح

ننانوے وجوہ کفر پر ایک وجہ ایمان کی ترجیح کا مطلب

فقہاء کا جو یہ حکم ہے کہ اگر کسی میں ننانوے وجوہ کفر کے اور ایک وجہ ایمان کی ہو تو ان ننانوے وجوہ کا اعتبار نہ کیا جائے گا اور اس ایک وجہ کا اعتبار کیا جائے گا، اس کا مطلب لوگ غلط سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ صرف ایمان کی ایک بات کا ہونا کافی ہے بقیہ ننانوے باتیں کفر کی ہوں تب بھی وہ مزیل ایمان نہ ہوں گی حالانکہ یہ غلط ہے۔

اگر کسی میں ایک بات بھی کفر کی ہوگی تو وہ بالاجماع کفر ہے۔

بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر کسی کلام میں ننانوے محمل کفر کے ہوں اور صرف ایک محمل ایمان کا ہو تو اس پر ایمان ہی کا حکم لگایا جائے گا نہ کہ کفر کا کیونکہ ایمان کا کم از کم ایک احتمال تو ہے۔

[1] الاسلام الحقیقی ملحقہ محاسن اسلام ص ۴۵۹ [2] الافاضات الیومیہ ص: ۹۰ ج ۱

یہ معیار کسی کی تکفیر کے لئے مقرر کیا گیا ہے کہ ایمان کے ادنیٰ سے ادنیٰ احتمال کے ہوتے ہوئے کسی کی تکفیر نہ کریں اور متکلم کی ذات کے اعتبار سے (یہ حکم ہے کہ) اگر وہ ایک محمل کفر کا بھی معتقد ہوگا تو وہ کافر ہوگا۔[1]

مطلب یہ ہے کہ ننانوے وجوہ سے مراد کلمۂ کفریہ کی تفسیریں ہیں۔

یعنی کسی کلمہ کے معنی میں سو احتمالات ہوں جن میں ننانوے تفسیریں تو موجب کفر ہوں اور ایک تفسیر موجب کفر نہ ہو تو اس کو کافر نہیں کہیں گے اگر یہ (تشریح اور مطلب) مراد نہ لیا جائے تو دنیا بھر کے کافر مسلمان ہی ہوں گے کیوں کہ ان میں اسلام کی بھی تو کچھ باتیں ضروری ہی پائی جاتی ہیں۔[2]

جس شخص میں کفر کی کوئی وجہ قطعی ہوگی (اس کو) کافر کہا جائیگا اور حدیثیں مـــن صلیٰ صلوٰتنا الخ من قال لاالٰہ الااللہ دخل الجنۃ وغیرہ) اس شخص کے بارے میں ہیں جن میں کوئی وجہ قطعی (کفر کی) نہ ہو، اور اس مسئلہ کے یہ معنی ہیں کہ اگر کوئی امر قولی یا فعلی ایسا ہو کہ محتمل کفر وعدم کفر دونوں کو ہو، گو احتمال کفر غالب اور اکثر ہو تب بھی تکفیر نہ کریں گے، نہ یہ کہ تکفیر قطعی پر بھی تکفیر نہ کریں گے کیوں کہ کافر کے یہ معنی نہیں کہ اس میں تمام وجوہِ کفر کی جمع ہوں ورنہ جن کا کفر منصوص ہے وہ بھی کافر نہ ہوں گے۔[3]

مزید توضیح

سوال ۴۹۸: مشہور ہے کہ اگر کسی شخص میں ننانوے وجہ کفر کی ہوں اور ایک وجہ اسلام کی تو اس پر کفر کا فتویٰ دینا نہ چاہئے تو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بہت سے کلمات کو کفر کیلئے وضع کیا ہے تو پھر کلمات کفر کو کفر کیلئے وضع کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر محض زجر مقصود ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ فی زماننا بڑے بڑے عالم بعض لوگوں کو ذرا ذرا سی بات پر بلکہ حقیقت میں کلماتِ کفر کے ارتکاب پر کفر کا فتویٰ دیتے ہیں، اس فتویٰ کو کس پر محمول کرنا چاہئے؟

[1] الافاضات الیومیہ ص:۳۴۱ ج ۲ [2] حسن العزیز ملخصاً ص:۶۰۲ ج ۳ [3] امداد الفتاویٰ ص:۳۸۶ ج ۵

الجواب: اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر ننانوے باتیں کفر کی موجب پائی جاویں تب بھی فتویٰ نہ دیں گے، ننانوے تو بہت ہوتی ہیں اگر ایک امر بھی موجب کفر یقینی پایا جائے تب بھی فتویٰ دیدیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ خود اس امر میں بہت سے احتمال ہیں بعض احتمالات پر تو وہ موجب کفر ہے اور وہ احتمالات ننانوے ہیں ،اور بعض احتمال پر وہ موجب کفر نہیں اور وہ ایک ہے تو اس صورت میں اس امر کو محمول اسی احتمال پر کریں گے جو موجب کفر نہیں اور تکفیر سے احتیاط کریں گے۔[1]

کافر کو کافر کہنا

کسی کا نام لے کر کافر کہنا یا لعنت کرنا بڑا گناہ ہے، ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ظالموں پر لعنت، جھوٹوں پر لعنت، مگر جن کا نام لے کر اللہ ورسول نے لعنت کی ہے یا ان کے کفر کی خبر دی ہے، ان کو کافر ملعون کہنا گناہ نہیں۔[2]

کافر کو کافر کہنا چاہئے یا نہیں؟

کاندھلہ میں ایک مرتبہ مولویوں کے مجمع میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ کافر کو کافر کہنا کیسا ہے؟ ایک جماعت یہ کہہ رہی تھی کہ تہذیب کے خلاف ہے اور ایک جماعت کہہ رہی تھی کہ جائز ہے کیونکہ قرآن میں بکثرت کافر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ،پہلی جماعت نے اس کا یہ جواب دیا کہ قرآن میں خطاب کے موقع میں کافروں کو کافر نہیں کہا گیا (بلکہ یاایھاالناس سے خطاب کیا گیا ہے) اور گفتگو اس میں ہے کہ کافروں کو کافر کہہ کر خطاب کرنا کیسا ہے۔

پھر ایک مولوی صاحب کو حکم بنایا گیا کہ اس اختلاف کا فیصلہ کریں انہوں نے کہا کہ کافروں کو کافر کہا گیا ہے قُلْ یَاایُّھَا الْکَافِرُوْنَ۔

---

[1] امداد الفتاویٰ ص ۳۹۳ ج ۴ [2] تعلیم الدین ص: ۲۴۵

مگر میں اس محاکمہ کا محاکمہ کرتا ہوں کہ قرآن میں کفار کو کافر کہہ کر بلاضرورت خطاب نہیں کیا گیا اور جہاں اس لفظ سے خطاب کیا گیا ہے وہاں ضرورت تھی، وہ یہ کہ ان ظالموں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بے ڈھنگی درخواست کی تھی کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کرلیا کریں ایک سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کرلیا کریں گے اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی کہ ان سے فرمادیجئے کہ اے کافرو! میں تمہارے معبودوں کی پرستش نہ کروں گا، نہ تم میرے معبود کی عبادت کروگے نہ اب نہ آئندہ تو یہاں ان لوگوں کی امیدیں قطع کرنے کیلئے سختی کے ساتھ کافر کہہ کرانکو خطاب کیا گیا ہے، باقی آیات میں اس لفظ سے خطاب نہیں کیا گیا، کیونکہ ضرورت نہ تھی پس فیصلہ یہ ہوا کہ خشن (سخت) خطاب بلاضرورت نہ کرنا چاہئے ہاں ضرورت سے ہوتو جائز ہے۔[1]

مسلمان کو کافر کہنے والا کافر ہوگا یا نہیں؟

میں تو کبھی ایسے شخص کو کافر نہیں کہتا جو مجھے کافر کہے کیونکہ کہ کسی مسلمان شخص کو کافر کہنا عقیدہ کی تو معصیت اور فسق ہے مگر کفر نہیں۔[2]

اگر کوئی ہم کو کافر کہے

فرمایا: ہمارے یہاں یہ سکھایا گیا ہے کہ جب تم کو کوئی کافر کہے تو لا الٰہ الا اللہ پڑھ دو، ہمارے حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں عنداللہ مومن ہوں تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔[3]

علماء اہل فتویٰ کو مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ کون مسلم ہے کون کافر، کون صالح، کون فاسق، کسی معین شخص کیلئے ایسا حکم کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔[4]

---

[1] حقیقت تصوف وتقویٰ، وعظ المرابطۃ ص: ۶۷ [2] الافاضات الیومیہ ص: ۲۰ ج ۸
[3] مزید المجید ص ۲۵ [4] مجالس حکیم الامت ص: ۱۰۸

بریلویوں کی تکفیر میں حضرت تھانویؒ کی احتیاط

ہم ان کو (بریلی والوں یعنی رضا خانیوں کو) کافر نہیں کہتے اگر چہ وہ ہمیں (کافر) کہتے ہیں، ہمارا تو مسلک یہ ہے کہ کسی کو کافر کہنے میں بڑی احتیاط چاہئے، اگر کوئی حقیقت میں کافر ہے اور ہم نے نہ کہا تو کیا حرج ہوا۔

اور اگر ہم نے کافر کہا اور حقیقتِ حال اس کے خلاف ہے تو یہ بہت خطرناک بات ہے، ہم تو قادیانیوں کو بھی کافر نہ کہتے تھے اور وہ ہمیں کہتے تھے، ہاں اب ثابت ہوگیا (قادیانی) مرزا صاحب کی رسالت کے قائل ہیں تب ہم نے کفر کا فتویٰ دیا ہے۔ کیوں کہ یہ تو کفر صریح ہے اس کے سوا ان کی تمام باتوں کی تاویل کرلیا کرتے تھے گو وہ تاویلیں بعید ہی ہوتی تھیں۔

ہم بریلی والوں کو اہل ہویٰ کہتے ہیں اور اہل ہویٰ کافر نہیں۔

حضرت والا کا یہ طرز عمل سلف کے موافق ہے کہ انہوں نے معتزلہ تک کو کافر کہنے میں احتیاط کی ہے اگر چہ ان کے عقائد صریح کفر کے (بھی) ہیں، لیکن سلف نے احتیاطاً یہ اصول رکھا ہے **لانکفّر اهل القبلة** (ہم اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کرتے) اور ان کے معاملہ کو حق تعالیٰ کے سپرد رکھا اور ان کے اقوال کے لئے ایک کلی تاویل کرلی کہ متمسک (ماخذ) اپنا وہ بھی قرآن وحدیث ہی کو کہتے ہیں گو تمسک میں غلطی کرتے ہیں، تو ان کا کفر لزومی ہوا نہ کہ کفر صریح۔

ایک مرتبہ حضرت والا سے ایک مولوی صاحب نے یہی گفتگو کی کہ ہم بریلی والوں کو کافر کیوں نہ کہیں؟

فرمایا کہ کافر کہنے کے واسطے وجہ کی ضرورت ہے نہ کہ کافر نہ کہنے کے لئے تو وجہ آپ بتلایئے کہ کیوں کہیں؟ مولوی صاحب نے بہت سی وجوہات پیش کیں اور حضرت والا نے سب کی تاویل کی گو بعید تاویلیں تھیں۔

بالآخر مولوی صاحب نے کہا کہ اگر کچھ وجہ نہ ہو تو کیا یہ کافی نہیں کہ وہ ہم کو کافر کہتے ہیں، اور یہ ثابت ہے کہ مسلمان کو کافر کہنے والا کافر ہے بس اگر ہم اپنے آپ کو مسلمان جانتے ہیں اور وہ ہم کو کافر کہتے ہیں تو ہم کو یہ بات ماننی چاہئے کہ کفر لوٹ کر انہیں پر پڑتا ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ ہمیں اپنے اسلام میں شک ہے۔

فرمایا: غایت سے غایت تمام دلیلوں کا نتیجہ یہ ہے کہ کفر لزومی ہے، کفر صریح تو نہ ہوا، پس اگر واقع میں کافر ہوں اور ہم نہ کہیں تو کیا ہم سے قیامت کے دن باز پرس ہوگی؟ اور اگر ہم کافر کہیں تو کتنی رکعات کا ثواب ملے گا؟ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تضییع وقت ہے اور بھی تو بہت کام ہیں۔

مگر سوال نماز کے متعلق ہوسکتا ہے (کہ ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں، کیوں کہ) اس کے لئے تکفیر مسلم کا شبہ ہی کافی علت ہے اقتداء کے عدم جواز کی، تو اس کا جواب ہے الیقین لایزول بالشک (یعنی یقین شک سے زائل نہیں ہوتا) جب مومن ہونے کا یقین تھا اور کفر ہونے میں شک ہے تو محض شک کا اعتبار نہ کیا جائے گا، اور شک کی وجہ سے اس کو کافر نہ کہا جائے گا، اس لئے ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا درست ہوگا)

ایک شخص نے پوچھا کہ ہم بریلی والوں کے پیچھے نماز پڑھیں تو نماز ہو جائے گی یا نہیں، فرمایا، ہاں۔[1]

کسی کافر فرقہ کی طرف اپنے کو منسوب کرنا بھی موجب للکفر ہے

تکفیر کے دو درجے

تکفیر کے دو درجے ہیں ایک فی ما بینہ و بین اللہ یعنی جو معاملات عبد اور حق تعالیٰ

---

[1] ملفوظات کمالات اشرفیہ ص ۳۸۴

کے درمیان ہیں ان کا مدار تو کفر باطنی پر ہے جس کا بالتعیین کسی پر حکم نہیں لگایا جاسکتا اور دوسرا درجہ احکام ظاہرہ کے اعتبار سے ہے اس کا مدار قوانین خاصہ پر ہے جو علماء کے کلام میں مدون ہیں اس درجہ میں احتمالات غیر ناشی عن دلیل ملحوظ نہیں ورنہ کسی کافر پر جہاد تک بھی جائز نہ رہے کیونکہ احتمال ہے کہ یہ دل میں مومن ہو اور اظہار کفر میں اس کے پاس کوئی واقعی عذر ہو، اور ظاہر ہے کہ اس میں کس قدر خلط اور خبط لازم آتا ہے۔[1]

کفر کی دو قسمیں کفر اجمالی، کفر تفصیلی

ایمان ایک اجمالی ہے ایک تفصیلی اور دونوں مدار احکام ہیں، اسی طرح کفر بھی ایک اجمالی ہے ایک تفصیلی اور دونوں مدار احکام ہیں، پس جیسا فرقۂ اسلامیہ کی طرف اپنے کو نسبت کر دینا موجب حکم بالا یمان ہے گو ایک ایک عقیدۂ اسلامیہ کی تفصیل نہ کرے، اسی طرح کسی فرقۂ کفریہ کی طرف اپنے کو نسبت کر دینا موجب حکم بالکفر ہے، گو ایک ایک عقیدۂ کفریہ کی تفصیل نہ کرے آگے ایک ضعیف سوال رہ جاتا ہے کہ اگر ایسے فرقہ کی طرف اپنے کو منسوب کرے جس کے کچھ عقائد اسلامیہ ہوں کچھ کفریہ، اس کا کیا حکم ہوگا، سو قواعد سمعیہ وعقلیہ اس پر متفق ہیں کہ مجموعہ ایمان وکفر کا کفر ہی ہے وَقَدْ صَرَّحَ فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلاً اُولٰئِکَ ھُمُ الْکَافِرُوْنَ حَقًّا ورنہ دنیا میں ایسا کوئی کافر نہ نکلے گا جسکا ہر عقیدہ کفریہ ہی ہو، کثرت سے کافر صانع کے قائل ہیں، کثرت سے معاد کے قائل ہیں اور جو کہا جاتا ہے کہ اگر ننانوے وجوہ کفر کی ہو اور ایک ایمان کی تو ایمان کا حکم کیا جائے گا اس سے مراد کسی ایک ہی قول یا فعل کے وہ وجوہ ہیں جن میں دونوں احتمال ہیں جیسے ایک کلام کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔[2]

---

[1] حکیم الامت، نقوش وتاثرات ص:۲۶۶ [2] حکیم الامت، نقوش وتاثرات ص:۲۶۶

کفر اختلافی کا حکم

کفر اختلافی میں کفر کا یا بینونۃ زوجہ کا فتویٰ دیا جائے گا، البتہ احتیاطاً تجدید اسلام وتجدید نکاح کیا جائے گا اور اس تجدید کے لئے حلالہ کی ضرورت نہیں۔

فی الدر المختار وارتد احدھما ای الزوجین فسخ فلاینقص عددا عاجل بلا قضاء (مع الشامی ص ۶۴۳ ج ۱) وفی الشامی تحت قولہ فلاینقص عددا فلو ارتدمرارا وجددالاسلام فی کل مرۃ جددالنکاح علی قول ابی حنیفۃ کل امراتہ من غیر اصابۃ زوجہ ثان بحر عن الخانیۃ نیز چونکہ تجدید نکاح کا حکم احتیاط کے سبب ہے اگر وہ اس پر راضی نہ ہو تب بھی اس کی زوجہ کو دوسرے سے نکاح جائز نہ ہوگا، البتہ معصیت ہونے کی صورت میں توبہ واجب ہوگی، کما سبق۔[1]

اگر کسی جماعت کے کفر میں تردد یا اختلاف ہو تو کیا حکم ہے؟

اگر کسی خاص شخص کے متعلق یا کسی خاص جماعت کے متعلق حکم بالکفر میں تردد ہو خواہ تردد کے اسباب علماء کا اختلاف ہو، خواہ قرائن کا تعارض ہو یا اصول کا غموض ہو تو اسلم یہ ہے کہ نہ کفر کا حکم کیا جائے نہ اسلام کا، حکم اول میں تو خود اس کے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے اور حکم ثانی میں دوسرے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے، پس احکام میں دونوں احتیاطوں کو جمع کیا جائے گا یعنی نہ اس سے عقد مناکحت کی اجازت دیں گے نہ اس کی اقتداء کریں گے نہ اس کا ذبیحہ کھائیں گے اور نہ اس پر سیاسیات کافرانہ جاری کریں گے، اگر تحقیق کی قدرت ہو تو اس کے عقائد کی تفتیش کرلیں گے اور اس تفتیش کے بعد جو ثابت ہو ویسے احکام جاری کریں گے، اور

[1] امداد الفتاویٰ مسائل شتیٰ ص: ۵۹۵ ج ۴

اگر تحقیق کی قدرت نہ ہو تو سکوت کریں گے اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیں گے اس کی نظیر وہ حکم ہے جو اہل کتاب کی مشتبہ روایات کے متعلق حدیث میں وارد ہے۔

لاتصدقوا اهل الکتاب ولاتکذبوهم وقولوا آمنا بالله وما انزل الینا۔[1]

دوسری فقہی نظیر احکام خنثیٰ کے ہیں: **یوخذفیه بالأحوط والأوثق فی أمورالدین وأن لایحکم بثبوت حکم وقع الشک فی ثبوته، واذاوقف خلف الامام قام بین صف الرجال والنساء ویصلی بقناع ویجلس فی صلاته جلوس المرأة، ویکره له فی حیاته لبس الحلی والحریر وان یخلوبه غیر محرم من رجل او امرأة اویسافر من غیر محرم من الرجال وان مات لم یغسله رجل ولا امرأة وتیمم بالصعید ویکفن کما یکفن الجاریة'' وامثالها کمافصله الفقهاء**[2]

جن کے کفر میں اختلاف ہے ان سے نکاح درست ہوگا یا نہیں

(اس کی کئی صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ) جیسے عورت مسلمان ہو اور مرد غیر مسلم ہو، خواہ یہودی ہو یا نصرانی، اس کا حکم ظاہر ہے کہ نکاح صحیح نہ ہوگا۔

دوسری صورت جیسے عورت سنیہ ہو اور مرد مبتدع ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کی بدعت حد کفر (وشرک) تک پہنچ جائے مثلاً اس زمانہ میں مرزا کی نبوت کا قائل ہونا (قادیانی ہونا) تو اس شخص کا حکم بھی پہلی قسم کی طرح ہے یعنی ایسے شخص سے سنی عورت کا نکاح جائز نہیں۔

اور اگر اس کی بدعت حد کفر وشرک تک نہیں پہنچی تو وہ شخص مسلمان تو ہے لیکن سنیہ (عورت) کا کفو نہیں۔[3]

---

[1] رواہ البخاری [2] النور ۹ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ امداد الفتاویٰ، ص: ۸۵۶، ج ۲
[3] حکیم الامت، نقوش وتاثرات ص: ۲۷۱

ایک صورت اس میں اور بھی ہے وہ یہ کہ بعض بدعتی فرقوں کے کفر میں علماء کا اختلاف ہے سو کافر قرار دینے والوں کے نزدیک تو سنیہ کا نکاح ایسے شخص سے باطل ہے اور غیر مکفرین کے نزدیک یہ نکاح غیر کفو میں ہے۔

احقر کا معمول اس مختلف فیہ صورت میں فتویٰ دینے کا یہ ہے کہ جب تک نکاح نہ ہوا ہو، بطلانِ نکاح کے قول پر عمل لازم ہے، کیونکہ اس میں احتیاط ہے کہ ایک اچھے عقیدہ والی عورت بداعتقاد مرد سے متعلق ہو اور بداعتقادبھی ایسا جس کی بداعتقادی بعض کے نزدیک حد کفر تک پہنچی ہے، اور جب نکاح ہو چکا تو صحت نکاح کے قول کو اخذ کرنا لازم ہے کیونکہ اب اسی میں احتیاط ہے، کیونکہ اگر اس صورت میں بطلان کا قول لیا جائے اور اس بناء پر دوسرے سے نکاح کر دیا جائے تو احتمال ہے کہ وہ پہلا نکاح صحیح ہو گیا ہو تو یہ دوسرا عقد ہمیشہ کے لئے زنا ہوا کرے گا، تو ایک دیندار عورت کا عمر بھر کے لئے زنا میں مبتلا ہونا لازم آئے گا، اور صحتِ نکاح کے قول پر اس احتمال کا اعتبار نہیں کیا گیا۔[1]

قادیانی یقیناً کافر ہیں اگرچہ توحید و رسالت کے قائل اور نماز پڑھتے ہیں

مرزا کے اقوال کے دیکھنے کے بعد اس کے بقاءِ اسلام کے قائل ہونے کی کچھ گنجائش نہیں چنانچہ خود مرزا کے رسائل میں وہ اقوال بکثرت موجود ہیں جن میں تاویل کرنا ایسا ہی ہے جیسے بت پرستی کو اس تاویل سے کفر نہ کہا جائے کہ توحید وجودی کی بنا پر یہ شخص غیر خدا کا عابد نہیں۔

اب رہ گئے اس کے پیرو تو قادیانی پارٹی تو ان کے اقوال کو بلا تامل مانتے ہیں ان پر بھی حکم بالا اسلام کی کچھ گنجائش نہیں اور جب ان سے نفی اسلام کی ثابت ہو چکی تو

[1] اصلاح انقلاب ص۱۳ ج۲

ان کے ساتھ کوئی معاملہ اہل اسلام کا کرنا جائز نہ ہوگا۔

قادیانی قطعیات کے مکذب ہیں۔[1]

اب تو یہاں تک نوبت آ گئی ہے کہ لوگوں کو اس پر شبہ ہوتا ہے کہ قادیانی تو اپنے کو مسلمان کہتا ہے پھر علماء اس کو کافر کیوں کہتے ہیں، خوب سمجھ لو کہ اس کا اپنے کو مسلمان کہنا ایسا ہے جیسے مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنے کو مسلمان کہتا تھا ،نماز پڑھتا تھا حضور کی رسالت کی تکذیب نہ کرتا تھا، بلکہ صرف اپنی رسالت کا دعویٰ بھی کرتا تھا کہ جیسے یہ رسول ہیں ایسا ہی میں بھی رسول ہوں۔[2]

مسئلۂ تکفیر سے متعلق چند کوتاہیاں اور ضروری ہدایات

(ماخوذ از اصلاح انقلاب)

کفر کا فتوی دینے میں بے اعتدالی اور کوتاہی

اس میں بھی یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ذرا تدبیر سے کام نہیں لیتے ،قائل کے قول کا کوئی محمل صحیح نہیں سوچتے ، بس مفتی صاحب کو جو بات ناگوار ہوئی فوراً کفر کا فتویٰ لگا دیا، بلکہ بعض اوقات محمل صحیح سمجھ میں بھی آ جاتا ہے پھر بھی اس کو ذہن سے دفع کر کے اپنا غیظ نکالتے ہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ بیچارہ قائل وجہ کفر کا خود انکار کر رہا ہے اور محمل صحیح کی تصریح کر رہا ہے مگر جب بھی اس کو معافی نہیں دی جاتی، تکفیر ہی کی سزا اس کے لیے بحال رہتی ہے، حالانکہ حدیث میں تصریح ہے، **لاَ تُـكَـفِّـره بذنب وَلاَ تُخْرِجه عَن الإسلام.** (ابو داؤد)

اور فقہاء نے فرمایا ہے کما فی ردالمختار عن الخلاصۃ:

اذا كان فى المسئلة وجوه يوجب التكفير ووجه واحدٌ يمنعه فعلى

[1] امداد الفتاویٰ ص ۵۹، وص ۱۰۹ ج ۶ [2] ملفوظات حکیم الامت ص ۱۹ ج ۴ قسط ۳

المفتی (ای یجب علیه) ان یمیل الی الوجه الذی یمنع التکفیر تحسنا للظن بالمسلم، زاد فی البزّازیة الا اذا صرح بارادة موجب الکفر فلا ینفعه التاویل، والذی تحرر انه لا یفتی بکفر مسلم أمکن محمل کلامه علی محمل حسن او کان فی کفره اختلاف ولو روایة ضعیفة من البحر. (٣/٤٤٠)

یعنی جب کسی مسئلہ میں بہت سی وجوہ ہوں جو کفر ثابت کرتی ہیں اور ایک وجہ کفر کی نفی کی ہوتو مفتی پر واجب ہوجاتا ہے کہ اس وجہ کی طرف میلان اختیار کرے جو کفر کی نفی کرتی ہے مسلمان کے ساتھ حسن ظن اختیار کرتے ہوئے۔

بزازیہ میں یہ عبارت زیادہ کی ہے کہ مگر جب اس شخص نے ایسے ارادے کی صراحت کردی جو کفر ثابت ہی کردیتا ہے تو اس وقت اسے تاویل نفع نہ دے گی، اور طے شدہ امر اور فیصلہ کن بات یہ ہے کہ جس کسی مسلمان کے کلام کو اچھے معنی پر محمول کرنے کا امکان ہو، یا اس کے کفر میں اختلاف ہوا گرچہ ضعیف روایت کے مطابق ہو اس کے کفر کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا، جیسا کہ بحرالرائق جلد ۳، ص: ۴۴۰ پر ہے۔

بلا تحقیق کفر کے فتووں کا انجام

اوران مکفّرین کی جرأت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ عوام سے گذر کر خواص یعنی علماء تک کو اپنی تکفیر کا نشانہ بناتے ہیں، اوران سے گذر کر اخصّ الخواص یعنی عارفین تک بھی پہنچتے ہیں، اور ماشاء اللہ جن اقوال کی بناء پر تکفیر کرتے ہیں وہ ایسے دقیق ہوتے ہیں کہ ان مکفّرین کا طائر ذہن بھی وہاں نہیں پہنچتا، یا دقیق نہیں ہوتے مگر ناشی ایسے احوال سے ہوتے ہیں جن کی ہوا تک بھی ان محبوسان الفاظ و رسوم کو نہیں لگی تو ان کی تکفیر کرنا بالکل اس آیت کا مصداق ہوتا ہے۔

قال تعالیٰ: بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيْلُهٗ. (یونس آیت:۳۹)

(بلکہ ایسی چیز کی تکذیب کرنے لگے جس کے (صحیح وسقیم ہونے کو) اپنے احاطۂ علمی میں نہیں لائے اور ہنوز ان کو اس کا آخری نتیجہ نہیں ملا)۔

وقال تعالیٰ:

وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ.[1]

(اور جب ان لوگوں کو قرآن سے ہدایت نصیب نہ ہوئی تو یہی کہیں گے کہ یہ قدیمی جھوٹ ہے)۔

ولنعم ما قیل ؎

وکم من عائب قولاً صحیحاً

وآفته من الفهم السقیم

(اور کتنے لوگ ہیں جو درست بات میں عیب نکالنے والے ہیں، اور اس کی مصیبت سمجھ کی بیماری ہے)۔

کیا یہ غضب اور ستم نہیں ہے کہ ہر زمانہ میں ایسوں کی تکفیر ہوئی جن کی برکت سے علوم اسلامیہ کا احیاء ہوا، اور جن کے فیض سے برکات دینیہ کا القاء ہوا۔[2]

کفر کا فتویٰ دینے کے لیے بعض شرائط

اور اگر کسی بزرگ کا کلام مأول نہ ہو سکے تو اس کی تکفیر سے یہ اسہل واسلم ہے کہ اس کلام ہی کی نسبت کا انکار کر دیا جائے۔

اور غلبۂ حال کی تاویل کے رد کرنے کے لیے بعض متقشفین عذر کو ان چند عذروں میں سمجھتے ہیں جن کو اصولیین نے بوجہ کثرت وقوع ذکر کر دیا ہے، اور اس تخصیص ذکری کو تخصیص واقعی سمجھ کر دوسرے عذروں کی نفی ہی کر دی، حالانکہ ان میں عذر منحصر نہ ہونا خود فقہاء ہی کے کلام میں مصرح ہے۔

---

[1] الاحقاف آیت:۱۱ [2] اصلاح انقلاب

فی العالمگیریه احکام المرتدین من اصابه برسام او اطعم شیئاً فذهب عقله فهذی فارتد لم یکن ذلک ارتداداً وکذا لو کان معتوها او موسوساً او مغلوبا علی عقله بوجه من الوجوه فهو علی هذا کذا فی السراج الوهاج.

(عالمگیری احکام المرتدین میں ہے جسے سرسام کی بیماری پہنچی یا اس نے کسی چیز کو کھالیا جس کے بعد اس کی عقل چلی گئی پھر اس نے کچھ بکواس کی، پھر وہ مرتد ہوا یہ اس کا ارتداد نہیں ہوگا، اور اسی طرح اگر کوئی شخص کم عقل (پاگل) ہے یا کسی وجہ سے مغلوب العقل یا وسوسہ والا ہے تو وہ بھی اسی حکم میں ہے جیسا کہ سراج وہاج میں ہے)۔

اس عبارت میں **بوجه من الوجوه** قابل نظر ہے۔

وفی مدارج السالکین لابن القیم ۱۱۴/۱ تحت حدیث قصة القائل انا عبدک وانت ربی، وفی الحدیث من قواعد العلم ان اللفظ الذی یجری علی لسان العبد خطأ من فرح شدید او غیظ شدید ونحوه لا یؤاخذ به ولهذا لم یکن کافراً بقوله انت عبدی وانا ربک ومعلوم ان تاثیر الغضب فی عدم القصد یصل الی هذا الحال او اعظم منها اهـ

(ابن قیم سے مدارج السالکین جلد نمبر ا ص: ۱۱۴، ''**انا عبدک وانت ربی**'' کے قائل کے قصہ میں مرقوم ہے کہ قواعد علم سے یہ بات ہے کہ بندہ کی زبان پر جو لفظ سخت غصہ کی وجہ سے یا غیر معمولی خوشی یا اور کسی وجہ سے خطا صادر ہوجائے اس کا مؤاخذہ نہیں ہوتا، اسی واسطے وہ شخص کافر نہیں ہوگا، جس نے ''**انت عبدی وانا ربک**'' کہہ دیا اور معلوم ہے کہ عدم قصد میں غصہ کی تاثیر اس حد تک یا اس سے زائد تک پہنچ جاتی ہے۔

اس عبارت میں لفظ ''ونحوہ'' قابل غور ہے اور اس دوسری عبارت کے نقل کرنے میں یہ بھی مصلحت ہے کہ بعض جامدین علی الظاہر غیر متبعین للفقہاء پر بھی کہ وہ

امر تکفیر میں اور بھی شدید ہیں، حجت ہوا، کہ ان کے متبوع مسلّم کا فتویٰ ہے، اور ہم نے جو امر تکفیر میں احتیاط کرنے کو کہا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کوئی صریح کفر کا کام کرے یا صریح کفر کی بات کرے جس میں تاویل نہ ہو سکے یا ہو سکے، مگر خود وہ فاعل یا قائل اس کا انکار کرے تب بھی اس کی تکفیر نہ کی جائے۔

ہر امر میں حدود شرعیہ کا لحاظ واجب ہے

چنانچہ ایک کوتاہی اس اول کوتاہی کے مقابل اس باب میں یہ بھی ہے کہ علماء پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ذرا ذرا سی بات میں تکفیر کر دیتے ہیں، ان معترضین کے نزدیک وہ بات ذرا سی ہوتی ہے ان صاحبوں کو یہ آیت پیش نظر رکھنا چاہئے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيَاتِهِ وَرَسُوْلِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُوْنَ. لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ.

(التوبہ آیت: ۶۵-۶۶)

(اور اگر آپ ان سے پوچھیں تو کہہ دیں گے ہم تو محض مشغلہ اور خوش طبعی کر رہے تھے آپ (ان سے) کہہ دیجئے گا کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور اس کی آیتوں کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے، تم اب یہ بے ہودہ عذر مت کرو، تم اپنے کو مومن کہہ کر کفر کرنے لگے)۔

اور اوپر یہ عبارت گذر چکی ہے: **الا اذا صرح بارادة الکفر فلا ینفعه التاویل**۔ خلاصہ یہ کہ ہر امر میں حدودِ شرعیہ کا پاس واجب ہے، نہ ان کا تنابز ہو اور نہ ان سے تجاوز ہو۔ [1]

[1] اصلاح انقلاب ۲/۲۲۸ تا ۲۳۱

علمی وفقہی مکاتبت

انتخاب وترتیب

محمد زید مظاہری ندوی

باب ۶

علمی وفقہی مکاتبت (۱)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی مکاتبت میلاد النبی ﷺ کے مسئلہ میں

فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی باکمال شخصیت محتاج تعارف نہیں، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نور اللہ مرقدہ (جو حضرت گنگوہیؒ و تھانویؒ دونوں کے پیر و مرشد ہیں) کے بعد حضرت حکیم الامت نے حضرت گنگوہیؒ کی طرف مراجعت فرمائی اور انہیں کو اپنے پیر و مرشد کے قائم مقام بنایا۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اپنے پیر و مرشد کے ارشاد کے مطابق شہر کانپور میں علم دین کی نشر و اشاعت اور امت کی اصلاح و تربیت میں مصروف تھے آپ کے خطبات و مواعظ کا نہ صرف شہر کانپور بلکہ اطراف و نواحی میں بڑا چرچا تھا کانپور علاقہ میں میلاد کے نام پر دینی محفل منعقد کرنے کا بڑا رواج تھا۔

جس میں وعظ کے بعد میلاد و سلام بھی ہوتا، حضرت تھانویؒ نے حالات کے تحت اور شرعی گنجائش سمجھتے ہوئے توسع سے کام لیا اور مجالس مولود میں شرکت فرما کر احیاء سنت کی تبلیغ کو غنیمت سمجھا، حضرت گنگوہیؒ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے بیزاری و ناگواری کا اظہار فرمایا حضرت تھانوی کو جب اس کا علم ہوا تو آپ معافی کے خواستگار ہوئے اور اس کے بعد علمی و تحقیقی مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا، سنت و بدعت کے موضوع پر یہ ایسی علمی و تحقیقی دلچسپ اور مفید معلومات پر مشتمل مراسلت ہے کہ ہر صاحب علم و افتاء کے لیے اس سے واقفیت بہت ضروری ہے۔

مراسلت کی ابتداء عربی زبان سے ہوئی ہے اختصار کی وجہ سے ہم نے شروع کی مکاتبت کو حذف کر دیا ہے اور صرف علمی وفقہی مکاتبت کے حصہ کو من وعن نقل کر دیا ہے پوری مکاتبت اصل کتاب تذکرۃ الرشید صفحہ ۱۱۵، پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا مکتوب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے نام

بحضور لامع النور مخدوم ومطاع نیازمندان دامت فیوضہم وبرکاتہم

بعد تسلیم خادمانہ عرض ہے والا نامہ ۸/ذی الحجہ کو شرف صدور لایا، معزز وممتاز فرمایا، قلب حزیں کو تسلی ہوئی، اب تک اس سوچ میں تھا کہ کیا عرض کروں جواب میں تاخیر ہوئی مگر چونکہ اظہار مرض میں شرم کرنے سے معالجہ بگڑتا ہے اس لیے کچھ عرض کرنا ضروری معلوم ہوا۔

جن دو امروں کی نسبت حضور نے ارشاد فرمایا وہ بہت صحیح اور بجا ہے، فی الواقع مجھ کو ان میں ابتلاء ہوا، اب حضور کے الطاف و واخلاق کے وثوق پر دونوں امر کی نسبت بے تکلف اپنے خیالات ظاہر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، امید ہے کہ اس میں غور فرما کر جو حکم میری حالت کے مناسب ہو صادر فرمایا جاوے، خدا کی قسم میں جو کچھ لکھتا ہوں محض استشارۃً واسترشاداً لکھتا ہوں، نعوذ باللہ طالب علمانہ قیل وقال مقصود نہیں، اور میں سچے دل سے پکا وعدہ کرتا ہوں کہ بعد حصولِ شفاء قلب جس طرح حکم ہوگا اس میں ہرگز حیلہ وعذر نہ ہوگا، امید ہے کہ میری بے تکلفی کو معاف فرمایا جاوے کیونکہ بدون اظہار اپنے جمیع مافی الضمیر کے جواب شافی نہیں ہوتا۔

امر اول: شرکت بعض مجالس کی

الحمدللہ! مجھ کو نہ غلو وافراط ہے، نہ اس کو موجب قربت سمجھتا ہوں مگر توسع کسی قدر ضرور ہے اور منشاء اس توسع کا حضرت قبلہ وکعبہ کا قول وفعل ہے مگر اس کو حجت شرعیہ نہیں سمجھتا، بلکہ بعد ارشاد اعلیٰ حضرت کے خود بھی میں نے جہاں تک غور کیا اپنے فہم ناقص کے موافق یوں سمجھ میں آیا کہ اصل عمل تو محل کلام نہیں ہے البتہ تقلیدات و تخصیصات بلا شبہ محدَث (بدعت) ہیں سو اس کی نسبت یوں خیال میں آیا کہ ان تخصیصات کو اگر قربت وعبادت مقصودہ سمجھا جائے تو بلاشک بدعت ہیں اور اگر محض امور عادیہ مبنی بر مصالح سمجھا جائے تو بدعت نہیں، بلکہ مباح ہیں گو مباح کبھی بوجہ واسطہ عبادت بن جانے کے لغیرہ عبادت سمجھ لیا جائے۔

چنانچہ بہت سے مباحات کی یہی شان ہے اور میرے فہم ناقص میں تخصیصات طرق اذکار واشغال اسی قبیل سے معلوم ہوئیں جو کہ اہل حق میں بلانکیر جاری ہیں کوئی معتد بہ فرق تامل سے بھی معلوم نہ ہوا، ہاں ان تخصیصات کو کوئی مقصود بالذات سمجھنے لگے تو ان کے بدعت ہونے میں بھی کلام نہ ہوگا۔

اس کے ساتھ ایک اور خیال بھی آیا کہ گو اس صورت میں یہ بدعت اعتقادی نہ ہوگا مگر اس کا اہتمام والتزام بدعت عملی تو ہوگا لیکن خصوصیات طرق ذکر اس میں بھی ہم پلہ معلوم ہوئے۔

تیسرا اور خیال ہوا کہ اگر ایسے فہیم آدمی کے حق میں بدعت نہ ہوگا مگر چونکہ عوام کو اس سے شبہ اس کی ضرورت یا قربت کا ہوتا ہے ان کے حفظ عقیدہ کے لیے یہ واجب الاجتناب ہوگا مگر اس کے ساتھ ہی یہ احتمال ان تخصیصات اذکار میں بھی نظر آیا کہ اکثر عوام اس طریق کی خصوصیات کو بہت ضروری سمجھتے ہیں اور علماً وعملاً ان کا پورا التزام کرتے ہیں مگر ان کا خیال خواص کے فعل میں نہیں سمجھا جاتا۔

چوتھا خیال ایک اور پیدا ہوا کہ سب کچھ سہی مگر خصوصیات بعض قواعد واصول فقہ حنفی کے خلاف معلوم ہوتے ہیں مگر یہی امر ان خصوصیات اعمال واشغال میں بھی معلوم ہوا بلکہ ذکر جہر وغیرہ تو امام صاحب کے قول کے صریح خلاف ہے مگر باوجود ان سب قصوں کے جب خصوصیات طرق سلوک شائع و ذائع ہیں تو اس سے یوں سمجھ میں آیا کہ تخصیص وہی بدعت ہوگی جو عقیدتاً ہو اور التزام بھی وہی ممنوع ہوگا جس کے ترک پر شرعی حیثیت سے ملامت ہو اور عوام کا شبہ خواص کے حق میں اس عمل کو بدعت نہ بنادے گا اور بعض اصول حنفیہ کی مخالفت شرع کی مخالفت نہ سمجھی جائے گی۔

ان خیالات کے ذہن نشین ہونے سے ان خصوصیات کے انکار میں کمی پیدا ہوئی، اس کے مرتبہ فروع واصول مسائل اختلافیہ کا سا آنے لگا، مگر اس کے ساتھ ہی نہ کسی دن ان اعمال کی وقعت ذہن میں آئی نہ خود رغبت ہوئی نہ اوروں کو ترغیب دی، بلکہ اگر کبھی اس قسم کا تذکرہ آیا تو یہی کہا گیا کہ اولیٰ یہی ہے کہ خلافیات سے بالکل اجتناب کیا جائے مگر جس جگہ میرا قیام ہے وہاں ان مجالس کی کثرت تھی اور بے شک ان لوگوں کو غلو بھی تھا۔

چنانچہ ابتدائی حالت میں اس انکار پر میرے ساتھ بھی لوگوں نے مخالفت کی مگر میں نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی تین چار ماہ گذرے تھے کہ حجاز کا اول سفر ہوا، تو حضرت قبلہ نے خود ہی ارشاد فرمایا کہ اس قدر تشدد وانکار مناسب نہیں ہے جہاں ہوتا ہو انکار نہ کرو، جہاں نہ ہوتا ہو ایجاد نہ کرو، اور اس کے بعد جب میں ہند کو آیا تو طلب کرنے پر شریک ہونے لگا اور یہ عزم رکھا کہ ان لوگوں کے عقائد کی اصلاح کی جائے۔

چنانچہ مختلف مواقع ومجالس میں ہمیشہ اس کے متعلق گفتگو کرتا رہا اور جتنے امور اصل عمل سے زائد تھے سب کا غیر ضروری ہونا اور ان کی ضرورت کے اعتقاد کا بدعت ہونا صاف صاف بیان کرتا رہا حتیٰ کہ اس وقت میری رائے میں ان کا عقیدہ بعض کا عین توسط پر بعض کا قریب توسط کے آ پہنچا مگر بوجہ قدامت عادت کے عمل کے

ارتفاع کی امید نہیں ہے عدم شرکت میں اس اصلاح کی ہرگز توقع نہ تھی ایک غرض تو شرکت سے میری یہ تھی۔

دوسرے میں نے وہاں دیکھا کہ وعظ میں کم لوگ آتے ہیں اور ان مجالس میں زیادہ اور ہر مذاق اور ہر جنس کے چنانچہ ان مجالس میں مواقع ان کے پند و نصائح اور اصلاح عقائد اور اعمال کا بخوبی ملے اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی اپنے عقائد فاسدہ و اعمال سیئہ سے تائب و صالح ہو گئے بہت سے روافض سنی ہو گئے بہت سے سود خوار اور شرابی و بے نمازی وغیرہم درست ہو گئے، غرض اکثر حصہ وعظ ہوتا تھا دوسرا بیان برائے نام۔

تیسرے میں نے دیکھا کہ وہاں بدون شرکت ان مجالس کے کسی طرح قیام ممکن نہیں ذرا انکار کرنے سے وہابی کہہ دیا، درپے تذلیل وتوہین زبانی وجسمانی کے ہو گئے اور حیلہ و بہانہ ہر وقت ممکن نہیں، تو یہ ممکن ہے اور کرتا بھی ہوں کہ فیصدی نوے موقع پر عذر کر دیا اور دس جگہ شرکت کر لی اور شرکت بھی اس نظر سے کہ ان لوگوں کو ہدایت ہوگی اور یوں خیال ہوتا ہے کہ اگر خود ایک مکروہ کے ارتکاب کے دوسرے مسلمانوں کے فرائض و واجبات کی حفاظت ہو تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے تسامح کی۔

بہر حال وہاں بدون شرکت قیام کرنا قریب بمحال دیکھا اور منظور تھا وہاں رہنا کیونکہ دنیوی منفعت بھی ہے کہ مدرسہ سے تنخواہ ملتی ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ وعظ وغیرہ کے بعد تو لینے کی مطلقاً میری عادت نہیں ہے باوجود اصرار کے صاف انکار کر دیتا ہوں مگر تنخواہ ضرور لیتا ہوں اور دینی منفعت بھی میرے زعم میں تھی اور اب بھی ہے بلکہ روز افزوں ہے کیونکہ تعلیم وتدریس ووعظ وغیرہ کا سلسلہ جاری ہے، ان منافع کی تحصیل کی غرض سے منظور تھا کہ قیام کروں اور بدون شرکت قیام دشوار تھا اس ضرورت سے بھی شرکت اختیار کی لیکن ان سب اسباب وضروریات کے ساتھ بھی اگر کسی دلیل صحیح و صریح سے مجھ کو ثابت ہو جاتا کہ اس کی شرکت موجب ناراضی اللہ ورسول کی ہے تو

لاکھ ضرورتیں بھی ہوتیں سب پر خاک ڈالتا۔

بفضلہٖ تعالیٰ بہت سے منافع مالیہ کو اسی وجہ سے خیر باد کہہ چکا ہوں، توسع رائے کے اسباب اوپر معروض ہو چکے ہیں بہرحال میرے خیال میں یہ امور خلاف اولیٰ ضرور ہیں مگر بمصالح دینیہ ان کے فعل میں گنجائش نظر آتی ہے اور عوام کی اصلاح بھی ساتھ ساتھ واجب سمجھتا ہوں اور اپنی وسعت کے موافق کرتا بھی رہتا ہوں۔

اور اس کے ساتھ ایک خیال اور بھی ہوا اور وہ بہت نازک ہے وہ یہ کہ اگر یہ شرکت بالکل اللہ ورسول کی رضا کے خلاف ہے تو حضرت قبلہ کے صریح ارشاد کی کیا تاویل کی جائے بلکہ اہل علم کے اعتقاد وتعظیم وتعلق وارادت سے عوام کا ایہام ہے۔

اس سے ہنڈ پھر کر یہی اطمینان ہوتا ہے کہ شرعاً گنجائش ضرور ہے۔

یہ خلاصہ میرے خیالات وحالات کا تھا اب حضور جیسا ارشاد فرمائیں اگر اس میں بالکل گنجائش نہیں ہے، تو میں آج ہی تعلق ملازمت کو قطع کردوں گا رازق حقیقی سبحانہ تعالیٰ ہے قیامت میں کوئی کام نہ آئے گا۔

مگر اس صورت میں حضرت قبلہ وکعبہ کے ساتھ کیسا تعلق رکھنا چاہئے اور حضرت کے قول وفعل کو کیا سمجھنا چاہئے اور اگر تھوڑی بہت گنجائش ہو خواہ عموماً یا خاص میری حالت جزئی کے مصلحت سے تو اس گنجائش سے تجاوز نہ کیا جائے گا اور اگر اس کے کتمان کا حکم ہوگا تو انشاء اللہ تعالیٰ عمر بھر اس کا انتساب حضور حضرت کی طرف میری زبان وقلم سے نہ نکلے گا۔

غرض جس طرح حضور کا ارشاد ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ بسر وچشم منظور ہوگا اور شاید کچھ شبہ پیدا ہو تو بے تکلف اس کے مکرر پیش کردینے کی اجازت کا خواہاں ہوں۔

اشرف علی

جواب از حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفا عنہ

بعنایت فرمائے بندہ مولوی محمد اشرف علی صاحب دام مجدہم

بعد سلام مسنونہ مطالعہ فرمایند

آپ کا عنایت نامہ بجواب نیاز نامہ بندہ کے پہنچا اس وقت میرے پاس کوئی سنانے والا نہ تھا اور ہر کسی کو اس کا دکھانا مناسب نہ جانا بعد مدت کے مولوی محمد صدیق گنگوہیؒ گڑھی سے یہاں آئے، اس خط کے سرنامہ کو دیکھ کر انہوں نے اس کے دیکھنے کی خواہش کی، چونکہ وہ بھی محرم راز تھے ان سے بندہ نے پڑھوا کر سنا، مگر موقع جواب کا اس وقت نہ ملا۔ بانتظار مولوی محمد یحییٰ صاحب کے کہ وہ اس وقت اپنے گھر گئے ہوئے تھے اس خط کو اٹھا رکھا، جب وہ گنگوہ آئے تو آج دوسری محرم کو اس کا جواب لکھواتا ہوں۔

مکرما! امر اول کے باب میں آپ کو جو اشتباہ ہوا وہ دو امر ہیں، امر اول اشغال طرق مشائخ علیہم الرضوان۔

امر ثانی اشارہ جناب مرشد طال بقاؤہ، لہٰذا ہر دو امر کے باب میں بندہ کچھ لکھتا ہے سو آپ بغور ملاحظہ کریں کہ اشغال مشائخ کی قیود وتخصیصات جو کچھ ہیں وہ اصل سے بدعت ہی نہیں اس کو مقیس علیہ ٹھہرانا سخت حیرانی کا موجب ہے خاص کر تم جیسے فہمیدہ آدمی سے کیونکہ تحصیل نسبت اور توجہ الی اللہ مامور من اللہ تعالیٰ ہے اگر چہ یہ کلی مشکّک ہے کہ ادنی اس کا فرض اور اعلیٰ اس کا مندوب اور صدہا آیات واحادیث سے اس کا مامور ہونا ثابت ہے اور طرح طرح کے طرق واوضاع سے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلکہ خاص حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے گو ساری شریعت اجمالاً وہی ہے کہ جس کا بسط بوجہ طول ناممکن ہے۔

اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہر آیت و ہر حدیث سے وہی ثابت ہوتا ہے پس جس چیز کا مامور بہ ہونا اس درجہ کو ثابت ہے اس کی تفصیل کے واسطے جو طریقہ متشخص کیا جاوے گا وہ بھی مامور بہ ہوگا اور ہر زمانہ و ہر وقت میں بعض مؤکد ہو جائے گا اور بعض غیر مؤکد۔

لہٰذا ایک زمانہ میں صوم وصلوٰۃ وقرآن واذکار مذکورہ احادیث اس مامور بہ کے تحصیل کے واسطے کافی ووافی تھے، اس زمانہ میں یہ اشغال بایں قیود اگرچہ جائز تھے مگر ان کی حاجت نہ تھی، بعد چند طبقات کے جو رنگ نسبت کا دوسری طرح پر بدلا اور طبائع اس اہل طبقہ کی بسبب بُعد زماں خیریت نشان کے دوسرے ڈھنگ پر آ گئیں تو یہ اوراد اس زمانہ کے اگرچہ تحصیل مقصود کر سکتے تھے، مگر بدقت و پریشانی لہٰذا طبیبان باطن نے کچھ اس میں قیود بڑھائیں اور کمی وزیادتی اذکار کی کی، گویا کہ حصول مقصود ان قیود پر موقوف ہو گیا تھا لہٰذا ایجاد بدعت نہ ہوا، بلکہ اگر کوئی ضروری کہہ دے تو بجا ہے کیونکہ حصول مقصود بغیر اس کے دشوار ہوا اور وہ مقصود مامور بہ تھا اس کا حاصل کرنا بمرتبہ خود ضروری تھا بس گویا یہ قیود مامور بہ ہوئیں نہ کہ بدعت۔

بعد اس کے دوسرے طبقہ میں اس طرح رنگ بدلا اور وہاں بھی دوبارہ تجدید کی حاجت ہوئی ثم وثم ...... جیسا کہ طبیب موسم سرما میں ایک علاج کرتا ہے کہ موسم گرما میں وہ علاج مفید نہیں ہوتا، بلکہ حصول صحت کو بعض اوقات مضر ہو جاتا ہے اور باعتبار اختلاف زمانہ کے تدبیر علاج اول دوسرے وقت میں بدل جاتی ہے جو معالجات کہ سو برس پہلے ہمارے ملک میں تھے، اور جو مطب کہ کتب سابقین میں لکھے ہوئے ہیں اب ہرگز کافی نہیں ان کا بدل ڈالنا کتب طب کے اصل قواعد کے موافق ہے اگرچہ علاج جزوی کے مخالف ہو پس اس کو فی الحقیقت ایجاد نہ کہا جائے گا، بلکہ تعمیل اصل اصول کی قرار دی جائے گی۔

دوسری نظیر اعلاء کلمۃ اللہ ہے جس کو جہاد کہتے ہیں بتامل دیکھو کہ طبقہ اولی میں

تیر اور نیزہ اور سیف بلکہ پتھر بھی کافی تھا، ملاحظہ احادیث سے آپ کو معلوم ہے اور اس زمانہ میں استعمال ان آلات کا سراسر مضر اور ایجاد توپ تار، اور پٹرول کا واجب ہو گیا کیونکہ تحصیل اعلاء کلمۃ اللہ بدون اس کے محال، اب ان ایجادات کو نہ کوئی بدعت کہہ سکے اور نہ تشبہ بہ کفار کہہ کر حرام بنا سکے بلکہ اس کو فرض اور واجب اور مامور بہ کہنا ہوگا کیونکہ تحصیل مقصود اس پر موقوف سی ہوگئی ہے پس یہ بھی مامور بہ ہو گیا۔

علی ہذا القیاس اشغال کا حال ہے میں تعجب کرتا ہوں کہ آپ نے کیسے اشغال کو مقیس علیہ بنالیا، اس لیے کہ مقیس علیہ ضروری اور مامور بہ اور مقیس نہایت سے نہایت مباح اور کسی وجہ سے موقوف علیہ کسی امر مندوب کا بھی نہیں بلکہ اسی میں بعض امور حرام اور مکروہ۔ پھر اس کو اس پر قیاس کرنا آپ جیسے آدمی سے کس طرح موجب حیرانی نہ ہو، لہٰذا آپ کے اس قیاس کو یا اس پر حمل کیا جائے کہ آپ نے بدعت کے مفہوم کو ہنوز سمجھا ہی نہیں۔

کاش! ''ایضاح الحق الصریح'' آپ دیکھ لیتے یا براہین قاطعہ کو ملاحظہ فرماتے یا یہ کہ تسویل نفس و شیطان ہوئی اس پر آپ بدون غور عامل ہو گئے، اب امید کرتا ہوں کہ آپ غور فرمائیں گے تو اپنی غلطی پر مطلع و متنبہ ہو جائیں گے۔

اور امر ثانی کے باب میں اگرچہ سر دست آپ کو بوجہ فرط عقیدت و محبت کے ناگوار گذرے اور اس بندہ کو گستاخ و بے ادب تصور کرو مگر حق کہہ دینے سے مجھے یہ امر مانع نہیں وہ یہ ہے کہ بندہ جو حضرت شیخ سے بیعت ہوا ہے اور جتنے اہل علم ذی فہم قدیم سے بیعت ہوتے رہتے تھے اور ہوتے رہے ہیں تو باوجود علم غیر عالم سے جو بیعت ہوئے تو اس خیال سے بیعت ہوئے اور ہوتے ہیں کہ جو کچھ استاذوں سے کتب دینیہ میں انہوں نے پڑھا اور علم حاصل کیا کسی شیخ عارف سے اس علم کو علم الیقین بنالیویں تا کہ عمل کرنا نفس کو اس علم پر سہل ہو جائے اور معلوم مشہود بن جائے، علی حسب استعداد، اس واسطے کوئی بیعت نہیں ہوا اور ہوتا کہ جو کچھ ہم نے پڑھا ہے اس کے صحت و سقم کو کسی شیخ غیر عالم سے پڑتال لیں اور احکام

محققہ قرآن وحدیث کواس کے قول سے مطابق کرلیں کہ جس کووہ غلط فرمادیں اس کوآپ غلط مان لیں اور جس کوصحیح کہیں اس کوصحیح رکھیں کہ یہ خیال سراسر باطل ہے۔

پس اگرکسی کا شیخ کوئی امر خلاف امر شرع کے فرمائے گا تو اس کا تسلیم کرنا جائز نہ ہوگا بلکہ خود شیخ کو ہدایت کرنا مرید پر واجب ہوگا کیونکہ ہر دو کا حق ہر دو پر ہے اور شیوخ معصوم نہیں ہوتے اور جب تک شیخ کسی مسئلے کو جو بظاہر خلاف شرع ہو بدلائل شرعیہ قطعیہ ذہن نشین نہ کردے مرید کواس کا قبول کرنا ہرگز روانہیں، اس کی نظیریں احادیث سے بکثرت ملتی ہیں ایک نظیر بیان کرتا ہوں اس پر غور کیجئے۔

جب واقعہ مسیلمہ میں قرّاء بہت سے شہید ہوگئے اور حضرت عمرؓ کواندیشہ ذہاب کثیر من القرآن کا ہوا انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق کوجمع قرآن کا مشورہ دیا، حضرت ابوبکر صدیق نے بعد مباحثہ بسیار قول حضرت عمر کوقبول فرمایا اور اس کا استحسان ان کے ذہن نشین ہوگیا اور دونوں کی رائے متفق ہوگئی اور سنیت بلکہ وجوب مقرر ہوگیا۔

اور پھر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کواس امر کے واسطے فرمایا تو باوجود اس بات کے کہ شیخینؓ زید بن ثابت سے علم وفضل میں بہت زیادہ تھے، اور صحبت ان کی بہ نسبت زید کے طویل تھی اور ان کے باب میں حکم عام شارع سے ہو چکا تھا کہ:

اِقْتَدُوْا بِالَّذِيْنِ مِنْ بَعْدِيْ اَبَابَكْر وَعُمَر۔ (رواہ البخاری)

مع ہذا زید نے چونکہ اس امر کومحدث سمجھا تو یہی فرمایا كَيْفَ تَفْعَلُوْنَ شَيْئًا لَّمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور ان کے کہنے کو ہرگز تسلیم نہ کیا کیونکہ ایجاد بدعت ان کے نزدیک سخت معیوب تھا اور شیخین کومعصوم نہ جانتے تھے لہٰذا مناظرہ شروع کردیا مگر جس وقت حضرات شیخین نے ان کوسمجھا دیا اور سنیت اس فعل کی زید کوثابت ہوگئی تو اس وقت بدل وجان قبول کرکے اس کی تعمیل میں مصروف ہوگئے، بخاری کوتم نے خود پڑھایا اور دیکھا ہے زیادہ کیا لکھوں۔

پس ایسا بدست شیخ ہوجانا کہ مامور ومنہی کی کچھ تمیز نہ رہے یہ اہل علم کا کام نہیں،

لاَ طَاعَۃَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ یہ امر بھی عام ہے اس سے کوئی مخصوص نہیں اور اگر کسی عالم نے اس کے خلاف کیا ہے تو بسبب فرط محبت کے اور جنونِ عشقیہ کے کیا ہے، سو وہ قابل اعتبار نہیں اور ہم لوگ اپنے آپ کو اس درجہ کا نہیں سمجھتے۔ ع

بمے سجادہ رنگین کن اگر پیر مغاں گوید

انہیں لوگوں کی شان میں ہے...... اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ کہ مجلس سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ سے مجتنب رہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ''فعل مشائخ سنت نباشد'' آپ نے سنا ہوگا اور حضرت سلطان المشائخ کا اس پر یہ فرمانا کہ نصیر الدین درست کہتا ہے تصدیق تحریر بندہ کی کرتا ہے۔

وہ امر بہت باریک جو آپ نے لکھا اس کے جواب میں اسی قدر کافی ہے اسی واسطے مشائخ اپنے مریدین علماء سے مسائل دین کی تحقیق کرتے رہتے تھے اور کرتے رہے ہیں اور اپنی معلومات مخالفہ سے تائب ہو جاتے تھے۔

چنانچہ حضرت نے غذائے روح میں قصہ اس عارف کا جو غار میں رہتا تھا اور ٹکیہ موم کی آنکھ میں اور بتی نجاست کی ناک میں رکھتا تھا، لکھا ہے کہ انہوں نے مرید کے اس کہنے سے کہ اس صورت میں نماز نہیں ہوتی اپنی نمازوں کا اعادہ کیا اور اس مسئلہ کو قبول کیا اور خود بندہ کو یہ واقعات پیش آئے ہیں کہ جناب حضرت حاجی صاحب و جناب حافظ صاحب جو پہلے سے مولوی شیخ محمد صاحب سے مسائل دریافت کر کر ان پر عامل تھے، بندہ کے کہنے سے کتنے مسائل کے تارک ہو گئے اور واللہ! کہ حافظ صاحب نے یہ کلمہ میرے سامنے فرمایا کہ:

ہم کو بہت سے مسائل میں ہمیشہ دھوکا رہا پس چونکہ بندہ ابتدائے صحبت سے خوگر وہ ایسی عادات کا ہے اور فرط محبت وعقیدت سے عاری، حضرت کے ارشاد کو جو بسبب تصدیق کرنے قول بعض مریدین بدفہم یا کم فہم کے اور مریدین خودغرض بدنام کنندہ پیران کے بحسن ظن خود صحیح سمجھ گئے ہیں سر دست قبول نہیں کرتا، بلکہ حضرت کو معذور جان

کر خطا سے بری سمجھتا ہوں قَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ مَنْ اَفْتٰی بِغَیْرِ عِلْمٍ فَاِثْمُہٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاہُ۔ لہٰذا حضرت کو معذور و بری جان کر ان خودغرضوں کو آثم اور ضال و مضل ومکتسب امتعہ دنیویہ در پردہ دین یقین کرتا ہوں اور واللہ باللہ کہ تم پر خاصۃً ہرگز مجھے یہ گماں نہیں ہے بلکہ تم کو جو کچھ پیش آیا ہے بفرط عقیدت واقع ہوا ہے۔

میں تم کو بھی اس امر میں معذور سمجھتا ہوں اور تمہارے واسطے دعاء خیر کرتا ہوں اگر چہ میں تمہارا شاکی بھی ہوں مگر یہ شکوہ میرا بوجہ محبت کے ہے کیونکہ شکوہ اپنوں کا ہی ہوتا ہے غیروں سے کسی کو شکوہ نہیں ہوتا امر اول کا جواب تمام ہو چکا۔

امر ثانی کے باب میں جو کچھ آپ نے تدبیریں لکھی ہیں اس میں بندہ کچھ دخل نہیں دیتا جس طرح مناسب جانو، اور مصلحت سمجھو اس کی تدبیر کرو، غرض خلق خدا کو مبتدع کے پنجہ سے چھڑانا منظور ہے، جس طرح حاصل ہو، اور جو تشدد کہ موجب فساد ہو اس سے بچنا مناسب ہے، اس مرتبہ کے مواعظ و بیانات آپ کے جو تھانہ بھون ہوئے ان کو سن سن کر بندہ بہت خوش ہوا اور تمہارے واسطے دعائے خیر کرتا ہوں۔ فقط

اس تحریر میں اگر کوئی آپ کو شبہ ہو تو اس کے اظہار کی اجازت ہے ہرگز شرم نہ کریں، بندہ ہرگز ناخوش نہ ہوگا اگر مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہوگی تو بشرط فہم اس کے قبول کرنے میں دریغ نہ ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ۔ ۵ر محرم الحرام

تیسرا خط از مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

از کمترین خدام محمد اشرف علی:

بعالی خدمت سراپا برکت دست گیر در ماندگان راہنمائے راہ گم گشتگاں

حضرت مولانا الحاج الحافظ المولوی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم۔

بعد تسلیم نیاز خادمانہ التماس ہے کہ والا نامہ عین انتظار میں شرف صدور لایا حضور نے جو اس نادان ناکارہ کی دستگیری فرمائی اگر ہر بُن مُو سے اس کا شکر ادا کروں

تو محال ہے پس بجز اس کے کیا عرض کروں۔ ع

شکر نعمتہائے تو چندانکہ نعمتہائے تو

بالخصوص کلمات محبت وشفقت آمیز سے جو کچھ مسرت وطمانینت ہوئی شاید عمر بھر بھی کبھی مجھ کو میسر نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ حضور کی ذات اقدس کو بایں افادہ ہم نیاز مندوں کے سر پر سلامت رکھے چونکہ حضور کے دربار سے مکرر استفسار کی اجازت عطا ہوئی ہے اس لیے بہت ادب سے پھر اپنے بعض خیالات بغرض استشفاء عرض کرتا ہوں۔

امر اول میں ارشاد عالی اچھی طرح سمجھ میں آ گیا مگر ابھی اس قدر شبہ باقی ہے کہ مقیس کو اگر ذریعہ حصول ایک امر مامور بہ کا کہا جائے تو ممکن ہے یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف کرنا اور آپ کی محبت وعظمت کا دل میں جگہ دینا ضرور مامور بہ ہے، زمان سابق میں بوجہ شدت ولہ وولع خود جابجا کا چرچا بھی رہتا تھا اور عظمت و محبت سے قلوب بھی لبریز تھے بعد چندے لوگوں کو ذہول ہوا، محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے آپ کے اخلاق وشمائل ومعجزات وفضائل جداگانہ مدون کئے تا کہ اس کے مطالعہ سے وہ غرض حاصل ہو، پھر یہی مضامین بہ ہیئت اجتماعیہ منابر پر بیان کئے جانے لگے۔

پھر اہل ذوق نے اور کچھ قیود تخصیصات جن میں بعض سے سہولت عمل مقصود تھی، بعض سے ترغیب سامعین بعض سے فرح وسرور، بعض سے توقیر وتعظیم، اس ذکر وصاحب ذکر کی منظور تھی بڑھالی مگر مطمح نظر وہی حصول حب وتعظیم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رہا گو کہ حصول حُب وعظمت کا توقف اس ہیئت خاصہ پر بمعنی ''لولاہ لامتنع'' عقلاً ثابت نہیں مگر یہ توقف مقیس علیہ میں بھی نہیں وہاں بھی توقف بمعنی ترتب ہے یا لولاہ ''لامتنع عادۃً'' سو اس کی گنجائش مقیس میں بھی ہے کیونکہ ترتب تو ظاہر ہے اور عند التامّل امتناع عادی ہی ہے گو اس قدر فرق بھی ہے کہ یہ امتناع مقیس علیہ میں باعتبار اکثر طبائع کے ہے اور مقیس میں باعتبار بعض طبائع کے، چنانچہ دیار وامصار شرقیہ کے ہیں

بوجہ غلبہ الحاد ودہریت یا کثرت جہل وغفلت یہ حال ہے کہ وعظ کے نام سے کوسوں بھاگتے ہیں اوران محافل میں یا بوجاہت میزبان یا اور کسی وجہ سے آ کر فضائل وشمائل نبویہ اوراس ضمن میں عقائدومسائل شرعیہ سن لیتے ہیں۔

اس ذریعے سے میرے مشاہدہ میں بہت لوگ راہ حق پر آ گئے، ورنہ شاید ان کی عمر گذر جاتی کہ کبھی اسلام کے اصول وفروع ان کے کان میں بھی نہ پڑتے اوراگر توقف سے قطع نظر کیا جائے تب بھی ترتب یقیناً ثابت ہے سو جواز کے لیے یہ بھی کافی معلوم ہوتا ہے، چنانچہ حضور کا ارشاد ہے کہ اس زمانہ میں یہ اشغال بایں قیود اگرچہ جائز تھے مگران کی حاجت نہ تھی، انتہی۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز ذریعہ تحصیل مامور بہ کا ہوخواہ وہ محتاج الیہ ہو یا نہ ہو جائز ہے سوذریعہ ہونا اس کا تو بہت ظاہر ہے، سامعین کے قلوب اس وقت آپ کے احترام وعظمت وشوق وعشق وادب وتوقیر سے مملوومشحون ہیں ضرورنظر آتے ہیں۔

البتہ اس میں جوامور مکروہ وحرام مخلوط ہو گئے ہیں وہ واجب الترک ہیں چنانچہ احقر ہمیشہ سے اس میں ساعی ہے اور رہا، بعض اصلاحیں جوکئی ماہ وعظ میں تفصیلاً بیان کی گئی تھیں بعض لوگوں نے اختصار کے ساتھ اسے چھاپ کر شائع بھی کردیا تھا، ملاحظہ کے لیے مرسل ہیں۔

بفضلہ تعالےٰ سب نے اس کو تسلیم کیا اوراکثروں نے عمل بھی کیا سوایسے امور مکروہہ مقیس علیہ میں بھی بہت سے شامل ہو گئے ہیں جن کی اصلاح واجب ہے اور انشاءاللہ تعالیٰ اس کے متعلق بھی ایک رسالہ عنقریب لکھ کر حضور کے ملاحظہ میں بنظر اصلاح پیش کروں گا دعا کا امیدوار ہوں کیونکہ جہلاء صوفیہ کے سبب زندقہ کی بہت ترقی ہورہی ہے، سواب تک مقیس ومقیس علیہ میں اچھی طرح سے فرق سمجھ میں نہیں آیا، براہین میں بدعت کی تعریف دیکھ لی، وہ ماشاءاللہ تعالیٰ بالکل مقبول وصحیح ہے، انشاءاللہ تعالیٰ تمام معروضات میں وہ پیش نظر رہا کرے گی۔

دوسرا امر جو متعلق اتباع شیوخ کے ارشاد ہوا ہے الحمدللہ کہ میرا اعتقاد کبھی اس کے برخلاف نہیں ہوا، امر ناجائز شیخ کے فرمانے سے کبھی جائز نہیں ہوسکتا۔

لاَ طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ پر ایمان وایقان ہے مگر اتنا ضرور میرے خیال میں ہے کہ اگر مختلف فیہ مسئلہ میں شیخ کامل کسی شق کا حکم کریں اس کا اتباع اقل درجہ جائز ہے تین شرط سے:

اول یہ کہ اس مسئلہ میں دلائل وقواعد شرعیہ سے اختلاف کی گنجائش ہو،
دوسرے یہ کہ شیخ گو عالم اصطلاحی نہ ہو مگر نورانیت قلب وشرح صدر وسلامت فہم رکھتا ہو جس سے یہ توقع ہو کہ اس میں ایک شق کے ترجیح دینے کی قابلیت ہے۔

بالخصوص جب کہ شیخ پر مسئلہ کے متعلق دونوں حکم متعارض پیش کئے جائیں اور دلائل جانبین کے بھی ذکر کر دیئے جائیں اور پھر وہ ایک شق کو ترجیح دیں۔

تیسرے یہ کہ مرید کو بھی خواہ دلیل سے یا تصرف شیخ سے شرح صدر ہو جائے سو احقر کے نزدیک مسئلہ متکلم فیہا میں یہ سب امور موجود ہیں یعنی بوجہ اس کے کہ ایک جم غفیر اس کے جواز کی طرف گئے ہیں مختلف فیہ ومجتہد فیہ معلوم ہوتا ہے، اور حضرت شیخ مدظلہ کے فہم میں اس قدر قوت ضرور سمجھ رہا ہوں کہ قولین متعارضین کے پیش ہونے کے بعد ایک جانب کو ترجیح دے سکیں اور مجوزین سے حضرت صاحب مدظلہ کو گو حسن ظن ہے مگر میں تو خود مشاہدہ کر آیا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی حضرت شیخ کی نظر میں خدام والا کے برابر مقبول ومنظور ومبصر ومحقق نہیں بار ہا اس قسم کے تذکرے آئے۔

حضرت صاحب خدام والا کی نسبت ''نعمت عظمیٰ وغنیمت کبریٰ اور ہندوستان میں عدیم النظیر'' وغیرہ وغیرہ الفاظ ارشاد فرماتے ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''خدام والا کے جمیع احکام وفتوی محض للّٰہیت پر مبنی ہیں''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کو خود اس مسئلہ میں شرح صدر ہے اور اس کو باصرار فرماتے ہیں اور دوسرے قول پر انکار بھی نہیں فرماتے ہیں اور مخاطب کو حضرت

کے ارشاد سے اطمینان بھی ہو جاتا ہے۔

ایسی صورت میں اتباع کو اب تک جائز سمجھا ہوا ہوں، یہ اظہار تھا مافی الضمیر کا، احقر نے بہت کوشش کی ہے کہ تمام عریضہ میں کسی مضمون میں مناظرہ کا رنگ نہ آنے پائے محض استفادہ استشارہ مقصود ہے شاید بلا قصد کہیں ایسا ہو گیا ہو تو حضور کے مکارم اخلاق اور مراحم اشفاق سے امید ہے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ پر نظر فرما کر معاف فرمایا جائے، حضور نے جو محبت کے ساتھ شکوہ فرمایا ہے اس پر اسی قدر مسرور ہوں جیسے کہ بنی سلمہ و بنی حارثہ، آیت: وَاِذْ هَمَّتْ طَّائِفَتَانِ مِنكُمْ اَنْ تَفْشَلاَ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا. کے نزول پر۔

اللہ تعالیٰ حضور کی برکت سے ہم بے راہوں کو راہ پر لگا دے انشاء اللہ تعالیٰ دوسرے باب میں خصوصاً وعموماً سعی کی جائے گی دعا سے مدد فرمایئے، مواعظ پر حضور نے اپنی خوشنودی کا مژدہ ارشاد فرمایا میں سچ عرض کرتا ہوں کہ حضور کی رضا کو دلیل قبول و وسیلۂ نجات سمجھتا ہوں خدا کرے صدور خطا پر بھی حضور ہم خدام سے کبھی ناخوش نہ ہوں بلکہ تنبیہ فرماویں، بخدمت جناب کاتب صاحب کی غالباً مولوی محمد یحییٰ صاحب ہیں سلام شوق قبول ہو اور اگر کوئی صاحب ہوں تو اسم گرامی سے مطلع فرمادیں میں خط سے نہیں پہچان سکا، باقی خیریت ہے۔

والسلام مع الاکرام

از کان پور ۸ رمحرم الحرام یوم الخمیس ۱۳۱۵ھ

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا جواب

از بندہ رشید احمد عفی عنہ

بعد سلام مسنونہ مطالعہ فرمایند

آپ کا خط آیا آپ نے جو شبہ مساوات مقیس و مقیس علیہ میں لکھا ہے موجب

تعجب ہے مگر بمقتضائے حُبُّکَ الشَّیءَ یُعْمِیُ وِیُصِمُّ ایسے شبہات کا ورود عجب نہیں۔

بغور دیکھو کہ مقیس علیہ خود ذکر ہے کہ مطلق ذکر مامور بہ کا فرد ہے اور اس کے ملاحظات وہیئات یا ذکر ہیں یا وہ امور ہیں کہ نص سے ان کی اصل ثابت ہے پس وہ ملحق بالسنۃ ہیں، اور بضرورت موقوف علیہ مقصود کے تخصیص وتعیین ان کی کی گئی اور عوام تو کیا خواص میں بھی صدہا میں معدود شخص عامل ہیں لہٰذا عوام کے ضرور سمجھ جانے کا وہاں محل نہیں اور مقیس میں جو قیود مجلس ہیں بعض موہم شرک ہیں اور بعض امور دراصل مباح مگر بسبب اشاعت ہر خاص وعام کے ملوث بہ بدعت ہو کر ممنوع ہوگئے کہ عوام ان کو ضروری بلکہ واجب جانتے ہیں اور مجالس مولود میں جس قدر عوام کو دخل ہے خواص کو نہیں اور یہ قیود مذکورہ غیر مشروعہ موقوف علیہ محبت کے ہرگز نہیں آپ خود معترف ہیں۔

پس اس کو موقوف مقیس علیہ کے ساتھ کیا مناسبت اور داعی عوام کو سماع ذکر کی طرف ہونا اس وقت تک جائز ہے کہ کوئی منع شرعی اس کے ساتھ لاحق نہ ہو ورنہ رقص وسرور زیادہ تر داعی ہیں اور روایات موضوعہ زیادہ تر موجب محبت گماں کی جاتی ہے۔

پس کون ذی فہم بعلت دعوت عام ان کا مجوز ہوجائے گا یہ جواب آپ کی تقریر کا ہے کہ سماع ذکر ولادت بہ ہیئت کذائیہ کو آپ از دیاد محبت تصور کرتے ہیں اور بذریعہ غیر مشروع کے تحصیل محبت کی اجازت دیتے ہیں، ورنہ فی الحقیقت جو امر خیر کہ بذریعہ نامشروعہ حاصل ہو وہ خود ناجائز ہے اور جو کچھ بندہ کا مشاہدہ ہے وہ یہ ہے کہ مولود کے سننے والے اور مشغوف مجالس مولود صدہا ہوتے ہیں کہ ان میں ایک بھی سنت کا متبع اور محبّ نہیں ہوتا اور عمر بھر مولود سننے سے محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و محبت سنت ذرہ بھر بھی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوتی، بلکہ بے اعتنائی عبادات اور سنن سے بے حد ان کے جی میں آجاتی ہے اور اگر تسلیم کیا جائے کہ آپ کی محفل میلاد خالی ہے، جملہ منکرات سے اور کوئی امر نامشروع اس میں نہیں ہے تو دیگر مجالس

تمام عالم کی تو سراسر منکر ہیں اور یہ فعل آپ کا ان کے لیے مؤید ہے پس یہ فعل مندوب آپ کا جب مغوی خلق ہوا تو اس کے جواز کا کیسے حکم کیا جائے گا۔

اگر حق تعالیٰ نے نظر انصاف بخشی تو سب واضح ہے ورنہ تاویل وشبہات کو بہت کچھ گنجائش ہے، مذاہب باطلہ کی اہل حق نے بہت کچھ تردید کی مگر قیامت تک بھی ان کے شبہات تمام نہ ہوں گے۔ فقط

امر ثانی میں سنئے کہ حضرت اعلیٰ کا ارشاد پانچ چھ سال پہلے یہی تھا کہ ''نفس ذکر جائز اور قیود بدعت''۔

چنانچہ اس قسم کی تحریرات اب بھی موجود ہیں مگر بعد حضور مجوزین کے جو تحقیق ہوئی ہے خلاصہ اس کا ہفت مسئلہ میں آپ نے خود لکھا ہے کہ جناب حضرت مدظلہ مجوزین ومانعین ہر دو کی تصویب فرمارہے ہیں حالانکہ ایک مسئلہ جزئیہ عملیہ جو مجتہدین میں مختلف فیہ ہے عند اللہ حق اس میں ایک ہی ہے اور دوسرا غلط تو کشف سے اگر صاحب کشف حق ایک جانب کو حق جان لیوے تو دوسری جانب کو حق نہیں کہہ سکتا۔

کیونکہ کشفاً ایک ہی حق ہوتا ہے پس دونوں کی تصویب اور ایک کے ترجیح کے کیا معنی؟ سوائے اس کے کہ دونوں جانب علماء تصور فرما کر اس مسئلہ کو مختلف فیہ خیال فرمایا اور اس کو مسئلہ فرعیہ تصور فرمایا حالانکہ یہ مسئلہ اعتقادیہ ہے اگرچہ بادی النظر میں مسئلہ فرعیہ خیال کیا جاتا ہے اور مسئلہ اعتقادیہ میں حق ایک ہی ہوتا ہے ظاہر میں بھی مثل باطن کے۔

اسی واسطے اہل اہواء اگرچہ صدہا علماء ہیں، ان کی کثرت پر نظر نہیں ہوتی اور مسئلہ مختلف فیہا نہیں کہا جاتا، اور حضرت اعلیٰ وجہ ترجیح کو خود ہی تحریر فرماتے ہیں آپ نے اپنے قلم سے لکھا ہے کہ ان قیود کو بدعت ہی نہیں سمجھا کیونکہ فرماتے ہیں کہ:

''بدعت وہ ہے کہ غیر دین کو دین میں داخل کیا جائے''

اور اس پر حدیث ''من احدث فی امرنا ھذا'' الخ کو دلیل لائے ہیں

اس سے صاف واضح ہے کہ یہ ترجیح کشفی نہیں ہے باقی یہ بات کہ ترجیح اعلیٰ حضرت کی صحیح نہیں اس کو میں نہیں لکھتا اگر چہ یہ اصل ان کی صحیح ہے مگر اندراج اس جزئیہ کا اس اصل میں صحیح نہیں ہے آپ تامل کریں تو واضح ہو جائے گا۔

اوراس مسئلہ کو مختلف فیہا ومجتہد فیہا سمجھنا تم سے تعجب ہے کیونکہ وہ مسئلہ مختلف فیہا بظاہر دونوں طرف صواب ہوتا ہے کہ مجتہد مطلق یا مقید یا علماء راسخین ملحق بہم میں مختلف فیہ ہوااور عوام علماء کا اختلاف مسئلہ کو مجتہد فیہ نہیں بتا تا بلکہ اس میں ایک ہی جانب حق ہوتی ہے کہ جو موافق قانون شریعت کے ہوااور دوسری رائے باطل ہوتی ہے فقط۔

اور یہ جو کچھ بندہ نے لکھا ہے اگر میں بھی یہ کہنے لگوں کہ میں نے بھی کشفاً اس کو معلوم کرلیا ہے تو بجا ہے مگر میرا منہ اس کلمہ کے کہنے کا نہیں ہے اور چونکہ آپ کو بحسن عقیدہ اس کے خلاف شرح صدر ہو گیا ہے تو امید ہے کہ کسی کا لکھنا یا کہنا آپ کو مفید نہ ہوگا البتہ اس میں شک نہیں کہ ہم نے اہل مولود میں سے آج تک کسی کو متبع سنت نہیں دیکھا۔ فقط والسلام۔ مورخہ ۱۲ر محرم ۱۳۱۵ھ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا مکتوب

از احقر خلق محمد اشرف علی عفی عنہ

بخدمت سراپا برکت حضرت مولانا مقتدانا سیدنا الحافظ الحاج المولوی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم

پس از تسلیمات مقرون بالاٰف التکریم واصناف التعظیم معروض آنکہ والا نامہ موجب اعزاز وافتخار ہوا اپنی کج فہمی پر حضور کے اشفاق کو کہ برابر تفہیم فرماتے ہیں دیکھ کر نہایت شرماتا ہوں اور شرم سے دوبارہ عرض کرنے کی ہمت نہیں ہوتی مگر حضور کی اجازت پر اس سے پہلے عریضہ میں اپنے شبہات کو پیش کیا تھا لیکن اس والا نامہ کا یہ مضمون (اور چونکہ آپ کو بحسن عقیدت اس کے خلاف شرح صدر ہو گیا ہے تو امید

ہے کہ کسی کی تحریر آپ کو کافی نہ ہوگی) کسی قدر موہم تکدر خاطر خدام والا ہوا، **اعوذ بالله من غضب الله وغضب رسول الله وغضب ورثة رسول الله صلى الله عليه وسلم** اوراسی وجہ سے کچھ عرض کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی کئی روز اسی شش وپنج میں گذر گئے مگر آخر میں یہ رائے ہوئی کہ **انما شفاء العی السؤال** بے عرض کئے ہوئے کیسے دل صاف ہوگا۔

اور یہ خیال ہوا کہ اب تک اس شرم ہی شرم میں شبہات پیدا ہوگئے اگر پہلے سے تھوڑی جرأت کی جاتی تو یہ نوبت کا ہے کو آتی، اس وجہ سے پھر عرض کرنے کی ہمت ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ التماس ہے کہ اگر میرا عرض کرنا خدام والا کو ذرہ برابر بھی موجب تکدر ہو تو بے تکلف صراحۃً فرمادیا جائے، میں انشاء اللہ بلا حجت اتباع کروں گا کیونکہ احقر اپنی نسبت حضور سے ایسی سمجھتا ہے کہ جیسے مقلد کی نسبت مجتہد سے اور اگر اجازت ہوگی تو عرض کرسکوں گا۔

احقر بہ قسم کہتا ہے کہ میرے قلب میں تو نہ اس عمل کی محبت ہے نہ اس کے ساتھ شغف بلکہ میں خود اس کے ترک کو افضل واولیٰ سمجھتا ہوں چنانچہ اسی قسم کے امور کی بناء پر جلسہ ہائے دستار بندی کا اہتمام ترک کردیا گیا اور اس مضمون کو چھاپ کر شائع بھی کردیا مگر یہاں کے مجموعی حالات کے مقتضی ایسے ہیں کہ مخالفت کرنا سخت دشوار وموجب فتنہ ہے اور اس موقع پر ہر قسم کے لوگ مواعظ بھی سن لیتے ہیں، منکرات کی اصلاح بھی اس طرح سے سہل ہے (اس لیے) شریک ہوجاتا تھا مگر جب ہی تک کہ اس کو جائز سمجھا جائے، اسی واسطے جو شبہات دل میں آئے معروض ہوئے اور ان سے مقصود محض حصول شفاء ہے کہ جس سے مجھ کو بفضلہٖ تعالیٰ جلدی امید کامیابی کی ہے اور متعصبین کو تو دل سے طلب حق مقصود نہیں ہوتی اس لیے ان کو عمر بھر حق کا پتہ نہیں لگتا، میں تو ہر نماز کے بعد دل سے دعا مانگتا ہوں **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ** الخ **رَبَّنَا لاَ تُزِغْ قُلُوبَنَا** الخ **اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقاً** الخ۔

تنہائی میں بیٹھ کر سوچا کرتا ہوں کہ حق کیا ہے میرے اختیار میں بجز طلب وتوجہ الی اللہ وسوال علماء محققین اور کیا ہے آئندہ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے اور توبہ توبہ میں کیا میرا شرح صدر کیا اور حضور کے جن کمالات کا مجھے اعتقاد ہے ان کے روبرو کشف کیا چیز ہے جس کی تصدیق میں مجھ کو تردد ہو، آپ کے ارشاد کو بدل وجان تصدیق کرتا ہوں مگر بمقتضائے حدیث "**انما شفاء العی السوال**" اس وقت پھر کچھ عرض کرتا ہوں۔

امر ثانی میں تو مجھ کو اجمالاً یوں اطمینان وکامل شفا ہوگئی کہ اعلیٰ حضرت مدظلہم کی معرفت جس قدر حضور کو ہے ہم لوگوں کو قیامت تک بھی نصیب نہ ہوگی، اس میں کلام طویل کرنا خدام والا کو پریشان کرنا ہے اب صرف امر اول رہ گیا سو مقیس ومقیس علیہ میں واقعی یہ فرق تو ہے کہ مقیس علیہ کے عامل خواص میں بھی کم ہیں اگرچہ اس وقت مدعیوں نے عوام جہلاء میں بھی یہ قصہ پھیلا دیا ہے اور وہ بھی برے عقیدوں کے ساتھ مگر پھر بھی مقیس کے برابر شیوع نہیں۔

اور یہ بات بھی ہے کہ عاملان مقیس میں متبعان سنت کم ہیں اگرچہ اس کی وجہ سوء تعلیم بیان کرنے والوں کی ہو، مگر خیر کچھ سہی قلت ضرور ہے اور یہ امر بھی یقینی ہے کہ جو امر خیر بذریعہ غیر مشروع حاصل ہو وہ امر خیر نہیں ہے اور جب قیود کا مشروع ہونا ثابت ہو جائے تو اس کا ثمرہ کچھ ہی ہو جائز الحصول نہ ہوگا اور یہ امر بھی ظاہر ہے کہ مجالس منکرہ بکثرت ہوتی ہیں اور منکر کی تائید اگر غیر منکر سے ہو تو وہ بھی سزاوار ترک ہے جب کہ عند الشرع فی نفسہ ضروری نہ ہو اب اس وقت دو امر قابل عرض ہیں ایک یہ کہ تقیید مطلق کی آیا مطلقاً ممنوع ہے یا جب کہ اس قید کو مرتبہ مطلق میں سمجھا جائے یعنی اگر مطلق واجب تھا تو قید کو بھی واجب سمجھا جائے اور اگر وہ مندوب موجب قرب تھا تو قید کو بھی مندوب اور موجب قرب سمجھا جائے درصورت اولیٰ تقییدات عادیہ میں شبہ ہوگا، اور صورت ثانیہ میں جب مطلق کو عبادت سمجھا اور قید کو بناء **علی مصلحةٍ مّا** عادت سمجھا جائے تو فی نفسہ اس میں قبح نہ ہوگا ہاں اگر مؤدی بہ فساد عقیدۂ عوام ہو تو اس

میں قبح لغیر ہ ہوگا لیکن اگر اس کا فاعل زبان سے اصلاح عقیدۂ عوام کی بالاعلان کرتا رہے اس وقت بھی یہ قبح رہے گا یا نہیں اگر نہ رہے گا فبہا اور اگر رہے گا تو اس صورت میں بعض اعمال میں جو عوام میں شائع ہورہے ہیں اور ظاہراً ان کی عقیدت میں ان کی نسبت غلو وافراط بھی ہے اور خواص کے فعل بلکہ حکم سے اور قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور اس کا وجوب شرعی بھی کسی دلیل سے ثابت نہیں ہوا اور عوام بلکہ بعض خواص میں اس پر مفاسد بھی مرتب ہورہے ہیں ایسے اعمال میں شبہ واقع ہوگا مثلاً تقلید شخصی کہ عوام میں شائع ہورہی ہے اور وہ اس کو علماً وعملاً اس قدر ضروری سمجھتے ہیں کہ تارک تقلید سے گو کہ اس کے تمام عقائد موافق کتاب وسنت کے ہوں اس قدر بغض ونفرت رکھتے ہیں کہ تارکین صلوۃ، فجار وفساق سے بھی نہیں رکھتے۔

اور خواص کا عمل وفتویٰ وجوب اس کا مؤید ہے گو خود ان کو علی سبیل الفرض اتنا غلو نہ ہو اور دلیل ثبوت اس کی یہ مشہور ہے کہ ترک تقلید سے مخاصمت ومنازعت ہوتی ہے جو کہ ممنوع ہے، سومؤدی الی الممنوع ممنوع ہوگا پس اس کی ضد واجب ہوگی۔

مگر دیکھا جاتا ہے کہ بوجہ اختلاف آراء علماء وکثرت روایات مذہب واحد معین کے مقلدین میں بھی عوام کیا خواص میں مخاصمت ومنازعت واقع ہے اور غیر مقلدین میں بھی اتحاد واتفاق پایا جاتا ہے۔

غرض اتفاق واختلاف دونوں جگہ ہے اور مفاسد کا ترتب یہ ہے کہ اکثر مقلدین عوام بلکہ خواص اس قدر جامد ہوتے ہیں کہ اگر قول مجتہد کے خلاف کوئی آیت یا حدیث کان میں پڑتی ہے ان کے قلب میں انشراح وانبساط نہیں رہتا، بلکہ اوّل استنکار قلب میں پیدا ہوتا ہے پھر تاویل کی فکر ہوتی ہے خواہ کتنی ہی بعید ہو، اور خواہ دوسری دلیل قوی اس کے معارض ہو بلکہ مجتہد کی دلیل اس مسئلہ میں بجز قیاس کے کچھ بھی نہ ہو بلکہ خود اپنے دل میں اس تاویل کی وقعت نہ ہو مگر نصرت مذہب کے لیے تاویل ضروری سمجھتے ہیں دل یہ نہیں مانتا کہ قول مجتہد کو چھوڑ کر حدیث صحیح صریح پر عمل

کرلیں، بعض سنن مختلف فیہا مثلاً آمین بالجہر وغیرہ پرحرب وضرب کی نوبت آجاتی ہےاور قرون ثلثہ میں اس کا شیوع بھی نہ ہوا تھا بلکہ کیف ماتفق جس سے چاہا مسئلہ دریافت کرلیا، اگر چہ اس امر پر اجماع نقل کیا گیا ہے کہ مذاہب اربعہ کو چھوڑ کر مذہب خامس مستحدث کرنا جائز نہیں، یعنی جو مسئلہ چار مذہبوں کے خلاف ہو اس پر عمل جائز نہیں کہ حق دائر ومنحصران چار میں ہے مگراس پر بھی کوئی دلیل نہیں، کیونکہ اہل ظاہر ہر زمانہ میں رہے اور یہ بھی نہیں کہ سب اہل ہوئ ہوں وہ اس اتفاق سے علیحدہ رہے دوسرے اگر اجماع ثابت بھی ہوجائے مگر تقلید شخصی پر تو کبھی اجماع بھی نہیں ہوا البتہ ایک واقعہ میں تلفیق کرنے کومنع لکھا ہے تاکہ اجماع مرکب کے خلاف نہ ہوجائے باوجودان سب امور کےتقلید شخصی کا استحسان ووجوب مشہور ومعمول ہے سو اس کا فتح کس طرح مرفوع ہوگا۔

دوسرا امر یہ کہ مسئلہ متکلم فیہا کے اعتقادی ہونے کی کیا صورت ہے بادی النظر میں تو فرعی عملی معلوم ہوتا ہے۔

تتمیم فائدہ کے لیے دوامر کی تحقیق اور منظور ہے کہ تشبہ منہی عنہ کی حد جامع و مانع کیا ہے بعض طرق ریاضت کے مثل حبس دم وغیرہ کے اہل ہند کے اعمال سے ہیں، انگرکھا اہل ہند کے لباس سے ہے رجعت قہقری کعبہ سے وداع کے وقت اس میں تخصیص بھی ہے اور نسواں اہل ہند اپنے معاہدہ کے ساتھ کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ التزام مالا یلزم اعتقاد وجوب سے ممنوع ہوتا ہے یا بلاناغہ اس کے استمرار سے بھی گوکسی قدر صلابت واہتمام کے ساتھ ہوالتزام ممنوع ہوجاتا ہے **صحابی ملتزم قراءۃ قل ھو اللہ احد سے ما حملک علی لزوم ھذہ السورۃ** دریافت فرما کر نہی نہ فرمانا دلیل تقریری جوازلزوم عمل کی معلوم ہوتی ہے۔

ان شبہات کے صاف ہونے کے بعد امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ حضور کو تکلیف دینے کی نوبت نہ آوے گی، میں بہت ادب سے اس جرأت کی معافی چاہتا

ہوں، مگر کیا کروں خدا جانے سب جگہ سے ناامید ہوکر خدام والا سے رجوع کیا ہے اگر حضور بھی ناامید کردیں گے تو کہاں جاؤں گا پھر شیطان بہکا دے گا کہ اجتہاد کر پھر خرابی ہوگی، اللہ تعالیٰ آپ کو بایں فیوض وبرکات سلامت باکرامت رکھے آمین۔

تازہ خبر حسرت یہ ہے کہ کل مکہ معظّمہ سے میرے ایک ملاقاتی کا خط ایک حاجی صاحب لائے ہیں لکھا ہے کہ حافظ حاجی احمد حسین صاحب امین الحجاج ۱۳رذی الحجہ ۱۳۱۴ھ کو رحلت فرمائے عالم بقاء ہوئے۔

انا لله وانا اليه راجعون اللهم ارحمه رحمة واسعة.

نہایت رنج ہے کہ کئی طرح سے اول خود ان کے انتقال کا رنج، دوسرے ان سے حجاج کو کس قدر نفع تھا، تیسرے حضرت صاحب کی تنہائی وتشویش کا، چوتھے چھوٹے چھوٹے بچوں کا خیال، پانچویں خدا کرے ردّ وودائع میں کوئی قصہ نہ ہو اور اعلیٰ حضرت بفضلہ تعالیٰ خیریت سے ہیں، مداللہ تعالیٰ ظلال فیوضہم، زیادہ حد ادب بخدمت مولوی محمد یحییٰ صاحب کاتب خطوط ومولوی صادق الیقین صاحب اگر حاضر ہوگئے ہوں سلام مسنون۔ از کانپور ۱۸رمحرم ۱۳۱۵ھ

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا جواب

از بندہ رشید احمد عفی عنہ

بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند:

خط آپ کا آیا بظاہر آپ نے جملہ مقدمات محررہ بندہ کو تسلیم کرلیا اور قبول فرمالیا البتہ تقلید شخصی کے سبب کچھ تردد آپ کو باقی ہے لہٰذا اس کا جواب لکھواتا ہوں مقید بامر مباح میں اگر مباح اپنی حد سے نہ گزرے یا عوام کو خرابی میں نہ ڈالے تو جائز ہے، اور اگر ان دونوں سے کوئی امر واقع ہوجائے تو ناجائز ہوگا اس مقدمہ کو خود تسلیم کرتے ہو، اب تقلید کو سنو! کہ مطلق تقلید مامور بہ ہے لقولہ تعالیٰ: فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔

اور بوجہ دیگر نصوص مگر بعد ایک مدت کے تقلید غیر شخصی کے سبب مفاسد پیدا ہوئے کہ آدمی بسبب اس کے لاابالی اپنے دین سے ہوجاتا ہے اور اپنی ہوائے نفسانی کا اتباع اس میں گویا لازم ہے اور طعن علماء مجتہدین وصحابہ کرام اس کا ثمرہ ہیں، ان امور کے سبب باہم نزاع بھی پیدا ہوتا ہے۔

اگر تم بغور دیکھو گے تو یہ سب امور تقلید غیر شخصی کے ثمرات نظر آئیں گے اور اس پر ان کا مرتب ہونا آپ پر واضح ہوجائے گا لہٰذا تقلید غیر شخصی اس بدنظمی کے سبب گویا ممنوع من اللہ تعالیٰ ہوگئی ہے پس ایسی حالت میں تقلید شخصی گویا فرض ہوگئی اس لیے کہ تقلید مامور بہ کی دونوع ہیں شخصی وغیر شخصی اور تقلید بمنزلہ جنس ہے اور مطلق کا وجود خارج میں بدون اپنے کسی فرد کے محال ہے پس جب غیر شخصی حرام ہوئی بوجہ لزوم مفاسد تو اب شخصی معین مامور بہ ہوگئی اور جو چیز کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے فرض ہو، اگر اس میں کچھ مفاسد پیدا ہوں اور اس کا حصول بدون اس ایک فرد کے ناممکن ہوتو وہ فرد حرام نہ ہوگا بلکہ ازالہ ان مفاسد کا اس سے واجب ہوگا اور اگر کسی مامور کی ایک نوع میں نقصان ہو اور دوسری نوع سالم اس نقصان سے ہوتو وہی فرد خاصۃً مامور بہ بن جاتا ہے اور اس کے عوارض میں اگر کوئی نقصان ہوتو اس نقصان کا ترک کرنا لازم ہوگا نہ اس فرد کا، یہ حال وجوب تقلید شخصی کا ہے۔

اسی واسطے تقلید غیر شخصی کو فقہاء نے کتابوں میں منع لکھا ہے مگر جو عالم غیر شخصی کے سبب مبتلا ان مفاسد مذکورہ کا نہ ہو اور نہ اس کے سبب سے عوام میں ہیجان پیدا ہو اس کو تقلید غیر شخصی اب بھی جائز ہوگی مگر اتنا دیکھنا چاہئے کہ تقلید شخصی وغیر شخصی دونوع ہیں کہ شخصیت وغیر شخصیت دونوں فصل ہیں جنس تقلید کی کہ تقلید کا وجود بغیر ان فصول کے محال ہے کیونکہ یہ فصول ذاتیات میں داخل ہیں پس اس کا حال قیود مجلس میلاد سے جدا ہے بادی النظر میں یہ دونوں یکساں معلوم ہوتے ہیں ورنہ اگر غور کیا جائے تو واضح ہے کہ ذکر ولادت جداشئ ہے اور فرش وفروش وروشنی وغیرہ قیود مجوثہ کوئی فصل

ذکر کی نہیں بلکہ امور منضمہ ہیں کہ بدون ان کے ذکر ولادت حاصل ہوسکتا ہے۔

سوایک کودوسرے پر قیاس کرنا درست نہیں مع ہذا اوپر کے کلیہ سے مباح منضم کا حال معلوم ہو چکا کہ جب تک اپنی حد پر ہوگا جائز، اور جب اپنی حد سے خارج ہوگا تو ناجائز اور امور مرکبہ میں اگر کوئی ایک جز ناجائز ہوجائے تو مجموعہ پر حکم عدم جواز کا ہوجاتا ہے آپ کو معلوم ہے کہ مرکب حلال وحرام سے حرام ہوتا ہے، یہ کلیہ فقہ کا ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ اس تقریر سے آپ کی اس طویل تحریر کا جواب حاصل ہوگیا ہوگا جو آپ نے دربارۂ تقلید لکھی ہے لہٰذا زیادہ بسط کی حاجت نہیں ہے کیونکہ تم خود فہیم ہو......اس مسئلہ کے باب عقائد میں سے ہونے کا سبب دریافت فرمایا ہے۔

سوغور کیجئے کہ جوامور مبتدع اور محدث ہیں ان سب کو ناجائز اور موجب ظلمت عقیدہ کرنا واجب ہے پس یہ اعتقاد کلیات میں داخل ہے اگرچہ عمل ان کا عملیات سے ہے یہی وجہ ہے کہ کتب کلام میں جواز مسح خف وجواز اقتداء فاسق وجواز صلوۃ علی الفاسق وغیرہ بھی لکھتے ہیں کیونکہ گو یہ اعمال ہیں مگر اعتقاد جواز وعدم جواز اعتقادیات میں داخل ہیں۔

آپ نے تشبہ منہی عنہ کی تعریف دریافت کی ہے سو تشبہ امر مذموم میں مطلقاً حرام ہے اور جو اہر غیر مذموم مباح ہے وہ اگر خاصہ کسی قوم کا ہو تو بھی ناجائز اور اگر بقصد تشبہ کوئی فعل کیا جائے تو وہ مطلقاً نادرست ہے، سوائے اس کے اور سب درست ہے۔ اور یہ بحث براہین قاطعہ میں بسط سے لکھی گئی ہے۔ اس میں دیکھ لیں اور یہ بھی استطراداً لکھتا ہوں کہ شارح منیہ شرح کبیری منیہ میں جو دہلی میں چھپ گئی ہے، صلوۃ الرغائب کی کراہت کے جو وجوہ لکھے ہیں ان کو آپ دیکھیں کہ مجلس مولود کا حال اس پر قیاس کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔

رہا حبسِ دم، سو وہ فی حد نفسہ مباح ہے اور عقلاً اس میں چند منافع ہیں جذب رطوبات اور جلب حرارت اور رفعِ تشتتِ خواطر، چنانچہ اطباء اس کو صراحۃً معالجۂ رطوبت قلبیہ میں تحریر کرتے ہیں اور ہر عاقل اس کو جان سکتا ہے لہٰذا جوگیوں نے

مورث صفائی باطن جان کر اس کو اختیار کیا اور اسلامیین نے بھی اس وجہ سے اس کو اختیار کیا، جوگیوں کا فعل ہونے کی وجہ سے اس کو نہیں لیا بلکہ عقلاً اس کو نافع سمجھ کر اختیار کیا ہے۔

اسی واسطے قادریہ و چشتیہ کے یہاں چونکہ حرارت کی ضرورت ہے انہوں نے مؤکداً اپنے اعمال میں اسے داخل کیا اور نقشبندیہ کے یہاں استحساناً کہ وہ حرارت کو ضروری نہیں جانتے مگر بعض درجہ میں بعض وجہ سے یعنی بوجہ استحکام ذکر اس کو مستحسن سمجھتے ہیں اور سہروردیہ کے ہاں چونکہ حرارت کی مطلقاً حاجت نہیں ہے لہٰذا ان کے یہاں ممنوع ہے بلکہ وصول کے واسطے عدم حبس کو شرط کرتے ہیں پس اس کا اختیار کرنا اس ضرورت کے واسطے ہے اور حبس خاصہ جوگ کا نہیں بلکہ یہ امر عقلی ہے کہ سب عقلاء اپنے اپنے موقعہ پر کرتے ہیں اس کو۔

اور نظیر اس کی شرع میں موجود ہے کہ تشہد میں رفع سبّابہ کر کے ادامۃ النظر الی السبابہ مشروع ہے اور غض بصر تحصیل خشوع کے واسطے ہے اور غض بصر غیر محارم سے رفع تشتت کے واسطے، پس اس میں تشبہ کا کیا امکان ہے یہ کوئی امر حسی نہیں اور نہ خواص کفار سے اور متضمن منافع ضروریہ کا، لہٰذا اس کے جواز میں کلام نہیں ہوسکتا اور انگرکھا ہر دو فریق میں شائع ہے اس میں تشبہ نہیں ہوسکتا البتہ پردہ کا فرق ہے سو اس میں تشبہ حرام ہے، علی ہذا رجعت قہقری خاصہ کسی قوم کا نہیں ہے۔

التزام مالا یلزم بدون اعتقاد وجوب بھی ممنوع ہے اگر باصرار ہو، اور اگر امر مندوب پر دوام ہو بلا اصرار وہ جائز ہے اور مستحب ہے بشرطیکہ عوام کو ضرر نہ ہوا کرے، اور اگر عوام کے اعتقاد میں نقصان ڈالے تو وہ بھی مکروہ ہے، چنانچہ کتب فقہ میں سورۃ مستحبہ کا التزام مکروہ لکھا ہے۔

اور سورۃ **قل ھو اللہ احد** کی صورۃ میں آپ نے جو لکھا ہے خود ہی غور فرمائیں کہ جب اس صحابی نے اس پر التزام کیا اور جملہ صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تو اعتراض

صحابہ کا اس التزام پر بلا وجہ شرعی نہ تھا،اسی واسطے جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ امر پیش ہوا تو آپ نے صحابہ کو منع نہ فرمایا کہ اس امر پر اس کے ساتھ کیوں تکرار کرتے ہو بلکہ ان کو بلا کر پوچھا کہ ان کا کہنا کیوں نہیں مانتے ہو۔

پس اگر یہ امر ناجائز وموہم نہ ہوتا تو آپ صحابہ کو ہی منع کر دیتے اور جب اس شخص نے اپنی محبت کا حال بیان کیا تو اس وقت آپ نے ان کو اجازت دی کہ فی حد نفسہ یہ امر جائز تھا،اور فضل اس صورۃ کا محقق تھا اور اس اجازت سے ایہام رفع ہو گیا تھا کیونکہ ایہام کا غیر مشروع ہونا سب صحابہ پر واضح ہو گیا ہے کیونکہ اس وقت کے آدمی ایسے عوام کے درجہ میں نہ تھے کہ باوجود اس واقعہ کے پھر اس کو واجب جانتے تھے اور پچھلوں کے واسطے یہ انکار صحابہ کا اور تقریر ان کے انکار کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہونا حجت ہو گیا تو اس واقعہ سے کچھ شبہ نہیں ہوسکتا۔

اس بحث کو براہین میں بسط سے لکھا ہے مگر آپ نے اس کتاب کو دیکھا ہی نہیں، میں امید کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص براہین کو اول سے آخر تک بہ تدبر دیکھے تو باب بدعات میں اس کو کوئی شبہ نہ ہو کیونکہ اس کے مؤلف نے اس باب میں سعی بلیغ کی ہے۔جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

اگر آپ کو اب بھی کوئی شبہ ہو تو بندہ کی طرف سے اجازت ہے آپ اس کو ظاہر کریں اگر گنجائش جواب ہوگی انشاءاللہ جواب لکھوں گا ورنہ خیر! مگر تحریرات بندہ کو تدبر سے محفوظ کر کر اس کے بعد شبہ کرنا چاہئے،عوام علماء کو جو جرأت ارتکاب بدعت کی ہوئی تو کلام اہل حق کے عدم فہم سے ہوئی۔

فقط والسلام علیکم وعلی من لدیکم

۲۵/محرم ۱۳۱۵ھ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا مکتوب

بہ والا خدمت بابرکت قدوۃ العرفاء زبدۃ الفضلاء حضرت مولانا رشید احمد صاحب دامت برکاتہم تسلیم بصد تعظیم قبول باد۔

والا نامہ شرف صدور لایا معزز فرمایا: حضرت عالی کے ارشادات سے اس عمل کے جو مفاسد علمیہ وعملیہ عوام میں غالب ہیں پیش نظر ہو گئے اور ارادہ کرلیا کہ ہرگز ایسی مجالس میں شرکت نہ ہوگی، اب یہاں کی حالت عرض کر کے حکم کا انتظار ہے۔

الحمدللہ کہ میں نہ یہاں کسی کا محکوم ہوں نہ کسی سے مجبور مگر پوری مخالفت کر کے قیام دشوار ہے، گو اب بھی یہاں کے بعض علماء مجھ کو وہابی کہتے ہیں اور بعض بیرونی علماء بھی یہاں آ کر لوگوں کو سمجھا گئے کہ یہ شخص وہابی ہے اس کے دھوکہ میں مت آنا، مگر چونکہ من وجہ عوام سے موافقت عمل تھی اس لیے کسی کی بات نہ چلی، اب چونکہ شرکت عملی کا بھی ارادہ نہیں تو دقتیں ضرور پیش آئیں گی، اب تین صورتیں محتمل ہیں ایک یہ کہ ایسے مواقع پر کوئی حیلہ کر دیا کروں گا مگر اس کا ہمیشہ چلنا محال ہے، دوسرے یہ کہ صاف مخالفت کی جائے مگر اس میں نہایت شور وفتنہ ہے جس کی حد نہیں دنیوی مضرت یہ ہے کہ اس میں جہلاء عوام سے ایذاء رسانی کا اندیشہ ہے۔

دینی مضرت یہ کہ اب تک جوان لوگوں کے عقائد واعمال کی اصلاح کی گئی سب بے اثر و بے وقعت ہو جائے گی، اس بدگمانی میں کہ یہ شخص تو وہابی ہے، اب تک پوشیدہ رہا، تیسری صورت یہ کہ یہاں کا تعلق ملازمت ترک کر دیا جائے اور میں تو اس صورت کو بلا انتظار حکم عالی اختیار کر لیتا مگر دو امر کا خیال پیدا ہوا ایک یہ کہ خود سبب معیشت کو ترک کرنا اکثر موجب ابتلاء وامتحان ہوتا ہے کہ خدا جانے اس کا تحمل ہو یا نہ ہو اور اموال موروثہ کا تیا، پانچا پہلے سے کر چکا ہوں اور دوسری جگہ تعلق ملازمت سے اعلیٰ حضرت منع فرما چکے ہیں اور میرا بھی دل نہیں چاہتا۔

دوسرا خیال یہ ہوا کہ بظاہر پھر بقاء مدرسہ کا دشوار ہے اور یہاں دین کا چرچا عوام وطلباء میں اس مدرسہ ہی کے سبب ہے ورنہ عوام میں دہریت خواص میں فلسفیت کا بڑا زورتھا حضور کے امر سے یہ دونوں اندیشے مرتفع ہوجائیں گے یعنی انشاءاللہ مجھ کو بھی دشواری پیش نہ آئے گی، یا اگر آئے گی تو اس کے برداشت کی قوت ہوجائے گی اور مدرسہ بھی حضور کی دعا سے چلتا رہے گا، اب جو ارشاد ہو عمل میں لاؤں۔

یہاں ربیع الاول وربیع الآخر میں ان مجالس کی زیادہ کثرت ہے سو اگر شق ثالث کا حکم ہو تو اختتام صفر تک اس کا انتظام کرلوں، حقوق وغیرہ ادا کروں مدرسہ کا کوئی مناسب انتظام بتدریج کردوں اور اب سے انشاء اللہ تعالیٰ کوئی نیا کام بلا استجازت حضرت والا کے وقوع میں نہ آئے گا اور اگر غلطی سے کوئی امر صادر ہوجائے تو بے تکلف احقر کو متنبہ کردیا جایا کرے، انشاء اللہ تعالیٰ امتثال امر میں کوتاہی نہ ہوگی۔

اب جواب عریضہ کے ساتھ اس امر سے بھی اطمینان فرمادیا جائے کہ اب تو حضور کو کسی قسم کی ناخوشی اس خادم سے نہیں ہے زیادہ حد ادب بخدمت مولوی محمد یحییٰ صاحب سلام مسنون۔

اشرف علی

از کانپور: ۲۹؍محرم ۱۳۲۵ھ انتہی

اس کے جواب میں حضرت قدس سرہ نے مولانا کے اس رجوع الی الحق کا شکریہ اور اس پر شاباش تحریر فرمائی اور جواب الجواب میں مولانا مدظلہ کی طرف سے شکریہ آکر کتابت ختم ہوئی۔[1]

---

[1] ماخوذ از تذکرۃ الرشید ۱؍۱۱۶ تا ۱۳۶

مکاتبت نمبر (۲)

شارح حدیث حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی مکاتبت

مسائلة اهل الخلة فی مسئلة الظلة (یعنی حکم سائبان در مسجد)

(سوال ۷۷۰) بعد الحمد والصلوۃ، اس احقر نے مسجد پیر محمد والی کی چار سہ دریوں کے سامنے ٹین کا سائبان ڈلوایا تھا ان میں ایک سہ دری جنوبی شمال رویہ مسجد کے متصل ہے اس کے سائبان کے متعلق بعض حضرات اکابر سے بطور تحقیق کچھ خط و کتابت ہوئی اس کو اس غرض سے نقل کرتا ہوں کہ اہل علم سے اس باب میں مزید تحقیق کر لی جائے اور میرے قول وفعل کو حجت نہ سمجھا جائے، میں نے اپنی فہم کے مطابق کہا ہے اور کیا ہے۔ **وسميتها بما سميتها اشارة إلى الاسم السمى نواث الكابر نخبة الأكابر۔** (اشرف علی)

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کا مکتوب گرامی

مکرم ومحترم سندی ادام اللہ تعالیٰ فیوضکم ،السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی سہ دری کے سائبان کے متعلق مجھ کو خلجان ہے میں اس کو ناجائز سمجھ رہا ہوں اور آپ جائز، مولوی ...... کی تقریر کچھ فہم میں نہیں آئی، اس لیے مکلّف خدمت ہوں کہ مفصل کیفیت اس کی تحریر فرمائیں، کہ جنوبی سہ دری داخل مسجد ہے یا خارج؟ اور مسجد کے ساتھ اس کی تعمیر ہے یا بعد میں تعمیر کی گئی؟ یا اس کا کوئی حصہ داخل مسجد ہے، بعد تفصیلی علم کے اگر خلجان رہا تو عرض کروں گا۔ والسلام۔

۳۰ رشوال ۱۳۳۱ھ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب کا جواب

(بعد القاب وآداب ودیگر مضامین) مولوی............ سے جو مضمون ذکر کیا تھا وہ مطول تھا اس لیے بوجہ عدم انضباط کے ادا نہیں کر سکے، ملخص اس کا یہ ہے کہ یہ دیوار جس پر سائبان رکھا گیا ہے جزو مسجد ہے اور سائبان بھی بقصد مصلحتِ مسجد ڈالا گیا ہے، اور وہ مصلحت یہ ہے کہ اکثر ایام میں ظہر کی جماعت باہر کے درجہ میں ہوتی ہے تو صف اول پر تو سائبان قدیم کا سایہ ہوتا ہے لیکن دوسری صف جو بچوں کی ہوتی ہے، زیادہ بچے دھوپ میں ہوتے تھے گو بضرورت وہ اس دیوار کے سایہ میں کھڑے ہوتے تھے مگر وہ سایہ کافی نہ ہوتا تھا اب وہ اس سائبان کے سایہ میں آرام سے کھڑے ہو جاتے ہیں، البتہ اس دیوار میں ایک پرانی غلطی اکابر کے وقت کی ہے کہ اس سہ دری کی کڑیاں اس پر رکھی ہیں سو اس غلطی کے تدارک کا بھی خیال ہے اس طرح سے کہ شرقی غربی دیوار پر ایک گاٹر رکھ کر کڑیوں کو اس پر ٹکا دیا جائے، والسلام۔

(اشرف علی)

حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب کا مکتوب گرامی

مکرم ومحترم دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

سائبان مسجد کے متعلق جناب نے دو مقدمے تحریر فرمائے، اول یہ کہ دیوار جس پر سائبان رکھا ہوا ہے جزو مسجد ہے، دوسرا مقدمہ یہ کہ سائبان بھی بقصد مسجد ڈالا گیا ہے، ان دونوں مقدموں میں زیادہ اہم پہلا مقدمہ ہے، یہ مقدمہ تا وقتیکہ دلیل سے ثابت نہ ہو، تصفیہ نہیں ہو سکتا، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خلاف اقوی ہے، کیونکہ یہ دیوار جس پر سائبان رکھا گیا ہے یہ جزو مجموعہ سہ دری ہے جو خارج ہے اور جزو خارج خارج، علاوہ اس کے اس کا جزو مسجد ہونا غیر معقول ہے،

کیونکہ اگر یہ دیوار مسجد کی ہوتی تو اس میں تین در ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی، پھر سہ در خود شہادت دے رہے ہیں کہ اس دیوار کو جس میں در ہیں مسجد سے کوئی علاقہ نہیں اور اس کے ساتھ جب یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس دیوار کا سلسلہ بلا انقطاع شرقی جانب میں دور تک چلا گیا ہے جو یقیناً خارج مسجد ہے تو یہ حصہ بھی داخل مسجد نہیں ہوسکتا، ماوراء اس کے میں نے یہ عرض کیا تھا کہ یہ دیوار مسجد کے ساتھ تعمیر ہوئی ہے، یا بعد میں؟ پس اگر یہ دیوار اب فرش مسجد پر بنائی گئی ہو تو بھی داخل نہیں ہوسکتی، ہاں اگر یہ امر ثابت ہوجائے کہ اول یہ دیوار لب فرشِ مسجد پر احاطۂ مسجد کے لیے قائم کی گئی تھی اور بعد ازاں اس میں در بنائے گئے تو البتہ یہ دیوار دیوارِ مسجد ہوسکتی، لیکن اس صورت میں بھی شرعاً یہ امر ضروری ہوگا کہ اس کے در بند کئے جائیں اور اس کو سہ دری کی دیوار نہ قرار دی جائے کہ جو خارج از مسجد ہے۔

بالجملہ حضرت غور فرمائیں، یہ کسی طرح معقول نہیں ہے کہ دیوار جزو مسجد ہے اور در حقیقت یہ اکابر کی غلطی نہیں ہے انہوں نے اس دیوار کو خارج خیال فرما کر اس پر کڑیاں رکھی ہیں، اور یہ خیال ان کا صحیح تھا کہ یہ دیوار خارج مسجد ہے کیونکہ خارجی سہ دری کی ہی دیوار ہے، اس پر سائبان کا ڈالنا یہی غلطی ہے، دوسرا مقدمہ جو تحریر فرمایا اس میں کلام کی چنداں ضرورت نہیں اور نہ اس سے اشکال رفع ہوسکے۔

فقط والسلام (خلیل احمد)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب کا جواب

(بعد آداب والقاب کے) دیوار کو جو میں نے جزو مسجد لکھا وہ اس بنا پر کہ وہ فرش مسجد پر بنی ہوئی ہے جیسا کہ حدود متقابلہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے گو بعد میں بنائی گئی، چنانچہ ایک بار میں نے حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں بھی یہی شبہ پیش

کیا تھا کہ صورت مسجد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوار حدود مسجد کے اندر داخل ہے پھر خارج مسجد کی کڑیاں اس پر کیسے رکھی گئی ہوں گی؟

حضرت نے فرمایا ہاں، اب غور کرنے سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اس وقت کسی کو بھی خیال نہیں ہوا، اس ارشاد سے وہ خیال دل میں متمکن ہو گیا تھا پس اگر اس بنا پر یہ دیوار جزو مسجد ہو تو کڑیوں کا اس پر رکھا جانا پرانی غلطی ہوگی، جس کو میں نے عریضۂ سابقہ میں عرض کیا تھا، مگر اس صورت میں سائبان مسجد کا رکھا جانا کچھ بھی حرج نہ ہوگا، اور اگر اس سے قطع نظر کر کے دیوار کو خارج مسجد کہا جائے (بناء علی القرائن المذکورۃ فی المکتوب السامی) تو اس وقت پھر سائبان کا بمصلحت مسجد اس پر رکھا جانا اور بھی سہل ہوگا، کیونکہ غیر مسجد کو مسجد کے لیے مشغول کرنے میں کوئی وجہ منع کی نہیں معلوم ہوتی اور کڑیوں کا رکھا جانا بھی غلطی نہ ہوگی، البتہ اس تقدیر پر صرف ایک اشکال باقی رہے گا کہ جو دیوار جزو مسجد نہیں ہے اس کو فرشِ مسجد پر بنانے سے غیر مسجد کے ساتھ مسجد کو مشغول کیا جس کا اِحداث گذشتہ غلطی ہے، اور اِبقاء حالی غلطی ہے، تو اس کی تلافی میرے خیال میں یہ آتی ہے کہ اس وقت سب اہل محلّہ مل کر اس دیوار کو مسجد کا جزو قرار دیدیں، اور سہ دری کی کڑیوں کے لیے ایک گاٹر شرقی و غربی دیوار پر رکھ دیا جائے کیونکہ دیوار کے ہدم میں وقف کا حرج عظیم ہے، اسی طرح در بند کر کے سہ دری کی تعطیل میں بھی یہی اضرار بالوقف ہے۔ والسلام

(اشرف علی) ٦/ ذی قعدہ ١٣٣١ھ

حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب کا مکتوب گرامی

مکرم و محترم مصدر مکارم دام فضلکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

گرامی نامہ موجب برکت ہوا، کئی روز تک تو یہ خیال رہا کہ مسئلہ کے متعلق کچھ عرض کروں یا نہ کروں، مبادا تکرار موجب بار ہو، بالآخر یہ خیال ہوا کہ اپنا خیال ایک دفعہ

اورعرض کردوں، اس وقت مجھ کو دوامر عرض کرنے ہیں ایک تو دیوار کے متعلق کہ مسجد ہے یا نہیں، دوسرے سائبان کے متعلق کہ اگر دیوار کو دیوار مسجد قرار دیا جائے تو سائبان اس پر ڈالنا جائز ہے یا ناجائز، حضرت گنگوہی کے یہاں دیوار کے متعلق جو تذکرہ ہوا اس سے اتنا معلوم ہوا کہ بظاہر دیوار بعد میں فرش مسجد پر بنائی گئی ہے، جس کا اس وقت کسی کو بھی خیال نہیں ہوا، اور اب بظاہر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ مسجد پر خارجی دیوار کا بنانا قدیم غلطی ہے، پس واقعی سہ دری کی دیوار جب مسجد پر بنائی گئی تو وہ بوجہ اس کے کہ خارجی سہ دری کی دیوار ہے مسجد پر اس کا ہونا ناجائز تھا تو صرف کڑیوں کا اس پر رکھا جانا یہ پرانی غلطی نہیں بلکہ غلطی تو یہ ہوئی کہ خارجی دیوار مسجد پر بنائی گئی۔

اب یہ بات کہ اگر اس دیوار کو اہل محلّہ متفق ہو کر مسجد میں داخل کرنا چاہیں تو جزو مسجد ہو سکتی ہے یا نہیں؟ مجھ کو اس میں شرح صدر نہیں ہوا، مگر ہاں اس قدر خیال ضرور ہے کہ محض گاٹر ڈال کر اور کڑیوں کو اس پر ٹھہرا کر جدا کر دینے سے داخل مسجد نہ ہو سکے گی تاوقتیکہ اس دیوار کا اتصال تربیع جو دونوں جانبوں شرق وغرب میں ہے وہ غیر مسجد سے منفصل نہ ہو جائے، ہاں اگر گاٹر ڈال کر کڑیاں اس پر رکھ دی جائیں اور اتصال تربیع بھی منفک کر دیا جائے تو اس وقت کیا عجب ہے کہ وہ دیوار باتفاق اہل محلّہ دیوار مسجد قرار پا سکے۔

اب رہی دوسری بات کہ جب یہ دیوار دیوارِ مسجد ہو جائے تو اس پر سائبان ڈالنا جائز ہوگا یا نہیں، میرے نزدیک سائبان ڈالنا اس وقت بھی جائز نہ ہوگا کیونکہ عرفاً سائبان محض دیوار کے لیے نہیں ڈالا جاتا نہ تابع دیوار ہوتا ہے بلکہ تابع مجموعۂ مکان ہوتا ہے جس مکان پر سائبان ڈالا جاتا ہے، پس صورت موجودہ میں سائبان سہ دری کا تابع ہے نہ کہ دیوار مسجد کا، لہٰذا ناجائز ہونا چاہئے، اور اگر منفعت پر نظر کی جائے تو بہ نسبت منفعت مسجد منفعت سہ دری اقوی اور اہم ہے کیونکہ سہ دری کے بیٹھنے والوں کی بھی راحت مدنظر ہے اور مسجد کے نمازی بچوں کی بھی راحت کا خیال ہے، لیکن اس غرض کے

حصول میں مقصود اہم جماعت یعنی توسط امام کی مخالفت لازم آتی ہے لہٰذا یہ مقصود بھی اس قابل ہے کہ ملحوظ نظر نہ ہو، اور اصل یہ ہے کہ اغراض کو اس میں دخل نہیں کیونکہ مسجد کو غیر مسجد کے استعمال میں لانا گو کسی غرض مسجد ہی کے لیے ہو جائز نہیں ہے۔[1]

فقط والسلام

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب کا جواب

(بعد القاب وآداب) والا نامہ نے مشرف فرمایا، اظہار حق کا تکرار حاشا وکلاّ کہ قلب پر بار ہو، اور بحمد اللہ مجھ کو تو عادت ہے کہ جب کسی امر کا حق ہونا واضح ہو جاتا ہے پھر اپنی رائے پر اصرار نہیں ہوتا، سو اب تک اس کا انتظار ہے جو نہیں ہوا اور مجھ کو بھی تکرار فی الجواب خلافِ ادب معلوم ہوتا ہے مگر تحقیق نے اس پر جری کیا۔

قبل سائبان بننے کے تو وجدان سامی کو بجائے دلیل سمجھ کر اسکا اتباع کرتا مگر مجھ تک اس مضمون کا زبانی پیام صرف بدیں عنوان پہنچا کہ خارج مسجد کا پانی مسجد میں لینے کا محذور لازم آئے گا چونکہ یہ بنا مفقود تھی کیونکہ سائبان کہ جس کا پانی مسجد میں گرتا، مسجد کا جزو بنایا جاتا تھا، سو اس کا پانی مسجد ہی کا پانی تھا اس لیے وہ بنالیا گیا اب بعد بننے کے اس کی تفکیک میں خود شبہ تصرف فی المسجد بالہدم والخراب کی وجہ سے عدم جواز کا احتمال ہو گیا، سو اس احتمال کے رفع کے لیے نہایت صریح دلیل کی جو کہ کافی شافی ہو ضرورت ہے جواب تک نہیں ملی، دیوار کے متعلق جو کچھ میں نے عرض کیا تھا وہ محض تبرعاً تھا جس کے لکھنے کی اصل وجہ تو استفسار گرامی کا جواب تھا اور ساتھ ہی یہ خیال بھی شامل ہو گیا تھا کہ اس کی تحقیق ہو جاوے گی، شاید کوئی صورت اس پرانی غلطی کی اصلاح کی نکل آئے، باقی نفس مسئلہ واقعہ میں اس کو کوئی دخل نہیں اور سائبان کا جواز اس پر موقوف نہیں کیونکہ اگر وہ جزو مسجد نہ ہو، تو اس کو مسجد کے کام میں لانا بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا جیسا کہ عریضۂ سابقہ میں عرض کیا ہے، اور ظاہر بھی

[1] امداد الفتاویٰ، فتاویٰ خلیلیہ ص:۱۵۸

ہے کہ اگر مسجد میں شامیانہ کھڑا کیا جاوے اور اس کی طنابیں محلّہ کے مکان میں باندھ دی جاویں تو بلاشبہ درست ہے یا فناء مسجد کی کسی عمارت میں باندھ دی جاویں تو اس کا جواز اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے اس لیے دیوار کے قصہ کو چھوڑ کر نفس مسئلہ کے متعلق عرض کرتا ہوں، سو عرفاً اس کا تابع سہ دری ہونا اور تابع بہ حکم متبوع ہوتا ہے سو میرے خیال میں اس عرف کی مزاحم نیت بانی کی ہوسکتی ہے اس کی نظیر یہ ہے کہ اگر کوئی بانیٔ مسجد فرشِ مسجد کے حصۂ اخیرہ کو یہ سمجھ کر (کہ لوگ یہاں وضو کریں گے اور مسجد میں غسالہ کا گرانا جائز نہیں) مسجد سے خارج رکھنے کی نیت کرے اور امتیاز کے لیے ہیئت تعمیر کی بھی کچھ بدل دے تو یقیناً جائز ہے اور مساجد قدیمہ میں وضو کرنے کی یہی تاویل ہو بھی سکتی ہے ورنہ عامۂ مسلمین کا بے حرمتیٔ مساجد میں مبتلا ہونا لازم آتا ہے حالانکہ حساً وصورۃً وہ حصہ تابع مسجد بلکہ جزو مسجد ہے اور تابع بحکم متبوع ہوتا ہے تو چاہئے کہ اس وضع عرفی کے اعتبار سے اس کو جزو مسجد کہہ کر اس پر وضو کو جائز نہ کہا جاوے، پس حکم جواز سے صاف ثابت ہوا کہ نیت بانی کی اس عرف کی مزاحم ہوجاوے گی پس یہاں بھی بانی ظلہ نے اس کو سہ دری کا جزو بنانے کی نیت نہیں کی اور یہ امر کہ منفعت جالسین سہ دری کو بھی ہوگی سو گو وقوعاً ایسا ہوگا مگر میرے نزدیک یہاں بھی اس وقوع پر نیت کو رجحان ہوگا اور نیت ہے منفعت مسجد کی، اس کی نظیر یہ ہے کہ تقلیل نز (نمی) کے لیے غرس اشجار کو مسجد میں جائز کہا گیا ہے اور دوسری اغراض کے لیے ناجائز حالانکہ وقوعاً دوسری اغراض بھی متحقق ہوں گی، رہا منفعت سہ دری کا اقویٰ اور اہم ہونا سو اس کا اندازہ پورا پورا حالت سابقہ کے تجربہ پر موقوف ہے کہ بچوں کو زیادہ تکلیف تھی، یا جالسین سہ دری کو، تو واقعی سہ دری والوں کو کچھ بھی تکلیف نہ تھی، دھوپ تو وہاں آتی ہی نہ تھی برسات میں کبھی کبھی بوچھار آتی تھی تو سالہاسال سے اس کے لیے پردوں کا کافی انتظام چلا آتا تھا اور میں نے ہمیشہ

سے التزام کر رکھا ہے کہ مصالح سہ دری کے لیے جو چیز بنی اس کے دام اپنے پاس سے دیتا ہوں چنانچہ پردے اور فرش یہ سب میرے ہی داموں کے ہیں اور اسی لیے باوجود ہزاروں روپیہ مسجد و مدرسہ میں صرف ہوجانے کے سہ دری میں کبھی لپائی تک نہیں کرائی باوجود ضرورت کے، پس اگر سائبان میں مصالح سہ دری کا قصد ہوتا تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کو اپنے پاس سے بناتا بلکہ اس سائبان سے سہ دری میں روشنی کسی قدر کم ہوجانے سے بعض لکھنے پڑھنے والوں کو ان کے کام میں ایک گونہ تکلف ہوگیا، اسی لیے بناء کے قبل سہ دری کے مصالح کا وسوسہ بھی نہیں ہوا بلکہ میں نے تو ان مصالح کے مشورہ پیش کئے جانے کے وقت تصریحاً ان کو رد کردیا کیونکہ بعض نے پیش بھی کیا تھا، البتہ اول مصلحت ذہن میں یہ آئی تھی کہ اس کے مقابل شمالی سہ دری کے سائبان کے بعد اگر یہ سائبان نہ ہوا تو تقابل کی خوشنمائی جاتی رہے گی لیکن اس کے ساتھ ہی اس مصلحت کو ناکافی سمجھ کر تردد تھا کہ اس کے بعد یہ مصلحت ذکر کی گئی اس کو البتہ معتد بہ مصلحت سمجھ کر کام جاری کردیا، رہا توسیط امام کی مخالفت تو عذر حرو مطر میں عفو ہوسکتا ہے، خصوص غیر مکلفین کے لیے اس کی نظیر یہ ہے کہ صلوۃ خلف الصّف منفرداً مکروہ ہے مگر اب فقہاء نے احتمال تجاذب عوام کے سبب اجازت دی ہے کہ اول صف میں سے کسی کو نہ کھینچے تنہا کھڑا ہوجائے تو اس عذر کو رافع کراہت قرار دیا، رہا یہ کہ مسجد کو غیر مسجد کے استعمال میں لانا گو کسی غرضِ مسجد کے لیے ہو جائز نہیں، واقعی اگر ایسا قصداً کرے تو یہ حکم سمجھ میں آتا ہے لیکن اگر اس کا قصد نہ ہو گو کوئی خاص نفع حاصل ہوجاوے تو اس صورت میں اس کا عدم جواز سمجھ میں نہیں آتا اس کی نظیر یہ ہے کہ ایک شخص مسجد کی پشت پر مکان بناوے اور وہ جانب شرق میں اس لیے اپنی دیوار نہ بناوے کہ مسجد کی دیوار غربی پردہ کے لیے کافی ہے تو کیا اس کو ناجائز کہا جائے گا؟ حالانکہ مسجد کا ایک جزو غیر مسجد کے کام میں آیا، یا اگر ایسے ہی

مکان کی دیوار شرقی بھی ہو لیکن ذرہ پست ہو کہ محلے کے بعض ایسے مکانات کی چھت سے سامنا ہوتا ہو جن میں اور اس مکان میں مسجد مذکور حائل ہو اور فرض کیا جاوے کہ بمصلحت راحتِ نمازیان اس مسجد کی چھت اونچی کرنے کی رائے قرار پاوے، اور اس وجہ سے دیواریں بھی اونچی کرنے کی ضرورت پڑے اور پھر اس اونچائی کے بعد اس مکان کا پورا پورا پردہ ہو جاوے، اور پھر اس کی دیوار اونچی نہ کرنی پڑے، اور اتفاق سے وہ مکان والا ہی اس مسجد کا بھی متولی ہو تو کیا اس کو یہ جائز نہ ہوگا کہ اس مسجد کے اونچی کرنے پر کفایت کرے اور اپنی دیوار کو اونچا نہ کرے، حالانکہ یہاں خود اپنی دیوار کو بھی اونچا کر کے مکان کو اس منفعتِ دیوار مسجد کے اثر سے بچا سکتا ہے مگر پھر بھی تنگی نہیں کی جاوے گی اور صورت واقعہ میں تو کوئی ایسی تدبیر بھی نہیں کی کہ سہ دری کو اس سائبان کے اثر سے بچایا جا سکے تو ایسے تعذر میں تو بدرجۂ اولیٰ تنگی نہ ہوگی۔

والسلام خیر ختام

۱۲؍ ذی قعدہ ۱۳۳۱ھ

تنبیہ:

گو پھر اس معروض کا جواب نہیں آیا مگر اس جواب نہ آنے کو حجت نہ سمجھا جاوے کیونکہ اس کا سبب کوئی عارض بھی ہو سکتا ہے مثلاً وہی امر جو کہ مکتوب سوم کے شروع میں مذکور ہے، اس لیے اب بھی ضرورت ہے کہ اس باب میں اہل علم سے مزید تحقیق کر لی جاوے، جیسا کہ تمہید میں عرض کیا گیا فقط۔[1]

تنبیہ: مسائلہ اہل الخلہ میں میری آخری تحریر کو قول فیصل نہ سمجھیں، مستقل تحقیق کر لیں۔[2]

---

[1] امداد الفتاوی جلد دوم، ص: ۶۲۸ تا ۶۳۴ [2] بوادر النوادر ص ۴۲۸

مکاتبت نمبر ۳

مسئلۂ تصویر سے متعلق حکیم الامت حضرت تھانویؒ

اور ایک عالم صاحب کی مکاتبت

اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کا محاکمہ[1]

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس باب میں کہ زید وعمرو میں حسب ذیل مکاتبت ہوئی اس میں کس کی تقریر حق ہے، اور اگر زید کی تقریر حق ہے تو عمرو کی اخیر تقریر کا کیا جواب ہے؟ وجہ اس مکاتبت کی یہ ہوئی کہ عمرو نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ پشت کی طرف سے فوٹو لینے میں جس میں چہرہ نہ آوے گنجائش معلوم ہوتی ہے اور درمختار کی روایت محوۃ الوجہ سے استدلال تھا اس پر زید کی تقریر ہوئی پھر اس پر آگے سلسلہ چلا۔

---

(۱) محاکمہ ہذا کے متعلق حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی قدس سرہ ''خوان خلیل'' میں مسئلہ نمبر ا کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں میرا ایک دوست سے اس مسئلہ میں اختلاف ہوا کہ پشت کی طرف سے فوٹو لینے میں جس میں چہرہ نہ آوے گنجائش ہے یا نہیں، جانبین سے مکاتبت کا سلسلہ چلتا رہا آخر میں احقر نے اس دوست کو مولانا (خلیل احمدؒ) کے فیصلہ پر راضی کر کے تحقیق مسئلہ کی درخواست کی، مولانا نے خوشی سے قبول فرما کر مسئلہ کا فیصلہ کر دیا، چنانچہ ہم دونوں نے قبول کر لیا، یہ محاکمہ تتمہ جلد رابع فتاوی امدادیہ کے اخیر میں شائع ہو چکا ہے، اس محاکمہ کی تمہید میں مولانا کی عبارت قابل دید ہے، وہی ہذہ۔

بندۂ ناچیز باعتبار اپنے علم وفہم کے اس قابل نہیں کہ علماء اعلام کے اختلافات کا فیصلہ کر سکے، مگر ہاں امتثالاللامرالشریف اس مسئلہ میں جو کچھ خیال میں آیا عرض کرتا ہوں الخ۔

فائدہ: تواضع اور اظہار حق میں اس طرح جمع کرنا جس درجہ کا کمال ہے ظاہر ہے انتہی خوان خلیل ص:۸۔

تقریر زید

تصویر کشی کی فقہاء نے ہر طرح ممانعت کی ہے، خواہ چھوٹی تصویر ہو خواہ بڑی، مستبین الاعضاء ہو یا غیر مستبین الاعضاء ہو، فرق کراہت صلوۃ میں ہے، اور استعمال میں یا گھر کے رکھنے میں نہیں، ''اِن التصویر یحرم ولو کانت الصورة صغیرة کالتی علی الدراهم أو کانت فی الید او مستترة اومهانة مع ان الصلوة بذلک لاتحرم بل ولا تکره لان علة حرمة التصویر المضاهاة لخلق الله وهی موجودة فی کل ما ذکر وعلة کراهة الصلوة بها التشبه وهی مفقودة فیما ذکر کما یأتی اھ شامی:۲،هذا کله فی اقتناء الصورة واما فعل التصویر فهو غیر جائز مطلقا لانه مضاهاة لخلق الله تعالیٰ کما مر اھ شامی۔

باقی یہ امر کہ پشت کی تصویر کو محوۃ الوجہ پر قیاس کر لیا جائے، اس کی نسبت احقر کو یہ وہم ہے کہ منہ مٹا دینے سے ذی روح کی تصویر نہیں رہتی، اور اسی وجہ سے ایسے عضو کے کاٹ دینے سے جس سے زندگی باقی نہ رہے شامی میں اجازت دی ہے اور ممحوة عضو لا یعیش بدونه اه در مختار وقید بالرأس لانه لا اعتبار بازالة الحاجبین والعینین لانها تعبد بدونه اھ شامی، اور اسی وجہ سے عالمگیری میں لکھا ہے کہ محو کے لیے شرط ہے کہ رأس کا نشان بھی نہ رہے، وقطع الرأس ان یمحی رأسها بخیط یخاط علیها حتی لم یبق للرأس اثر اصلا اھ عالمگیری کی ان عبارتوں سے اور نیز علت مضاہات سے یہ شبہ پڑتا ہے کہ پشت پر سے پوری تصویر لینا جائز ہے، اور محوۃ الرأس پر اس کا قیاس بعید ہے اس لیے اس تصویر کے کھینچنے میں گنجائش سمجھ میں نہیں آتی، غایت مافی الباب یہ کہ اگر کسی چھوٹے نقشہ میں مستبین الاعضاء نہ ہو تو اس کے اوپر، یا داہنے بائیں نماز میں کراہت نہ ہوگی۔

شبہات عمرو برتقریر زید

۱- مسلم ہے مگر مجھ کو شبہ یہ ہے کہ وجہ یا رأس نہ ہونے کے وقت وہ تصویر ہی نہیں رہتی بلکہ پھول یا شجر کے حکم میں ہے، اسی لیے التصویر یحرم کے بعد جو تعمیم کی ہے اس میں صغر واستتار واہانت وغیرہ کو ذکر کیا ہے، یا نہیں کیا ہے، **اَوْ مفقودة الوجه او الرأس او عضو لا تعيش بدونه۔**

۲- اگر اس کلمہ کو عام لیا جائے تو اس کے قبل درمختار میں **اولغير ذی روح** بھی مذکور ہے اس کو بھی عام ہونا چاہئے، حالانکہ یقیناً اس کا اصطناع جائز ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ تعمیم ذی روح میں ہے اور (۱) میں لکھا جا چکا ہے کہ فقدان وجہ یا رأس کے وقت وہ ذی روح میں داخل نہیں اور اس میں مضاہاۃ مخصوصہ کہ تصویر ہی میں ہے نہیں ہے (۳) پھر منع کی کیا وجہ ہے؟ (۴) عالم گیری سے مطلقاً یہ ثابت نہیں ہوتا اس نے صرف قطع رأس کی تفسیر کی ہے، چنانچہ اس کی عبارت میں تصریح ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ محو وجہ بھی بدون محو رأس معتبر نہیں اور درمختار میں مقطوعۃ الرأس کے بعد او الوجہ حرف تردید سے کہنا اس کے معتبر ہونے میں صریح ہے اور (۲) میں عدم مضاہاۃ مذکور ہو چکا ہے۔

اعتراضات زید بر شبہات عمرو

جو کچھ احقر کو شبہ ہوا اس کا منشا صرف اس قدر ہے کہ جو تصویر مع وجہ کے ہو اس کے وجہ کو مٹا دینے سے وہ تصویر ذی روح ہو جانے سے خارج ہو جاتی ہے، اور جو تصویر پشت کی جانب سے کھینچی گئی ہے اس میں گو وجہ نہیں آیا لیکن پورے آدمی کی تصویر ہونے کی وجہ سے داخل حرمت ہونا چاہئے، اور اس کو محوۃ الوجہ پر قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ جب صرف سامنے کے رخ سے تصویر کھینچی جاوے تو البتہ وجہ کے

مٹادینے سے اب وہ ذی روح باقی نہیں رہا، کیونکہ سر بالکل جاتا ہی رہا اور قفا ہے نہیں اور جب کہ قفا کی جانب سے تصویر لی گئی ہے تو پورے آدمی کی تصویر ہوئی، اور وجہ کا نہ ہونا مضر نہیں، جیسے کہ وجہ والے میں قفا کا نہ ہونا مضر نہیں ویسے ہی قفا والی تصویر میں وجہ کا نہ ہونا مضر نہیں غرضیکہ قفا والی تصویر پورے انسان کی تصویر ہے، اگر یہ خیال کیا جائے کہ وجہ کے بغیر انسان زندہ یا باقی نہیں رہتا تو اسی طرح صرف وجہ سے بھی انسان زندہ نہیں رہ سکتا، تاوقتیکہ قفا نہ ہو، اس سے تو لازم آتا ہے کہ صرف تصویر کا مجسمہ حرام ہو اور کاغذ وغیرہ پر تصویر حرام نہ ہو، اس لیے کہ انسان بغیر پشت وقفا کے زندہ نہیں رہ سکتا۔

جواب عمرو براعتراضات زید

قولہ: لیکن پورے آدمی کی تصویر الخ

اقول: اسی میں تو کلام ہے میں تو یہ سمجھتا ہوں جیسا (۱) میں لکھ چکا ہوں کہ وجہ یا رأس نہ ہونے کے وقت وہ تصویر ہی نہیں رہتی الخ۔

قولہ: وجہ کا نہ ہونا الی قولہ جیسے کہ وجہ والی، الخ۔

اقول: یہ خیال اس لیے مخدوش ہے کہ تصویر میں معظم مقصود وجہ مع الرأس ہی ہے کہ معرفت اسی سے ہے اور مجمع محاسن وہی ہے، چنانچہ اسی بناء پر شائقان تصویر صرف وجہ ہی کی تصویر لینے اور رکھنے کو بھی کافی سمجھتے ہیں، بخلاف قفا کے کہ اس میں یہ بات نہیں خصوصاً جب کہ پشت سے تصویر لینا اتفاقاً نہ ہو بلکہ اسی قصد سے ہو کہ وجہ کی ہیئت نہ آوے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ ایسا ہی ہے جیسا کہ بالقصد محو کر دیا ہو جو حاصل ہے محوۃ الوجہ او الرأس کا اور قفا نہ آنا اکثر بلا قصد ہوتا ہے اس لیے محوۃ کے حکم میں نہیں ہوسکتا، پس قفا و وجہ میں دو فرق ہوئے اس لیے یہ قیاس، قیاس مع الفارق ہے۔

قولہ: اسی طرح صرف وجہ سے بھی الخ۔

اقول: فقہاء کا **عضو لا تعیش بدونہ** پر جو کہ ایسا قاعدہ کلیہ ہے کہ وجہ و رأس بھی اس میں داخل ہوسکتا تھا، کفایت نہ کرنا اور محوۃ الوجہ او الرأس کا مستقلاً لانا مشعر اس امر کا معلوم ہوتا ہے کہ وجہ ورأس کا وجود یا عدم محض اسی حیثیت سے معتبر نہیں کہ وہ عضو لاتعیش بدونہ کا وجود یا عدم ہے، ورنہ اس کو جدا گانہ ذکر کرنے کی حاجت نہ تھی، بلکہ وجہ ورأس میں قطع نظر حیثیت مذکورہ سے نیز ایک خاص شان خصوصیت ہے کہ صرف اس کے مجموع کا وجود حکما پوری تصویر کا وجود ہے گو وہ اعضاء لایعیش بدونہا سے خالی ہو، اسی طرح اس مجموع کا عدم پوری تصویر کا عدم ہے، گو بقیہ اعضاء پر مشتمل ہو پس جب مجموع وجہ ورأس ہوگا گو قفا وغیرہ نہ ہو اس کو تصویر کہا جائے گا، اور جب مجموع وجہ ورأس نہ ہوگا گو قفا وغیرہ ہو اس کو تصویر نہ کہا جائے گا، فقط آخر جمادی الاولیٰ ۱۳۲۸ھ۔ **انتھی ما قال زید وعمرو فبینوا مالحکم فیما قالا۔؟**

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کا محاکمہ

الجواب: حامداً و مصلیاً!

بندۂ ناچیز باعتبار اپنے علم وفہم کے اس قابل نہیں ہے کہ علماء اعلام کے اختلاف کا فیصلہ کر سکے، مگر ہاں امتثالاللامر الشریف اس مسئلہ میں جو کچھ خیال میں آیا ہے عرض کرتا ہے۔

روایات فقہیہ کے دیکھنے سے یہ امر واضح ہے کہ عمل تصویر اور اقتناء تصویر میں فقہاء کے نزدیک فرق ہے تصویر سازی کو مطلقاً حرام اور ناجائز تحریر فرماتے ہیں اور اقتناء تصویر (کو) مطلقاً ناجائز نہیں لکھتے، بلکہ بعد تغیرات جائز تحریر فرماتے ہیں لہٰذا ان وجوہ سے زید کا قول حق معلوم ہوتا ہے کہ فوٹو لینے میں کسی جاندار کے خواہ وجہ کی طرف سے لیا جائے، یا پشت کی طرف سے عدم جواز ہوا اگر چہ زید کی تعمیم مستبین

الاعضاء یا غیر مستبین الاعضاء ان دونوں کی مساوات روایات سے مفہوم نہیں ہوتی، اور روایۃ ترمذی وابوداود جس کے الفاظ یہ ہیں، **فمر براس التمثال الذی علی باب البیت امر یقطع فیصیر کھیئۃ الشجرۃ** ۔(ابوداؤد، بذل المجہود ص ۷۰ ج ۵ ،ترمذی ص ۱۰۴) اس امر کے اوپر دلالت کرتی ہے کہ بعد قطع رأس تصویر ذی روح کی باقی نہیں رہتی، بلکہ وہ کالشجرۃ ہوجاتی ہے حالانکہ وہ تصویر ظاہراً حیوان ہی (کی) تصویر معلوم ہوتی ہے، اور مضاہاۃ بخلق اللہ جو علۃ حرمت ہے متحقق معلوم ہوتی ہے، اور نیز مخصوص رأس کا مختلف فیہ ہونا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ جب بعض اجزاء اصلیہ مفقود ہوگئے تو وہ تصویر ذی روح کی تصویر نہ رہی، ردالمختار میں ہے **وفیہ اشعار بانہ لا تکرہ صورۃ الرأس وفیہ خلاف کما فی اتخاذھا کذا فی المحیط** (ص ۴۳۵ ج ۱) معلوم ہوتا ہے کہ بعض فقہاء نے ایسے جزو کا حکم (مثل) کل (کے) قرار دیا ہے اور ذی روح قرار دے کر اس کو منع کیا ہے اور بعض نے اس کو غیر ذی روح قرار دیا ہے اور جائز فرمایا، بندہ کے نزدیک ایسے اختلاف کی صورت میں اس خلاف کو نزاع لفظی پر محمول کیا جائے اور حرمت کا محمل عام اس کو قرار دیا جائے کہ جب قصداً کسی ذی روح کی تصویر پشت کی جانب سے لی جائے تو بروئے اطلاق روایات ناجائز ہو اور جب کہ تصویر کا لینا مقصود نہ ہو مثلاً کسی مکان یا جنگل یا پہاڑ کی تصویر لینی مقصود ہے اور پشت کی جانب سے کسی انسان کی تصویر آگئی یا اس قدر صغیر ہے کہ جو قریب سے بھی بدشواری فہم میں آتی ہے گویا مقدار طیر سے بھی کم ہے تو ایسی صورت میں جائز کہہ دیا جائے (تو) بظاہر کچھ مضائقہ نہیں ۔فقط

واللہ اعلم بالصواب حررہ خلیل احمد عفی عنہ [1]

---

[1] امداد الفتاوی ص:۳۲۹ تا ۳۳۲ ج ۶، فتاویٰ خلیلیہ ص:۲۴۷ تا ۲۵۲

مکاتبت نمبر۴

قرأت متواترہ کے سلسلہ میں مکاتبت

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا مکتوب گرامی

سوال: درمنثور میں روایات ذیل نظر سے گذریں اور تحقیقی جواب تو ان روایات کا ظاہر ہی ہے کہ یہ اخبار آحاد ہیں، اور قراءۃ متواترہ کے مقابلہ میں اخبار آحاد کا اعتبار نہیں کیا جاتا، لیکن اگر کوئی مخالف ان روایات کو پیش کرے تو اس کے لیے کوئی مسکت جواب سمجھ میں نہیں آتا، اگر کوئی جواب ہو تو مطلع فرمائیں، وہ روایات یہ ہیں:

(۱) اخرج الفریابی والحاکم وصححه والبیهقی فی شعب الإیمان والضیاء فی المختارة من طرق عن ابن عباس فی قوله حتی تستأنسوا قال أخطاء الکاتب إنما هی حتی تستأذنوا.

(۲) اخرج ابن جریر وابن الأنباری فی المصاحف عن ابن عباسؓ أنه قرأ افلم ییقن الذین آمنوا فقیل له انها فی المصحف اَفَلَم ییأس فقال الحن الکاتب کتبها وهو ناعس.

(۳) أخرج ابن ابی داؤد عن یحیی بن معمر قال قال عثمان ان فی القرآن لحنا وستقیمه العرب بالسنتها.

(۴) عن قتادة أن عثمان لما رفع إلیه المصحف قال إن فیه لحناً وستقیمه العرب بالسنتها.

(۵) وعن عکرمة قال لما أتی عثمان بالمصحف رای فیه شیئا من لحن فقال لو کان المملی من هذیل والکاتب من ثقیف لم یوجد فیه هذا.

(۲) واخرج ابو عبید وغیرہ قال سألت عائشة عن لحن القرآن والمؤتون الزکوة وان هذان لساحران فقالت یا ابن اختی هذا عمل الکتاب اخطئوا فی الکتاب. فقط (اشرف علی)

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کا جواب

الجواب: مخدوم ومحترم حضرت مولانا الحافظ الحاج مولوی اشرف علی صاحب دام مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ عزت بخش ہوا، درمنثور کی روایات پہلے بھی نظر سے گذری ہیں، بندہ کے نزدیک علاوہ اس جواب کے دوسرا جواب یہ ہے کہ قراءت ان حضرات صحابہؓ کو نہ بطور تواتر ثابت ہوئی، اور نہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی اور جب بطور آحاد پہنچی اور خلاف قانون زبان دیکھی یا باعتبار ظاہر معنی صحیح نہ دیکھا تغلیط کردی، چنانچہ روایت حضرت عائشہؓ جو تمام صحاح میں مروی ہے حَتّٰـــــــی اِذَا اسْتَیْـئَـسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ کُذِبُوْا تخفیف کی نسبت کس قدر استنکاف فرماتی ہیں۔(۱) اور بندہ کے ناقص خیال میں اس میں کوئی الزام ان پر نہیں۔

(۱) رواه البخاری عن عائشة رضی الله عنها ص: ۶۸۰ جلد ثانی مطبع نظامی قال اخبرنی عروة بن الزبیر عن عائشة رضی الله عنها قالت له وهو یسألها عن قول الله تعالیٰ حتی اذا ستیئس الرسل قال: قلت (لعائشة) اَکُذِبُوْ أم کُذِّبُوا قالت عائشة: کُذِّبُوْا قلت قد استیقنوا ان قومهم کذبوهم فما هو بالظن قالت اجل لعمری لقد استیقنوا بذلک فقلت لها وظنوا انهم قد کذبوا (مخففة) قالت معاذ الله.

اگر جناب کی رائے میں بندہ کا خیال صحیح ہو یا کوئی اور پسندیدہ جواب خیال میں آوے تو مطلع فرمائیں۔ فقط

خلیل احمد عفی عنہ از سہارنپور ۷/صفر ۱۳۲۵ھ یوم جمعہ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب کا مکتوب گرامی

برجواب حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ

سرفراز نامہ نے معزز فرمایا، جواب سے بہت خوش ہوا، بہت سلیس اور بے تکلف ہے مگر تھوڑی دیر کے بعد اس میں ایک خلجان پیدا ہو گیا جس کو روزمرہ لکھنا چاہتا تھا، آج جمعہ کے روز اظہار کا موقعہ ملا۔

وہ یہ ہے کہ یہ یقینی ہے کہ یہ قراءت مثبتہ فی المصاحف اس وقت بھی متواتر تھیں، اور گو علی التعیین یہ قراءت ان کو نہ پہنچی ہوں، مگر اجمالاً ان حضرات کو اتنا معلوم تھا کہ کوئی نہ کوئی قراءت متواتر اس میں ضرور ہے اور اس کی تعیین وطلب بھی اس لیے واجب تھی کہ غیر قرآن کو قرآن میں داخل کرنا جائز نہیں، پس انہوں نے طلب نہیں کی تو ترک واجب لازم آیا، پھر جو قراءتیں قانون کے موافق سمجھیں اور واقع میں اور ان کے نزدیک بھی روایۃً ثابت اور صحیح نہیں تو غیر قرآن کو قرآن میں داخل کرنا لازم آیا، اور اگر طلب کیں تو ظاہر ہے کہ جو قراءت واقع میں ثابت ہے وہی طلب سے متعین ہوگی، پھر محض مخالفتِ قانون سے اس کے انکار کے کیا معنی، بخلاف انکار عائشہؓ کے کہ جس قراءت کو انہوں نے اختیار کیا ہے وہ بھی صحیح اور ثابت ہے اور ہر جگہ تعدد قراءت ضروری نہیں اس لیے دوسری قراءت کی طلب وتعیین ان پر واجب نہ ہوئی نہ ان کو دوسری قراءت کے وجود کا احتمال ناشی عن دلیل ہوا جو طلب واجب ہوتی اور جس طریق سے وہ قراءت بالتخفیف پہنچی وہ طریق قطعی نہ تھا، اور ظاہراً اس میں اشکال معنی کا لازم آتا تھا، اس لیے ان کو انکار کی گنجائش تھی، پس انکار عائشہ مقیس علیہ اسی انکار مقیس کا نہیں بن سکتا ورنہ یوں تو اب بھی جس قراءت کا چاہے انکار اس بناء پر جائز

ہوگا کہ منکر کو خاص بطریق قطعی پہنچا نہیں اور علم اجمالی کافی نہ ہو، اور صحیح قراءت میں کوئی اعرابی یا معنوی اشکال ہو اور اس کا التزام کوئی نہیں کرسکتا۔ (اشرف علی)

الجواب: مخدومی مکرمی مداللہ ظلال مجدکم ،السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جواب عرض کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ آپ بحمداللہ ان علوم عالیہ میں ماہر ہیں اور میں گویا ناواقف ہوں مگر امتثالاً للامر جو کچھ صحیح یا غلط خیال میں گذرا ہے مختصراً عرض کرتا ہوں اگر غلط ہوا تو تصحیح ہی ہوجائے گی، بندہ کے خیال میں یہ مضمون ہے کہ قرآن کی قطعیت کی دو صورتیں ہیں، اول تو بلا واسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تلقّی، دوسرے تواتر، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے تو دونوں صورتوں سے قطعیت ہوسکتی تھی اور تابعین اور مابعد ہم کے لیے صرف تواتر کی صورت باقی رہی، صحابہ نے جس آیت یا حرف کو بلا واسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن لیا ان کے لیے قطعی ہوگیا، بعدازاں اگر آئندہ ان سے بطور تواتر مروی ہوتا گیا قطعیت ہوتی رہی اور جس جگہ سلسلہ تواتر منقطع ہوگیا قطعیت بھی منقطع ہوگئی، تو اب مواضع مبحوث فیہا میں ممکن ہے کہ حضرت عائشہ وغیرہا کو وہ طریق جو اب متواتر ہے یعنی **والمقیمین** وغیرہ نہ پہنچا ہو اور دوسری طرح یعنی **والمقیمون** وغیرہ بلاواسطہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو تو ان پر واجب نہ تھا کہ وہ قراءت متواترہ کی تلاش کرتیں، کیونکہ قطعی قراءت ان کو حاصل تھی، اور اسی وجہ سے کہ غیر قرآن قرآن سے ممتاز رہے اس کا انکار فرماتی تھیں، غایۃ مافی الباب ان کے بعد چونکہ ان سے سلسلہ تواتر نہ چلا لہٰذا ان کے بعد کے لیے قطعیت نہ رہی چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بطور قطع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے **کُذِّبوا** بالتشدید معلوم ہوچکا اور بالتخفیف نہ بتواتر نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بلاواسطہ معلوم ہوا تھا، لہٰذا انکار فرمایا اور اتفاقاً بالتشدید بھی بعدازاں متواتر رہا، اگر بالفرض

متواتر نہ ہوتا تو بھی کچھ حرج نہ تھا، کیونکہ ان کو مرتبہ قطع کا دوسرے طریق سے حاصل تھا، بالجملہ بعد کا تواتر وعدم تواتر صحابہ کی قطعیت کے لیے کسی طرح مزاحم نہیں تو یہ دونوں مقیس ومقیس علیہ برابر ہوئے، ہاں مابعد صحابہ کے لیے یہ صورت ممکن نہیں کیونکہ ان کو بجز تواتر کے قطع کا کوئی ذریعہ نہیں تو اگر وہ انکار کریں تو یقیناً بلا اعتماد کسی قطعی کے انکار قطعی لازم آئے گا ہاں بعض صور میں اگر انکار رسم خط کی طرف راجع کیا جائے تو زیادہ چسپاں ہوتا ہے فقط۔ (خلیل احمد)

سوال حضرت مولانا اشرف علی صاحب بر جواب بالا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ جواب مرقوم سامی میں بوجہ کم علمی اتنا خلجان اور باقی رہ گیا کہ اگر یہ احتمال فرض کیا جائے کہ مواضع مبحوث فیہا میں ان حضرات نے ان کلمات کو بلا واسطہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جس طرح ان کلمات کو سنا تھا یا تو وہ قرآن تھا یا نہیں، شق اول پر بعض قرآن کا ضیاع لازم آیا اور شق ثانی پر ادخال غیرِ قرآن قرآن میں لازم آیا، وکلاہما خلف بخلاف مقیس علیہ یعنی قراءت **کــذّبــوا** بالتشدید والتخفیف کے کہ دونوں قرآن ہیں، چنانچہ دونوں قراءتیں محفوظ ہیں، سردست یہ شبہ ہے، اگر بعد میں کوئی اور امر خیال میں آوے گا تو عرض کروں گا، بار بار تکلیف دیتے ہوئے شرم آتی ہے مگر **انـمـا شـفـاء الـعـی السؤال** اس مکرر تکلیف کو مقتضی ہوتا ہے۔ فقط۔

الجواب: مخدومی حضرت مولانا مولوی اشرف علی صاحب دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، کل یوم یکشنبہ گرامی نامہ عزت بخش ہوا۔

اشکال کے متعلق بندہ کے خیال ناقص میں یہ ہے کہ شق اول اختیار کی جائے کہ مواضع مبحوث فیہا میں یہ کلمات جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے سنے تھے، قرآن تھے لیکن بعد ازاں منسوخ ہو گئے یا بطور تیسیر فرمائے گئے تھے

جس پر حدیث انزل القرآن علی سبعة احرف (شرح السنة مشکوٰۃ) دال ہوسکے۔ بعدہ وہ تیسیر مرتفع ہوگئی، لا رتفاع العلة اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس نسخ یا ارتفاع کی قطعی طور پر اطلاع نہ ہوئی لہٰذا وہ اس اپنے قطعی مسموع پر جمے رہے اور قراءت متواترہ بھی قطعی طور پر نہ پہنچی ہو، اس صورت میں صرف یہ خیال ہوتا ہے کہ بعد نسخ جو غیر قرآن تھا، قرآن کا اعتقاد کرتے رہے مگر ظاہر ہے کہ وہ معذرو تھے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت در باب نسخ عشر رضعات اور بقاء خمس رضعات دلالت کرتی ہے کہ خمس رضاعات قرآن میں موجود ہیں۔ (مسلم شریف ص ۴۶۹) حالانکہ منسوخ ہوچکے تھے، اور نیز عبداللہ بن مسعود کی قراءت والذکر والانثی میں قول واللہ لا اتابعهم (بخاری شریف ص ۷۳۷) اور نیز یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں ان کو قراءت متواترہ پہنچ گئی ہوں اور یہ انکار اس سے سابق ہو، چنانچہ بعض روایات درمنثور سے ان مواقع میں مفہوم ہوتا ہے۔ فقط والسلام،

خلیل احمد عفی عنہ از سہارنپور، یوم دوشنبہ یکم ربیع الاول ۱۳۲۵ھ

جواب از حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جو جواب جناب نے تحریر فرمایا ہے بفضلہ تعالیٰ ہادم اساس اشکال ہے، شبہہ لکھتے وقت میرے خیال میں بھی آیا تھا مگر اب زیادہ تفصیل وتکمیل ہوگئی، حق تعالیٰ فیوض سامی میں برکت فرماویں والسلام۔[1]

اشرف علی

۴ ربیع الاول ۱۳۲۵ھ

[1] ماخوذ از فتاوی خلیلیہ ص: ۳۱۱ تا ۳۱۶

مکاتبت نمبر ۵
دو فرعی مسئلوں سے متعلق

سوال از حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

دو مسئلے فروع میں سے قابل تحقیق ہیں۔

اول مدرسہ میں جو روپیہ آتا ہے اگر یہ وقف ہے تو بقاء عین کے ساتھ انتفاع کہاں ہے، اور (اگر) یہ ملک معطی کا ہے تو اس کے مرجانے کے بعد واپسی ورثہ کی طرف واجب ہے۔

دوم اگر عدت میں کوئی عورت زوج یا احماء پر استطالتِ لسانی کرے تو جواز اخراج عن البیت کسی فقہی کتاب میں منصوص ہے یا نہیں؟

جواب از حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری

(۱) عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال معطین اور آخذین کی طرف سے وکلاء ہیں، لہٰذا نہ اس میں زکوۃ واجب ہوگی اور نہ معطین واپس لے سکتے ہیں۔

(۲) عالمگیریہ کی روایت (**وان کان نصیبها من دار المیت لا یکفیها فاخرجها الورثة من نصیبهم انتقلت**) دال ہے کہ اگر عورت کا حصہ کافی نہیں ہے تو ورثہ اپنے حصہ سے خارج کر سکتے ہیں خواہ استطالت کرے، یہ نہ کرے اور اگر اس کا حصہ کافی ہے تو اخراج نہیں کر سکتے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

خلیل احمد عفی عنہ ۱۸/ جمادی الاخری ۱۳۲۵ھ

سوال از حکیم الامت حضرت تھانویؒ

(۱) عُمّال بیت المال منصوب من السلطان ہیں اور سلطان کی ولایت عامہ ہے اس لیے وہ سب کا وکیل بن سکتا ہے اور مقیس میں ولایت عامہ نہیں، اس لیے آخذین کا وکیل کیسے بنے گا، کیونکہ نہ توکیل صریح ہے نہ دلالۃً ہے اور مقیس علیہ میں دلالۃً ہے کہ سب وہ اس کے زیر اطاعت ہیں اور وہ واجب الاطاعت ہے۔

(۲) مقصود معتدہ مطلقہ کا پوچھنا ہے جس کا سکنیٰ زوج پر واجب ہے اس لیے جواب کا انتظار ہے۔ والسلام

جواب از حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری

(۱) بندہ کے خیال میں سلطان میں دو وصف ہیں ایک حکومت جس کا ثمرہ تنفیذ حدود وقصاص، دوسرا انتظامِ حقوق عامہ، امر اول میں کوئی اس کا قائم مقام نہیں ہوسکتا ہے، امر ثانی میں اہل حل وعقد بوقت ضرورت قائم مقام ہو سکتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ اہل حل وعقد کی رائے ومشورہ کے ساتھ نصب سلطان وابستہ ہے جو باب انتظام سے ہے، لہٰذا مالی انتظام مدارس جو برضائے مُلاّک وطلبہ ابقاء دین کے لیے کیا گیا ہے بالاولی معتبر ہوگا اور ذرا غور فرمائیں انتظام جمعہ کے لیے عامہ کا نصب امام معتبر ہونا ہی جزئیات میں اس کی نظیر شاید ہو سکے۔

(۲) معتدہ طلاق کے لیے کوئی روایت نہیں ملی معذور ہوں، مگر بحر الرائق میں ہے **(واخذ ابو حنیفة بتفسیر ابن عمرؓ ذکره الاسبیجابی وذکر فی الجوهرة ان اصحابنا قالوا الصحیح تفسیرها بالزنی کما فسره ابن مسعود)** اور یہی قول ابن عباس اور اکثر کا لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض استطالت لسان سے اخراج نہیں ہوگا، ہاں ابن عباس سے ایک روایت تفسیر

کبیر میں ہے(وعن ابن عباس الا ان یبذون فیحل اخراجھن لبذائھن وسوء خلقھن فیحل للازواج اخراجھن من بیوتھن)مگر یہ روایت ضعیف ہے اور مذہب میں ماخوذ نہیں۔[1] خلیل احمد عفی عنہ ۵؍رجب ۱۳۲۵ھ

اضافہ از تذکرۃ الرشید

شبہ-: مدرسہ میں جو چندہ وغیرہ کا روپیہ آتا ہے وہ وقف ہے یا مملوک؟ اگر وقف ہے تو بقاء عین واجب ہے، اور صرف بالاستہلاک ناجائز، اگر مملوک ہے اور مہتمم صرف وکیل تو معطی چندہ اگر مر جاوے تو غرباء و ورثاء کا حق ہے اس کی تفتیش وکیل کو واجب ہے، زمانۂ شارع علیہ السلام وخلفاء میں جو بیت المال تھا اس میں بھی یہ اشکال جاری ہے، بہت سوچا مگر قواعد شرعیہ سے حل نہ ہوا، اور مختلف چندوں کو خلط کرنا استہلاک ہوجانا چاہئے، اور مستہلَک ملکِ مستہلِک ہوکر جو صرف کیا جائے اس کا تبرع ہوگا اور مالکوں کا ضامن ہوگا، اگر یہ ہے تو اہل مدرسہ یا امین انجمن کو سخت دقت ہے امید کہ جواب باصواب سے تشفی فرمائیں گے"۔

الجواب: مدرسہ کا مہتمم قیم ونائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسا (کہ) امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے، پس جو شئ کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے، اس کے قبضہ سے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہوگیا، اگر چہ وہ مجہول الکمیۃ والذوات ہوں مگر نائب معین ہے پس بعد موت معطی کے ملک ورثہ معطی کی اس میں نہیں ہوسکتی اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہوسکتا ہے، بہر حال نہ یہ وقف مال ہے اور نہ ملک ورثہ معطی کی ہوگی، اور نہ خود معطی کی ملک رہے گی۔ واللہ اعلم۔

رشید احمد

---

[1] امداد الفتاویٰ ج۶، فتاویٰ خلیلیہ ص ۳۱۹

[2] تذکرۃ الرشید، فتاوی خلیلیہ ص: ۳۱۸ تا ۳۲۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العٰلمین
اللھم صل علیٰ سیدنا ومولانامحمد
وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم

علمی وفقہی مکالمت

انتخاب وترتیب

محمد زید مظاہری ندوی

باب ۷

علمی وفقہی مکالمت

مکالمہ نمبر ا

وقف اور مداخلت فی الدین سے متعلق

تمہید:

چند سال ہوئے بعض اوقاف میں متولیوں کی گڑ بڑ دیکھ کر بعض لوگوں کو موقع مل گیا کہ اوقاف کے متعلق قانون بنانے کی سعی کریں، چنانچہ معمولی تحریک کے بعد ایک تحقیقاتی وفد مقرر ہوا جس نے ۳۰ء میں دورہ کیا، جب وہ وفد یہاں پہنچا تو حضرت اقدس نے اسی وقت ایک مفصل مکالمہ میں نہایت واضح طور سے ثابت فرمادیا تھا کہ قواعد شرعیہ سے حکومت کو ایسا قانون بنانے کا اختیار نہیں۔

یہ مکالمہ نہایت ہی مفید اور محققانہ اصول سے لبریز ہے بعض اجزاء کا خلاصہ مولوی جلیل احمد صاحب نے لکھ لیا تھا وہ یہ ہے:

وفد کی آمد:

غالباً ۳۰ء میں نواب صاحب باغپت کی ہمراہی میں چند اعلیٰ طبقہ کے وکلاء اور رؤسا کا ایک باضابطہ نیم سرکاری وفد حضرت حکیم الامت کی خدمت میں حاضر ہوا جس کے صدر حافظ ہدایت حسین صاحب مرحوم کانپوری تھے اس وفد کا مقصد یہ تھا کہ اوقاف کے متعلق حضرت حکیم الامت سے شرعی تحقیقات کی جائے یعنی یہ معلوم کیا جائے کہ

مسلمانوں کے اوقاف کے انتظامی معاملات میں غیر مسلم حکومت کو دخیل بنانا جائز ہے یا نہیں۔

اس وفد نے تھانہ بھون پہنچنے سے قبل ڈاک میں چند سوالات لکھ کر جو تعداد میں سو کے قریب تھے حضرت کی خدمت میں بھیجے تھے کہ ہم ان سوالات کے جوابات حضور سے لینا چاہتے ہیں۔

مگر حضرت والا کثرت مشاغل کی وجہ سے ان سوالات کو دیکھ بھی نہیں سکے۔

جب ان کی آمد کی تاریخ معلوم ہوئی تو حضرت والا نے ان حضرات کے استقبال کے لیے مولانا شبیر علی صاحب زادمجدہم کو (جو قصبہ کے رئیس اعظم اور حضرت والا کے بھتیجے ہیں) اسٹیشن پر بھیجا اور اس وفد کے قیام کا انتظام بھی حضرت والا نے مولانا شبیر علی صاحب زادمجدہم کے دولت خانہ پر تجویز فرمایا۔

جب وفد کے ارکان تھانہ بھون پہنچ گئے تو حضرت والا خود ان کی قیامگاہ پر گفتگو کرنے کے لیے تشریف لے گئے تاکہ ان کو آنے کی تکلیف نہ ہو۔

پھر ملاقات کے بعد ایک بڑے کاغذ پر ایک یادداشت جس میں چند نمبر بطور اصول موضوعہ کے تھے، لکھ کر جناب حافظ ہدایت حسین صاحب کانپوری بیرسٹر کو جو اس وفد کے صدر تھے دے دی، اور درخواست کی کہ سب حضرات کو پڑھ کر سنا دیجئے کہ ان اصول پر گفتگو ہوگی وہ اصول موضوعہ حسب ذیل تھے۔

نقل یادداشت متعلق تجویز قانون نگرانی اوقاف

نمبرا...... وقف کرنا ایک مالی عبادت اور خالص عبادت ہے جیسے زکوٰۃ دینا مالی عبادت ہے اور خالص عبادت ہے، ردالمحتار شرح الدر المختار میں ہے وکــــذا علی العتق والوقف والاضحیة الخ۔

(نمبر۲) گو وقف کا نفع بعض اوقات عباد کو بھی پہنچتا ہے جب کہ ان عباد کے

لیے کوئی استحقاق مقرر کردے مگر پھر بھی وقف خالص عبادت رہے گا معاملہ نہ ہوگا، جیسے زکوٰۃ خالص نفع عباد کے لیے ہی موضوع ہے، دوسرے مصارف مساجد وغیرہ میں صرف نہیں ہوسکتی، بخلاف وقف کے کہ وہ ان مصارف میں بھی شرط واقف کے موافق صرف ہوسکتا ہے، جس سے ثابت ہوا کہ زکوۃ کا تعلق عباد کے ساتھ بہ نسبت وقف کے زیادہ مگر باوجود اس کے زکوٰۃ خالص عبادت ہے معاملہ نہیں پس وقف خالص عبادت ہونے میں زکوٰۃ سے بھی زیادہ ہے۔

(نمبر۳) جب وقف مثل زکوٰۃ کے بلکہ زکوٰۃ سے بھی زیادہ خالص عبادت ہے اس میں کسی خرابی کا ہونا ایسا ہوگا جیسے زکوٰۃ میں کسی خرابی کا ہونا، اور اس خرابی کی اصلاح کے لیے گورنمنٹ کا دخل دینا ایسا ہوگا جیسا زکوٰۃ کی خرابی کی اصلاح کے لیے گورنمنٹ کا دخل دینا۔

(نمبر۴) اور زکوٰۃ میں ایسا دخل دینا یقیناً دخل فی المذہب ہے اسی طرح وقف میں دخل دینا دخل فی المذہب ہوگا خواہ خود دخل دیا جائے خواہ کسی کی درخواست پر دخل دیا جائے، باقی یہ سوال کہ پھر وقف کی خرابیوں کا کیا انسداد ہو، ایسا ہے جیسا یہ سوال کیا جاوے کہ اگر کوئی نماز یا روزہ یا حج یا زکوٰۃ میں کوتاہی کرے اس کا کیا انسداد ہے، کیا اس کے جواب میں کوئی شخص یہ تجویز کرسکتا ہے کہ گورنمنٹ کو ان کوتاہیوں پر جرمانہ وغیرہ مقرر کرنے کا حق ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس کا انتظام مسلمان بطور خود کرسکتے ہیں خواہ اس کو افہام تفہیم کریں، خواہ اس کو تولیت سے معزول کریں، جب کہ واقف نے ان کو اس قسم کے اختیار دیئے ہوں، خواہ اس سے قطع تعلق کریں اور ایسا نہ کریں تو ان کی کوتاہی ہوگی، گورنمنٹ کو پھر بھی دخل دینے کا حق نہیں۔

نوٹ: نگرانی وقف کے متعلق جو سوالات دائر سائر ہیں وہ اس پر مبنی ہیں کہ وقف عبادت نہ ہو، جب اس کا عبادت ہونا محقق ہوگیا اب ان سوالات کی گنجائش نہ رہی، اس لیے ان کے جوابات کی بھی حاجت نہیں رہی۔

مکالمہ کے لئے چند اصول موضوعہ

(نمبر۱) مسائل کا جواب عرض کرنے کے لیے میں حاضر ہوں مگر مشورہ و مصلحت کے متعلق کچھ عرض کرنے سے میں اس لیے معذور ہوں کہ مجھ کو اس سے مناسبت نہیں۔

(نمبر۲) مسائل بعضے عین وقت پر مستحضر نہیں ہوتے ان کے جواب سے معذور ہوں گا البتہ اگر ان کی یادداشت لکھ کر مجھ کو دے دی جاوے تو کتابیں دیکھ کر اطمینان سے جواب دے سکتا ہوں۔

(نمبر۳) مسائل پر اگر کچھ شبہات ہوں تو ان کا جواب دینا ہم لوگوں کے ذمہ نہیں کیونکہ ہم لوگ مسائل کے ناقل ہیں، بانی نہیں ہیں جیسے قوانین کے متعلق اگر کوئی شبہ یا خدشہ ہو، اس کا جواب مجلس قانون ساز کے ذمہ ہے، جج یا وکیل کے ذمہ نہیں۔

حافظ صاحب نے وہ اصول موضوعہ تمام ارکان وفد کو پڑھ کر سنانا شروع کئے مگر چونکہ اس مضمون کے اندر علوم کے بعض اصطلاحی الفاظ تھے اس لیے صدر صاحب کو پڑھنے میں تکلف ہوتا تھا۔ حضرت والا کو صدر صاحب کی یہ مشقت گوارا نہ ہوئی لہٰذا صدر صاحب سے حضرت والا نے فرمایا کہ یہ بطور اشارات میرے لکھے ہوئے چند نوٹ ہیں، اس لیے اگر آپ یادداشت مجھے دے دیں اور میں خود پڑھ کر سب صاحبوں کو سنا دوں تو سہولت ہو، اس لیے کہ میں ساتھ ساتھ اس کی شرح بھی کرتا جاؤں گا تا کہ سب صاحبوں کو اس کا مطلب سمجھنے میں آسانی ہو، چنانچہ حافظ صاحب نے نہایت خوشی سے وہ پرچہ حضرت والا کو پیش کر دیا، حضرت والا نے اس کو پڑھ کر سب کو سنایا اور سمجھا دیا۔

گفتگو کا آغاز:

وفد کی طرف سے گفتگو کے لیے ایک مشہور بیرسٹر ایٹ لا تجویز ہوئے تھے جو

جرح کے اندر اس قدر لائق شمار ہوتے ہیں کہ لوگ ان کو جرح کا بادشاہ کہتے ہیں۔

حضرت والا بھی ان کے متعلق ارشاد فرماتے تھے کہ وہ بہت ذہین آدمی ہیں بڑے بڑے دور کے سوالات مجھ سے کرتے تھے، مگر بفضلہٖ تعالیٰ میری طرف سے ذرا سی بات میں سب کا جواب ہوجاتا تھا، چنانچہ آدھ گھنٹہ کے اندر میری اور ان کی تمام گفتگو ختم ہوگئی، اور ان کے تمام سوالات کا شافی جواب ہوگیا، وہ لوگ دوسری جگہ بھی اس تحقیق کے لیے گئے تھے مگر اکثر لوگوں نے ان کو بین بین جواب دیئے یعنی یہ کہا کہ بعض شرائط کے ساتھ وقف کے انتظام میں گورنمنٹ کا دخل جائز ہے۔

حضرت حکیم الامت: مگر حضرت نے ان لوگوں سے صاف کہہ دیا کہ چونکہ یہ مذہبی فعل ہے اس لیے اس کے اندر غیر مسلم کا دخل دینا خود مذہبی دست اندازی ہے اور مذہبی دست اندازی کی درخواست کرنا یا اور کسی طرح سے اس میں مداخلت کی کوشش کرنا صاف جرم ہوگا، جیسے کہ نماز جو ایک خالص مذہبی فعل ہے اس کے اندر کسی طرح جائز نہیں کہ غیر مسلم کو دخیل بنایا جائے، اسی طرح یہ بھی جائز نہ ہوگا کہ کسی غیر مسلم سے دست اندازی کی درخواست کی جائے یا کوئی ایسی کوشش کی جائے کہ وہ غیر مسلم وقف کے انتظامی معاملات میں دخیل ہو۔

بیرسٹر صاحب: اس کے جواب میں بیرسٹر صاحب نے کہا معاف فرمایئے نماز میں اور وقف میں فرق ہے اس لیے کہ نماز کا تعلق مال سے نہیں ہے اور وقف کا تعلق مال سے ہے اور اس وقت چونکہ متولیوں کی حالت خراب ہورہی ہے اس لیے کہ وہ اوقاف کے اندر بڑی گڑبڑ کرتے ہیں، اس کی آمدنی مصارف خیر میں صرف نہیں کرتے، بلکہ خود کھا جاتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت: حضرت حکیم الامت نے فرمایا: اچھا! اگر آپ کے نزدیک نماز کی نظیر ٹھیک نہیں تو زکوٰۃ ہی کو لے لیجئے کہ یہ ایک خالص مذہبی فعل بھی ہے،

اور اس کا تعلق مال سے بھی ہے اور بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں نکالتے، مگر چونکہ مذہبی فعل بھی ہے اس لیے اس میں غیر مسلم کی مداخلت جس قسم کی بھی ہونا جائز ہے۔

بیرسٹر صاحب: بیرسٹر صاحب نے کہا کہ اچھا صاحب! نکاح اور طلاق بھی آپ کے نزدیک خالص مذہبی فعل ہے یا نہیں؟ حضرت والا نے فرمایا: جی ہاں! اس پر انہوں نے کہا کہ بہت اچھا اگر ایک عورت کو شوہر نے طلاق دے دی اور وہ عورت اس مرد سے جدا ہونا چاہتی ہے اور مرد اس کو جانے نہیں دیتا، بلکہ روکتا ہے اور طلاق سے انکار کرتا ہے تو ایسی صورت میں اس عورت کو جائز نہیں کہ عدالت میں اس کے متعلق استغاثہ دائر کرے، اور شہادت سے طلاق کو ثابت کر کے حکومت سے اپنی آزادی میں مدد حاصل کرے۔ تو دیکھئے نکاح وطلاق مذہبی فعل ہے مگر اس میں غیر مسلم کا دخل جائز ہوا۔

حضرت حکیم الامت: حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ آپ نے غور نہیں کیا یہاں دو چیزیں جدا جدا ہیں ایک تو وقوع طلاق اور ایک اثر طلاق۔ یعنی وہ حق جو اس عورت کو مرد کے طلاق دیدینے سے حاصل ہو گیا ہے اور مرد اس حق کو چھیننا چاہتا ہے جس میں عورت کا ضرر ہے تو یہاں وہ عورت غیر مسلم حکومت کا دخل قصداً خود طلاق میں نہیں چاہتی بلکہ طلاق سے جو اس کو حق آزادی حاصل ہوا ہے جس کے استعمال نہ کر سکنے سے اس کو ضرر پہنچتا ہے اس ضرر کو دفع کرنے کے لیے وہ عورت عدالت سے مدد چاہتی ہے۔

بیرسٹر صاحب: بیرسٹر صاحب نے کہا: معاف فرمائیے اسی طرح ہم یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جیسے یہاں عورت کا ضرر ہے اسی طرح اوقاف کے اندر گڑبڑ ہونے میں مساکین کا ضرر ہے، سو جیسے وہاں اس ضرر سے بچنے کی خاطر غیر مسلم کے دخل کو جائز رکھا گیا ہے، اسی طرح یہاں اوقاف میں ضرر سے بچنے کی خاطر غیر مسلم کا دخل جائز ہونا چاہیے۔

حضرت حکیم الامتؒ: حضرت حکیم الامت نے فرمایا: آپ نے غور نہیں کیا کہ وہاں تو شوہر کے جس سے اس عورت کا ضرر ہے اور یہاں اوقاف میں متولی کی خیانت سے مساکین کا ضرر نہیں بلکہ صرف عدم النفع ہے اور ضرر اور چیز ہے اور عدم النفع اور چیز ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے مثلاً آپ کی جیب میں ایک سو روپیہ کا نوٹ تھا ایک شخص نے آپ سے وہ چھین لیا تو یہ ضرر ہوا، اور اگر میں آپ کو ایک نوٹ دینا چاہتا ہوں مگر پھر کوئی اس نوٹ کے دینے سے منع کر دے تو اس میں آپ کا ضرر کچھ نہیں ہوا، بلکہ صرف عدم النفع ہوا اس پر سب لوگوں نے بے ساختہ سبحان اللہ اور صل علی کہنا شروع کیا اور بیرسٹر صاحب خاموش ہو گئے اور پھر کوئی شبہ انہوں نے پیش نہیں کیا مگر برابر بشاش رہے۔

حضرت والا نے بعد میں ارشاد فرمایا کہ میں نے اس موقع سے قبل اپنے دوستوں سے یہی شبہ پیش کیا تھا کہ اگر یہ شبہ کیا گیا تو اس کا کیا جواب ہوگا مگر یہاں کسی کے سمجھ میں جواب نہ آیا تھا، کمیٹی میں گفتگو کے وقت جب بیرسٹر صاحب نے یہ سوال پیش کیا تو اسی وقت اس کا جواب میرے قلب میں من جانب اللہ القاء ہو گیا۔

فرمایا: وہ لوگ یہاں سے بہت خوش ہو کر گئے اور کہتے تھے کہ صاحب بعض لوگوں نے ہم کو بہت خشک جواب دیئے جس سے ہماری بہت دلشکنی ہوئی مگر یہاں حاضر ہو کر جو ہم کو نفع ہوا، اور جو علوم ہم کو اس مجلس میں حاصل ہوئے وہ کہیں حاصل نہیں ہوئے اور وہ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ ہم نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ ہم استفادہ کی غرض سے کبھی کبھی یہاں حاضر ہوا کریں گے جب وہ لوگ روانہ ہو گئے تو حضرت والا ان کو رخصت فرمانے کی غرض سے اسٹیشن پر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ جب آپ یہاں اسٹیشن پر آ کر اترے تھے اس وقت میں اس لیے نہیں آیا کہ اس وقت میرا آنا آپ کی جاہ کی وجہ سے ہوتا اور اب جو میں آیا ہوں تو یہ آنا چاہ یعنی محبت کی وجہ سے ہوا ہے۔[۲]

---

[۱] اشرف السوانح ۲۴۳/۳ تا ۲۴۸۔ [۲] الافاضات الیومیہ ۴۰۹/۲۔

مکالمہ کی تفصیل حضرت تھانویؒ کی زبانی

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ سنا ہے اوقاف کے متعلق حضرت والا کی خدمت میں تحقیق مسائل کیلئے ایک وفد آیا تھا، فرمایا کہ جی ہاں آیا تھا جو نوشخصوں پر مشتمل تھا، سب انگریزی خوان اور بڑے بڑے بیرسٹر اور وکلاء تھے ان سے گفتگو ہوئی اس وقت سب گفتگو تو محفوظ نہیں مگر اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں، میں نے پہلے تو بطور اصول موضوعہ کے شرائط گفتگو طے کر لئے تھے۔

مثلاً ایک یہ کہ جو بات گفتگو کے وقت یاد ہوگی عرض کر دوں گا نہ یاد ہوگی تو عذر کر دوں گا اگر پھر بھی اس کا جواب مطلوب ہو تو آپ ایک تحریری یادداشت لکھ کر دے جایئے گا، بعد میں جواب بھیج دیا جائے گا۔

دوسرے یہ کہ آپ کو صرف مسائل پوچھنے کا حق ہوگا، دلائل پوچھنے کا حق نہ ہوگا اسی طرح حکمتیں اور علل اور اسرار کے دریافت کرنے کا حق نہ ہوگا، نیز ہم جو مسئلہ بیان کریں گے وہ درمختار، شامی، کنزالدقائق سے بیان کریں گے وہ قابل تسلیم ہوگا، صرف تصحیح نقل ہمارے ذمہ ہوگی اس لئے کہ ہم قانون ساز نہیں قانون داں ہیں۔

تیسرے یہ کہ عقلیات میں گفتگو کرنے کا آپ کو حق نہ ہوگا صرف منقولات سے ہر بات کا جواب دیا جائے گا، میں نے ایک پرچہ لکھ کر ان کو دیدیا تھا جس میں اس قسم کے اصول موضوعہ کی یادداشت تھی وہ ان اصولِ موضوعہ ہی کو سن کر پھیکے سے پڑ گئے تھے۔

ایک کام میں نے یہ کیا کہ ان کو آنے کے وقت اسٹیشن پر لینے کو نہیں گیا، دوسرے یہ کہ ان کو خانقاہ میں نہیں بلایا اور نہ ٹھہرایا یہ اس لئے کہ وہ یہاں پر آئیں گے تو مجھ کو ان کی تعظیم کے لئے اٹھنا پڑے گا اور میں ان کے پاس جاؤں گا تو وہ

اٹھیں گے، نیز وہ یہاں پر آئیں گے تو میں محبوس ہوں گا اور میں وہاں پر جاؤں گا تو وہ محبوس ہوں گے اس لئے مولوی شبیر علی کے مکان پر ٹھہرا دیا تھا، ایک یہ بھی مصلحت تھی کہ میرے ان کے پاس جانے پر ان کو قدر ہوگی کہ ہمارا اتنا اکرام کیا کہ ہمارے پاس قصد کر کے آیا، ان وجوہ سے یہ سب انتظام کیا گیا تھا، جس غرض سے وہ لوگ آئے تھے وہ مسئلہ اوقاف کا تھا۔

اس گفتگو میں ایک سوال بڑا ٹیڑھا تھا جس کے پیش کرنے کا مجھ کو پہلے سے احتمال تھا اور اس احتمال کی وجہ سے اس کے متعلق میں نے یہاں پر پہلے ہی اپنے بعض احباب سے مشورہ کیا تھا کہ اگر یہ سوال ہوا تو کیا جواب ہوگا کسی کی سمجھ میں نہ آیا سب چکر میں تھے خود میری ہی سمجھ میں نہ آیا تھا، میں نے دعاء بھی کی تھی کہ خدا کرے یہ سوال ہی نہ ہو، حاصل مطلب ان کا یہ تھا کہ متولیوں کی بدعنوانیوں کے سبب ہم ایسا قانون بنوانا چاہتے ہیں کہ اوقاف کا حساب کتاب گورنمنٹ لیا کرے یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ میں نے اس کی بالکل مخالفت کی کہ گورنمنٹ کو اس میں مداخلت کرنا ہرگز جائز نہیں کیونکہ یہ دیانات محضہ میں سے ہے، جیسے نماز روزہ، پس جس طرح اس میں دخیل ہونا گورنمنٹ کو جائز نہیں اسی طرح اس میں بھی جائز نہیں ان کی طرف سے ایک بہت بڑے بیرسٹر ہائی کورٹ کے جو جرح میں مشہور وممتاز شخص ہیں گفتگو کے لئے منتخب ہوئے تھے، انہوں نے کہا کہ یہ مسئلہ مالیات کے متعلق ہے، نماز روزہ مالیات سے نہیں، میں نے کہا کہ اچھا زکوٰۃ اور حج تو مالیات سے ہیں کیا اس میں ایسا دخل گوارا ہے، اس پر انہوں نے کافی سکوت کے بعد کہا کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور پھر منکر ہوگیا اور بیوی نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور گواہ پیش کر کے طلاق کو ثابت کر دیا تو کیا یہ دخل جائز نہیں؟ حالانکہ یہ بھی طلاق میں (جو کہ دیانات سے ہے) گورنمنٹ کا دخل ہے، یہی تھا وہ سوال جس

کا جواب ذہن میں نہ تھا مگر عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی، سوال کے ساتھ ہی جواب ذہن میں القاء فرما دیا، میں نے کہا کہ آپ نے غور نہیں فرمایا، یہاں دو چیزیں ہیں ایک نفس طلاق کہ دیانات محضہ سے ہے اور دوسری چیز اس کا اثر یعنی عورت کو طلاق کے بعد جو آزادی حاصل ہو چکی تھی اب اس کو آزادی نہ ملنے پر اس کا ضرر ہے، گورنمنٹ سے اس ضرر کے دفع میں مدد لی گئی اور وہ معاملہ ہے تو گورنمنٹ سے یہ مدد لینا دیانات میں نہیں بلکہ معاملہ یعنی دفع ضرر میں ہے اس پر انہوں نے کہا کہ اسی طرح نفس وقف بھی دیانات محضہ ہے مگر متولی کی بددیانتی اور بدانتظامی کی وجہ سے جو غرباء اور مساکین کا ضرر ہے گورنمنٹ سے اس ضرر کے دفع کیلئے مدد لی جاتی ہے، میں نے کہا کہ آپ نے غور نہیں کیا، اس میں مساکین کا ضرر نہیں، اس لئے کہ انکا حق پہلے سے ثابت نہیں محض استحقاق نفع کا ہے تو بددیانتی سے اس نفع کا عدم ہوا کسی ضرر کا ثبوت نہیں ہوا اور وہاں اس عورت کا حق ثابت ہو چکا تو اس صورت میں عورت کا ضرر ہے اور مساکین کا ضرر نہیں عدم النفع ہے اور ضرر اور عدم النفع جدا جدا چیزیں ہیں، اور اس کی ایسی مثال ہے کہ میں آپ کو سو روپیہ کا نوٹ دینا چاہتا تھا، کسی نے منع کر دیا تو اس صورت میں آپ کا ضرر نہیں عدم النفع ہوا، اور اگر کوئی شخص آپ کی جیب سے سو روپیہ کا نوٹ نکال لے اس کو بیشک ضرر کہیں گے چہار طرف سے سب کی زبان سے حتیٰ کہ وفد کے منہ سے بھی نکلا سبحان اللہ! سبحان اللہ! اور یہ کہا کہ عدم النفع اور ضرر کا فرق ساری عمر میں بھی نہ سنا تھا، یہ بھی کہا کہ تمام جگہوں میں علماء سے مسائل میں گفتگو کرتے آرہے ہیں مگر کہیں یہ لطف نہیں آیا اور نہ یہ تحقیقات سنیں ہم کو آج تک خبر نہ تھی کہ علماء میں بھی اس دماغ کے لوگ موجود ہیں یہ بھی کہا کہ عجیب بات یہ ہے کہ نہ تو گفتگو کے وقت کسی کی وجاہت کا طبیعت پر اثر تھا اور نہ کہیں تقریر میں بے ربطی تھی اور ہر دعوے کے ساتھ دلیل، اور اس وفد میں بعض

شیعہ حضرات بھی تھے جو شاعر بھی تھے انہوں نے کہا کہ اتنی دیر گفتگو رہی مگر ایک لفظ بھی تہذیب سے گرا ہوا تقریر میں نہیں نکلا، مجھ سے یہ سب ایک صاحب نے بیان کیا جو ان سے ملے ہوئے بیٹھے تھے، میں نے سن کر کہا کہ انہوں نے ابھی علماء دیکھے کہاں ہیں میں تو علماء کی جوتیوں کی گرد بھی نہیں، علماء کی شان انہوں نے ابھی دیکھی کیا ہے، خیر جو کچھ بھی ہوا میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ طالب علموں کی آبرو رکھ لی، میں ان کو لینے کے لئے تو ریل پر گیا نہیں تھا مگر رخصت کے وقت جب وہ لوگ اسٹیشن پر پہونچ چکے تب میں بھی پہونچ گیا، دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ کیوں تکلیف گوارا فرمائی، میں نے کہا کہ اگر آنے کے وقت ریل پر آتا تو یہ آپ کی جاہ کا اثر سمجھا جاتا اب رخصت کے وقت کا آنا چاہ کا اثر ہے اس پر سبحان اللہ! سبحان اللہ! کی آواز بلند ہوگئیں اور کہا کیا لطیفہ ہے، ان میں سے جو شیعہ تھے وہ شاعر بھی تھے وہ بہت ہی محظوظ اور خوش تھے، یہ سب اللہ کی طرف سے ہے ورنہ کسی کی کیا ہستی اور کیا وجود سب حق تعالیٰ کا فضل اور اپنے بزرگوں کی دعاؤں کی برکت ہے، ورنہ مجھ میں تو کوئی بھی ایسی بات نہیں، نہ علم نہ عمل نہ کتابیں غور سے پڑھیں، سبق پڑھا اور کتاب بند کر دی محض فضل ہی فضل ہے۔[1]

---

[1] ملفوظات حکیم الامت ص ۲۸۵ ج ۴ قسط ۳ ملفوظ نمبر ۵۱۷

مکالمہ نمبر۲

کانپور کی عدالت میں جج سے مکالمہ

ایک استفتے کے جواب کے سلسلہ میں فرمایا کہ جیسا یہ استفتاء آیا ہے اسی قسم کا ایک معاملہ نکاح وطلاق کا کانپور میں کئی سال سے عدالت میں چل رہا تھا کسی حاکم سے وہ طے نہیں ہوا وہ معاملہ ایک جنٹ انگریز کے یہاں آ گیا اس نے کہا کہ اتنے عرصہ سے یہ معاملہ عدالت میں ہے اور آج تک فیصل نہیں ہوا مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے علماء سے اس مسئلہ کا شرعی فیصلہ کرالو اور اس کی صورت یہ ہے کہ فتویٰ حاصل کرلو، اس کے مطابق حکم نافذ کردیا جائے گا، اس پر دونوں فریق رضامند ہو گئے چنانچہ علمائے شہر کے دستخطوں سے فتویٰ لکھا گیا اب عدالت میں فریقین کو علماء کے نام بتلا کر ان کی رضامندی کسی خاص عالم پر پوچھی گئی، اب کسی پر ایک فریق رضامند ہوا تو دوسرا نہیں ہوا کسی پر دوسرا رضامند ہوا پہلا نہیں ہوا، میں بھی اس وقت بسلسلہ ملازمت مدرسہ جامع العلوم کانپور میں قیام کئے ہوئے تھا میرے بھی دستخط اس فتوے پر تھے، عمر میری اس وقت غالباً تقریباً اکیس یا بائیس سال کی ہوگی، طلبہ بھی میری کم عمری کی وجہ سے مجھ سے سبق پڑھتے ہوئے جھجکتے تھے، ان ناموں کے ساتھ میرا بھی نام لیا گیا، میرے نام پر دونوں فریق رضامند اور متفق ہو گئے، حاکم نے ضابطہ کے اندر میرے نام سمّن جاری کردیا، میں نے بہت چاہا کہ کسی طرح یہ بلا سرے سے ٹلے مگر سر آئی ہی پڑی، تاریخ مقرر پر عدالت میں گیا، میں کسی واقعہ کا گواہ نہ تھا مسائل کی تحقیق مطلوب تھی، مجھ کو عدالت کے احاطہ میں دیکھ کر تمام وکلاء اور بیرسٹر جمع ہو گئے اور دریافت کیا کہ آپ کہاں؟ مقدمہ کے

وکیل صاحب بھی اس وقت وہاں پر موجود تھے میں نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان حضرت کی عنایت کا نتیجہ ہے، واقعہ معلوم ہونے پر سب نے اس کی سعی اور کوشش کی کہ میری شہادت نہ ہو، وکیل کو مجبور کیا کہ درخواست دو کہ ہم ان کی شہادت نہیں چاہتے چنانچہ طوعاً وکرہاً وکیل نے یہ درخواست دی اور حاکم سے زبانی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ آ بھی گئے ہیں، حاکم نے کہا کہ ضابطہ سے تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے اس لئے کہ درخواست گذر چکی ہے اب مستثنیٰ کرنا لازم ہے ہم کو کوئی حق ان کی شہادت لینے کا نہیں رہا، اور اگر وہ سمن پر بھی نہ آتے تو میں اس وقت بھی کوئی ضابطہ کی کارروائی نہ کرتا مگر مشورۃً کہتا ہوں کہ اگر وہ اپنا بیان دیدیں تو مسلمانوں کا جھگڑا ہے شریعت کا مسئلہ ہے یہ معاملہ طے ہوجائے گا بشرطیکہ وہ بخوشی اس کو منظور فرمالیں، میں اسی بیان کے مطابق حکم نافذ کردوں گا، مجھ سے کہا گیا کہ حاکم کا یہ خیال ہے، مجھ کو بھی خیال ہوا کہ انگریز ہوکر اس کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کا معاملہ ہے اور وہ پریشان ہیں تو میں تو بحمد للہ مسلمان ہوں میرا تو فرض ہے کہ یہ معاملہ طے ہوجائے، میں نے بیان دینے کو منظور کرلیا، اب حاکم کی تہذیب ملاحظہ ہو، حکم دیا کہ گواہوں کی طرح پکارا نہ جائے اور پیادہ اجلاس تک نہ آئیں سواری میں آئیں جہاں تک ہماری سواری آتی ہے وہاں تک سواری آئے، کرسی منگائی جائے، غرض میں اجلاس پر پہونچا تو کٹہرہ کے اندر بلایا گیا کرسی آنے میں دیر ہوئی، میں دونوں ہاتھ میز پر ٹیک کر کھڑا ہوگیا، بیان شروع ہوا، بیان کے وقت مجھ کو یہ معلوم ہورہا تھا کہ یہ مدرسہ ہے اجلاس نہیں۔ ایک طالب علم سوال کررہا ہے میں جواب دے رہا ہوں، تمام اجلاس کا کمرہ وکلاء اور بیرسٹروں سے پر ہوگیا اس لئے کہ اس کی شہرت ہوگئی تھی کہ اس کا بیان ہے یہ لوگ یہ دیکھنے آئے تھے کہ دیکھیں اجلاس میں کیا بیان ہوتا ہے۔

غرض پہلا سوال یہ ہوا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ باپ کا کیا نام ہے؟ اس کے بعد حاکم نے سوال کیا کہ آپ عالم ہیں؟ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ واہ اچھا سوال ہوا اب اگر کہتا ہوں کہ نہیں تو یہ ایشیائی مذاق کو کیا جانے، کہے گا کہ سمّن کی تعمیل غلط ہوئی اس پر عالم لکھا ہے اور اس کی نظر میں اپنی ایک قسم کی تحقیر اور اہانت بھی ہوگی، کہے گا کہ پھر آنے کی تکلیف ہی کیوں گوارا فرمائی جب کہ آپ عالم نہیں، اور یہ مسئلہ متعلق ہے اہل علم سے اور اگر کہتا ہوں کہ عالم ہوں تو یہ اپنے مسلک اور مذاق کے خلاف خودستائی ہے، میں نے کہا کہ مسلمان ایسا ہی سمجھتے ہیں یہ لکھ لیا گیا، دوسرا اس سے بڑھ کر ہوا کہ سب مسلمان آپ کو مانتے ہیں؟ میں نے سوچا کہ اگر کہتا ہوں کہ نہیں تو ایک غیر مسلم کے سامنے اپنی سبکی اور اہانت، اس کو بھی جی گوارہ نہ کرتا تھا، مزاحاً فرمایا گو سبکی نہ تھی، دوسرے مقدمہ پر برا اثر پڑے گا کیونکہ میرا بیان کسی نہ کسی فریق کے تو ضرور مخالف ہوگا اس کو اس کہنے کی گنجائش ہوگی کہ وہ تو خود ہی کہہ گئے کہ سب مسلمان نہیں مانتے سو ہم بھی نہیں مانتے، اور اگر کہتا ہوں کہ سب مسلمان مانتے ہیں تو کانپور میں آئے دن ہندو مسلمان میں فساد ہوتے رہتے ہیں میرے اس اقرار کی بناء پر مجھ کو حکم کیا جاسکتا ہے کہ تم کو سب مانتے ہیں تم اس کا انتظام کرو۔ میں اس کا ذمہ دار قرار دیا جاؤں گا میں نے جواب میں کہا کہ ماننے کے دو معنی ہیں، ایک تصدیق کرنا اور ایک تسلیم کرنا تو تصدیق کے درجہ میں تو سب مسلمان مانتے ہیں یعنی کوئی مسلمان ہمارے بتلائے ہوئے مسئلہ کو جھوٹا نہیں کہہ سکتا اس سے مقدمہ پر بھی اچھا اثر ہوا اور تسلیم کے درجہ میں ہماری حکومت تو ہے نہیں صرف اعتقاد ہے اور اعتقاد کسی کو ہے اور کسی کو نہیں جو ہم کو معلوم نہیں، پھر نفس مسئلہ پر بیان ہوا جب میں بیان دیکر اجلاس سے باہر آیا تو بیرسٹر اور وکلاء جمع ہوگئے اور کہنے لگے کہ عجیب وغریب جواب ہوئے اور دوسرے سوال کے جواب میں تو ہم بھی چکر میں تھے واقعی

یہ سوال خطرہ سے خالی نہ تھا مگر جواب بھی ایسا ہوا کہ ہماری سمجھ میں بھی نہ آیا تھا، میں نے کہا کہ یہ سب عربی مدارس کی برکت ہے وہاں اس قسم کے احتمالات نکالا کرتے ہیں، یہ بات انگریزی تعلیم میں تھوڑی ہی پیدا ہوسکتی ہے، یہ عربی ہی تعلیم کے اندر برکت ہے، اوراس قسم کے احتمالات کا نکالنا عربی ہی طلبہ کا کام ہے۔ انگریزی طلبہ قیامت تک بھی ایسے احتمالات نہیں نکال سکتے، اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ آدمی عربی درسی کتابیں سمجھ کر پڑھ لے پھران کے بعد آگے کسی چیز کی ضرورت نہیں مگر آج کل عربی طلبہ بھی کتابیں سمجھ کرنہیں پڑھتے، طوطے کی طرح رٹتے ہیں اس وجہ سے ان میں بھی سمجھ نہیں پیدا ہوتی، بزرگوں نے جودرسی کتابیں انتخاب کی ہیں ان میں سب کچھ ہے مگر سمجھ کر پڑھ لینا شرط ہے۔[1]

---

[1] ملفوظات حکیم الامت ص۳۴۳ ج۴ ق۳، ملفوظ ۵۱۶

مکالمہ نمبر۳

ایک پرلطف مکالمہ

حضرت والا وعظ کے لئے ممبر پر تشریف فرما ہوئے اور حسب عادت وعظ سے پہلے دعا مانگی، دعا ختم ہی کی تھی کہ مجمع میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے جو وضع قطع سے تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے انہوں نے کہا میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہو، اکثر لوگ حضرت والا کی آزادی طبع سے واقف تھے معمولاً یہ خیال ہوا کہ حضرت کو یہ حرکت ناگوار ہوگی اور عجب نہیں کہ وعظ کو ملتوی فرمادیں، اس واسطے چاروں طرف سے یہ آواز آئی کہ بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ کوئی ضرورت عرض معروض کی نہیں ہے، مگر حضرت والا نے سب کو ساکت فرمایا اور ارشاد ہوا کہ سن لو کیا کہتے ہیں ممکن ہے کوئی کام کی بات ہو، سب لوگ ساکت ہوگئے اور انہوں نے تقریر شروع کی، اثناء تقریر میں پھر کئی بار غل مچا کہ بیٹھ جاؤ، لیکن حضرت والا نے فرمایا: یہ صاحب مجھے خطاب کررہے ہیں، ان کی بات کا جواب دوں گا آپ لوگوں کو اضطراب کیوں ہے، جو کچھ یہ فرمانا چاہتے ہیں ان کو فرمالینے دیجئے، غرض انہوں نے تقریر شروع کی اور پانچ منٹ میں اس کو ختم کیا، حضرت والا نے اس کا جواب دیا انہوں نے پھر کچھ کہا حضرت والا نے پھر اس کا جواب دیا، مکالمہ بارہ منٹ تک رہا چونکہ اس میں بہت سے مضامین نہایت مفید ہیں اس لئے انہیں ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

مقرر صاحب۔ اسلامی ممالک پر جو طوفان آفات کا آج کل آرہا ہے اور جس دشوار گذار راستوں سے اسلام گذر رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، اس سے مسلمانان دنیا بے چین ہیں اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک تامقدور جدوجہد میں مشغول ہیں اسی بناء پر تمام ہندوستان میں خلاف کمیٹیاں قائم کی گئیں ہیں، کفار نے جو

حق تلفیاں مسلمانوں کی کیں اور جو ناجائز مظالم کئے کوئی مسلمان ان کو سن کر خاموش نہیں رہ سکتا، (اس کے بعد چند مظالم تفصیل کے ساتھ بیان کئے) ہم چاہتے ہیں کہ آج اسی کے متعلق آپ بیان فرمادیں۔

حضرت والا۔ اب میں کچھ عرض کروں مگر میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری تقریر کو اس طرح ٹھنڈے دل سے سنیں گے جیسے میں نے آپ کی تقریر کو سنا، آپ نے جو کچھ مشورہ دیا یا فرمائش کی اس کو میں خیر خواہی پر محمول کرتا ہوں لیکن اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وعظ ایک معالجۂ روحانی ہے جیسا کہ دوا کرنا معالجۂ جسمانی ہے علاج کا قاعدہ یہ ہے کہ جس کے سپرد کیا جائے اس سے پہلے تحقیق کر لینا چاہئے کہ یہ شخص جس کے سپرد علاج کیا جاتا ہے اس کا اہل ہے یا نہیں اگر اہل نہیں ہے تو اس کے سپرد کرنا ہی غلطی ہے، ایسا شخص نہایت خطرناک ہے، ایسے شخص کے علاج میں خطرہ جان کا ہے اور علاج روحانی میں خطرہ ایمان کا ہے، اور اگر اہل ہے تو اس کو معالجہ میں رائے دینا میں نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک ٹھیک ہے، کیونکہ اگر اس کو رائے دینے کی ضرورت ہے اور آپ رائے دے سکتے ہیں تو آپ خود طبیب ہیں آپ خود ہی علاج کر لیجئے اس کے پاس جانے اور تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے اگر مجھ سے بیان کرانا ہے تو پہلے اطمینان کر لیجئے کہ میں اس کا اہل ہوں یا نہیں؟ اگر نہیں ہوں تو بیان نہ کرایئے اور اگر اطمینان ہے کہ میں اہل ہوں تو مشورہ دینے کی ضرورت نہیں، یہ خطاب صرف آپ ہی کو نہیں ہے بلکہ سارے مجمع کو ہے سب کو حق ہے رائے دینے کا اور میں سب سے جواب چاہتا ہوں۔

مقرر صاحب۔ یہ جناب کا فرمانا بالکل صحیح ہے ہم کو جناب پر پورا اطمینان ہے جو کچھ عرض کیا گیا وہ نہ اس غرض سے ہے کہ جناب پر اطمینان نہیں بلکہ محض اس وجہ سے ہے کہ ایک بات جو اپنے نزدیک مناسب اور ضروری معلوم ہوئی اس کو جناب کے کان میں ڈال دیا جیسے بعض وقت مریض طبیب سے کہتا ہے کہ مجھے یہ یہ شکایتیں ہیں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلا مسہل کے اس کا ازالہ نہ ہوگا اگر آپ کے نزدیک کوئی حرج نہ ہو تو

مسہل دے دیجئے، میری التجا جناب کو ناگوار نہ ہونی چاہئے، بعض وقت طبیب کا ذہن ایک بات کی طرف نہیں جاتا مریض کے عرض کرنے سے پہنچ جاتا ہے، اس وقت اس مضمون سے زیادہ ضروری کوئی دوسرا مضمون نہیں معلوم ہوتا اس وجہ سے جناب سے التجا کی گئی۔

حضرت والا: زیادہ تہذیب کے الفاظ کو چھوڑ دیجئے زیادہ تہذیب کی حقیقت تصنع ہے معاملہ کی بات ہے کہ میرا پیشہ وعظ گوئی نہیں ہے نہ مجھے وعظ کہنے کی خواہش ہے نہ ضرورت محض آپ لوگوں کی رغبت دیکھ کر بیان کے لئے تیار ہوگیا ہوں، دوحال سے خالی نہیں آپ نے جو رائے دی یہ امر ہے یا مشورہ، اگر امر ہے تو آپ میرے کوئی حاکم نہیں اس واسطے یہ آپ کا فرمانا میرے لئے واجب العمل نہیں اور اگر مشورہ ہے تو آپ کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ آپ نے جس بات کو مفید سمجھا پیش کردیا اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، لیکن اس کا یہ اثر نہیں ہوسکتا کہ میں اس کے ماننے پر مجبور ہوں ممکن ہے کہ میرے نزدیک مفید نہ ہو، میں نے سن لیا اور اس سے برا بھی نہیں مانا اب مجھے اختیار ہے کہ اس پر عمل کروں یا نہ کروں آپ کو حق تھا کہ جس بات کو آپ نے مفید سمجھا پیش کردیا جیسے آپ کی مثال میں ہے کہ مریض نے رائے دی کہ میرے لئے مسہل کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اس واسطے یہ رائے دینا درست ہے کہ شاید طبیب کا ذہن اس طرف نہ گیا ہو تو اس کے کہنے سے پہنچ جائے لیکن اپنی رائے ظاہر کردینے کے بعد مریض کو اصرار کا حق نہیں ہے، یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کو یہی کرنا ہوگا ورنہ آپ غلطی کریں گے، وہ تو خود طبیب ہے سب جانتے ہیں کہ مریض طبیب میں اس طرح معاملہ نہیں ہوتا حتی کہ اگر کوئی طبیب ایسا ہو کہ مریض کے کہنے پر چلتا ہو تو عقلاً اس کو بیوقوف کہیں گے۔

اب میں سب سے اور خصوصاً آپ سے عرض کرتا ہوں آپ کی رائے سننے کے بعد مجھے کیا کرنا چاہئے آیا اس رائے کا ماننا میرے لئے ضروری ہے اور آپ کی رائے پر

مجھ کو چلنا چاہئے یا اپنے نسخہ پر اب آپ آخری بات فرمادیجئے کہ میں بیان کروں یا نہیں؟

مقرر صاحب: ہم آپ پر حاکم کیا ہوتے ہم تو مشورہ دینے کے قابل بھی نہیں ہمارا عرض کرنا تو ایک التجا ہے اور ہم اس پر بوجہ اس درد کے جو اس وقت ہر مسلمان کے دل میں ہے مجبور ہیں۔

حضرت والا: آپ نے جو رائے ظاہر فرمائی وہ سراسر درد پر مبنی سہی لیکن ان دو باتوں میں کسی میں تو داخل ہوگی ہی یا امر کے درجہ میں یا مشورہ کے درجہ میں وہ جس درجہ میں ہوگی اس پر اسی کا حکم مرتب ہوگا امر کے حقوق اور ہیں اور مشورہ کے درجہ میں عرض کر چکا ہوں کہ امر کے درجہ میں تو ہو نہیں سکتی کیونکہ آمر اور میں مامور نہیں لامحالہ مشورہ کے درجہ میں ہوگی اور مشورہ کا حق یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا واجب نہیں ہوتا۔

اب میں اس پر استدلال کرتا ہوں حدیث بریرہ سے اس کا مضمون یہ ہے کہ بریرہ لونڈی تھیں حضرت عائشہؓ کی اور ان کا نکاح ہوا تھا ایک شخص مغیث نامی سے حضرت عائشہؓ نے ان کو آزاد کر دیا اور یہ شرعی مسئلہ ہے کہ لونڈی کو آزاد ہونے کے بعد خیار عتق ہوتا ہے یعنی یہ اختیار ہوتا ہے کہ اپنے نکاح کو باقی رکھے یا نہ رکھے، بریرہؓ نے نکاح کو باقی نہ رکھا، مغیثؓ کو ان سے بڑی محبت تھی وہ بہت پریشان ہوئے اور بڑی کوشش کی کہ وہ نکاح کو باقی رکھیں، بریرہ نے نہیں مانا، مغیث گلیوں میں ان کے پیچھے روتے پھرتے تھے لیکن ان پر کچھ اثر نہ ہوا، مغیث کی حالت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رحم آیا اور بریرہ سے فرمایا کہ مغیث سے نکاح کرلو، اب سنئے بریرہ کیا کہتی ہیں کہ یارسول اللہ! کیا آپ مجھ کو یہ حکم دیتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں بلکہ سفارش کرتا ہوں، بریرہ صاف کہتی ہیں کہ مجھ کو ضرورت نہیں یعنی جب یہ حکم نہیں سفارش ہے، مشورہ ہے تو میں نہیں قبول کرتی۔

(کذافی جمع الفوائد باب الطلاق المکرہ والمجنون عن

البخاری و اصحاب السنن (ایسے ہی جمع الفوائد میں مکرہ ومجنون کی طلاق کے باب میں بخاری اور اصحاب سنن سے مروی ہے)

اس کو کہتے ہیں کہ بے تکلفی اور صفائی اور یہ ہے معاشرت ،اب یہ باتیں مسلمانوں میں مفقود ہوگئیں،اس جواب پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکیر نہیں فرمایا چنانچہ مغیث ناامید ہوگئے اور بات ختم ہوگئی، میں نہیں سمجھتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی حق رکھتا ہو کہ اس کا مشورہ واجب العمل ہو، یہ مشورہ کا حق ہے جس کو میں نے حدیث سے ثابت کردیا، اب میں مکرر عرض کرتا ہوں کہ میں اس مشورہ کے قبول پر مجبور نہیں ہوں گا، اگر مجھ سے بیان کرانا ہے تو مجھے وہی حق حاصل ہوگا جو طبیب کو مریض کے بارے میں ہوتا ہے کہ اپنی تشخیص وتجویز پر عمل کرتا ہے نہ کہ مریض کے کہنے پر، ہاں مریض کو اتنی اجازت ہے کہ اپنی رائے ظاہر کردے کہ مسہل دیا جائے تو مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن اس پر اصرار نہیں کرسکتا نہ طبیب کو مجبور کرسکتا ہے ورنہ وہ سیدھا جواب دے دے گا کہ خود علاج کرلو یا کسی ایسے طبیب کے پاس جاؤ جو تمہارا تابع ہو، اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص طبیب ہی نہیں جو مریض کے تابع ہو، اب میں جواب کا منتظر ہوں۔

مقرر صاحب: جناب کو خیال ہوا کہ میں آپ کا مخالف ہوں اور وعظ میں خلل ڈالنا چاہتا ہوں ،حاشا وکلا میں مخالف نہیں ہوں، اس کا میں پورا اطمینان دلاتا ہوں ، میرے سوال کی وجہ وہ جوش ہے جو میرے دل میں اسلام اور اہل اسلام کی طرف سے بھرا ہوا ہے، جس سے آج کل کوئی بھی مسلمان خالی نہیں اور ہونا بھی نہ چاہئے۔

حضرت والا: وعظ میں خلل ڈالنے کا لفظ تو فرمانے کی ضرورت نہیں ، میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ وعظ گوئی میرا پیشہ نہیں آپ یا اور کوئی صاحب جو کوئی بھی چاہے شوق سے خلل ڈالے اور کسی ترکیب سے خلل ڈالنے کی ضرورت نہیں صرف زبان سے فرمادیجئے کہ تو بیان مت کر، اور سب کے فرمانے کی ضرورت نہیں مجمع سے صرف

دوایک حضرات فرمادیں میں اس کی موافقت فوراً کروں گا بلکہ خوش ہوں گا کہ میری محنت بچادی۔

مقرر صاحب: ہر گز نہیں ایسا نہیں ہوسکتا کہ وعظ کو بند کردیا جائے کبھی کبھی تو قسمت سے یہ موقع ملتا ہے، حق تعالیٰ آپ کے فیض کو جاری رکھے۔

حضرت والا: معاملہ کی بات ہے میں پہلے ہی سے صاف کہہ دینے کو پسند کرتا ہوں مجھے پالیسی نہیں آتی آخر میں بھی بچہ نہیں ہوں کچھ تجربہ رکھتا ہوں، میں نے دیکھا ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرنے سے گومنہ پر کوئی کچھ نہ کہے لیکن بعد میں شکایتیں ہوتی ہیں اور لعن طعن بھی ہوتا ہے کوئی کہتا ہے یہ گورنمنٹ سے تنخواہ پاتے ہیں انکو مسلمانوں سے ہمدردی نہیں، میرا بارہا کا تجربہ ہے اسی واسطے میں پہلے ہی صاف کہے دیتا ہوں کہ میں کسی مشورہ پر عمل کرنے پر مجبور نہ ہوں گا۔

مقرر صاحب: جیسا مناسب ہو ہماری سمجھ میں جو آیا عرض کردیا، اب آپ بیان فرماویں۔

حضرت والا: میرا کسی خاص حالت کے متعلق بیان کرنے کا خیال نہیں، میرا معمول یہ ہے کہ میں ایسی حالت کے متعلق بیان کرتا ہوں جو عام ہو اور سب میں مشترک ہو، خطاب خاص کسی شخص یا جماعت کو نہیں کیا کرتا نہ کوئی مضمون قصداً اختیار کرتا ہوں نہ کسی مضمون کو قصداً ترک کرتا ہوں مجھے کسی سے ضد نہیں، اگر اس کے متعلق جس کی آپ نے فرمائش کی ہے کوئی مضمون ذہن میں آ گیا نفیاً یا اثباتاً اس کو چھوڑوں گا نہیں اور نہ آیا تو قصداً لاؤں گا بھی نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ واقع میں اس کی ضرورت ہے یا نہیں، میں اپنی حالت جانتا ہوں اور اس کے لحاظ سے کہتا ہوں کہ میرے لئے اس کے متعلق یہی معمول مناسب ہے جس پر میں کاربند ہوں، ہر شخص کی حالت جداگانہ ہوتی ہے اور اسی کے لحاظ سے حکم ہوتا ہے، دیکھئے ابوذر غفاری صحابیؓ ہیں اور ایسے صحابی جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر خصوصیت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

اِنِّیْ اُحِبُّکَ وَاُحِبُّ لَکَ مَااُحِبُّ لِنَفْسِیْ یعنی اے ابوذر! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارے واسطے وہی بات پسند کرتا ہوں جو اپنے واسطے پسند کرتا ہوں یہ خصوصیت کا بیان ہے، پھر دیکھئے کہ ان کے واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ کیا دیتے ہیں فرماتے ہیں لاتَلِیَنَّ مال یتیم و لا تقض بین اثنین یعنی تم دو کام مت کرنا ایک تو کسی یتیم کے مال کے متولی مت بننا اور ایک یہ کہ دو شخصوں میں کبھی فیصلہ نہ کرنا، آپ جانتے ہیں کہ یہ دونوں کام فی نفسہٖ کیسے ہیں یتیم کی خدمت کرنا کس قدر ثواب کا کام ہے، اور دو شخصوں میں فیصلہ کرنا کس قدر اچھا کام ہے لیکن ایک ایسے عارف باللہ صحابی کو جن کی خصوصیت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بیان فرمائی کہ اس سے زیادہ کیا خصوصیت ہوسکتی ہے ان دو مذکورہ باتوں سے منع کیا جاتا ہے اور دوسرے بعض صحابہ کے واسطے ایک یتیم کی تولیت اور قضا بین اثنین کیا سلطنت کی اجازت دی جاتی ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرؓ نے اقلیم میں سلطنت کی، اس سے صاف یہ مسئلہ نکل آتا ہے کہ اختلافِ حالات سے اختلاف حکم ہوسکتا ہے، اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر ابوذرؓ تولیتِ یتیم کی اور قضا بین اثنین کی فضیلت دیکھ کر ان کو اختیار کرتے تو اچھا کرتے یا برا اور ابوبکرؓ اس ابوذرؓ کی حدیث کو سن کر ایک طرف گوشہ میں بیٹھ جاتے اور سلطنت کو ہاتھ نہ لگاتے تو اچھا کرتے یا برا؟ جواب دونوں صورتوں میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ برا کرتے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس وقت ایک کام کو اچھا سمجھ کر سب کو اسی کی رائے دی جاتی ہے، کسی کو کیا خبر ہے کہ میری حالت ابوذرؓ کی سی ہے یا ابوبکرؓ کی سی، اگر میری حالت ابوذرؓ کی سی ہے اور کام اختیار کروں میں ابوبکرؓ کا سا تو میں اچھا کروں گا یا برا اور مجھ سے حق تعالیٰ کے یہاں مؤاخذہ ہوگا یا نہیں، ایسے ہی اس کا عکس ہے بس مجھ کو اپنی حالت پر چھوڑ دیجئے، اپنی حالت پر جیسے مجھے معلوم ہے آپ کو نہیں معلوم ہوسکتی، میں صاف بات بتائے دیتا ہوں نہ میں پبلک کا طرفدار ہوں نہ گورنمنٹ کا نہ میں کہیں سے تنخواہ پاتا ہوں، اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو معاملہ حق تعالیٰ کے ساتھ

ہے وہ خود سمجھ لیں گے کسی سے کیا مطلب، میرے لئے اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے یہی مناسب ہے کہ ان قصوں میں نہ پڑوں اپنی حالت کو میں ہی خوب جانتا ہوں، خدا جانے دوسرے مجھے کیوں مجبور کرنا چاہتے ہیں، اب میں جواب کا منتظر ہوں میں نے اپنا معمول بتا دیا، میں کسی فرمائش کی تعمیل پر مجبور نہیں ہوسکتا نہ کسی سے ضد رکھتا ہوں، سوا گر فرمائش کے متعلق کوئی مضمون آ گیا تو ضرور بیان کروں گا خواہ نفی کا ہو یا اثبات کا اور اگر مضمون نہ آیا تو قصداً لانے کی کوشش بھی نہیں کروں گا۔

مقرر صاحب: آپ بیان شروع کریں۔

حضرت والا: بیان ہو یا نہ ہو دیکھنے کی بات ہے کہ وعظ سے غرض کیا ہوتی ہے وعظ سے غرض مسلمانوں کی اصلاح ہوتی ہے اور اس صورت میں کہ بعض کی رائے کچھ ہے اور بعض کی کچھ تو ایسی حالت میں اصلاح کیا ہوسکتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں فرقہ بندی ہو جاوے اور ہر جگہ تو تو میں میں ہو اگر پہلے کچھ اصلاح تھی بھی تو وہ بھی ندارد ہو جائے، فرقہ بندی کس قدر بری چیز ہے اس میں نہ تو دین کا خیال رہتا ہے نہ دنیا کا، میں اس کو تمام خرابیوں کی جڑ سمجھتا ہوں، بیان سے اس قدر نفع کی امید نہیں جتنا اس فرقہ بندی سے نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے، اگر مجھے اطمینان دلایا جائے کہ دو فرقہ نہ ہوں گے تو میں وعظ کہوں گا ورنہ کوئی ضرورت نہیں، وعظ گوئی میرا پیشہ نہیں۔

مقرر صاحب: ہم آپ کے خلاف نہیں وعظ شروع کیجئے۔

حضرت والا: میرے خلاف سے بحث نہیں آپ لوگوں میں افتراق نہ ہو، میں تو سنتے سنتے بے حیا ہو گیا ہوں اور گالیاں تک کھانے کی عادت ہوگئی ہے، اختلاف کا اثر میرے اوپر کچھ نہیں ہوتا، میں نے تو سوچ لیا ہے کہ اس میں بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے، کیونکہ جب سے نوکری چھوڑی دنیا میں بھی گذر دوسروں ہی کی کمائی سے ہے آپ لوگ کماتے ہیں اس میں سے مجھے بھی کچھ دیتے ہیں میرے ہاتھ میں تجارت زراعت وغیرہ کوئی ذریعہ معاش کا نہیں ہے، حق تعالیٰ نے دیکھا کہ یہ احدی ہے آخرت کے لئے بھی

دوسروں ہی کی کمائی میں میری بھلائی کی تدبیر کردی کیونکہ آخرت کے واسطے بھی میرے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے۔

مقرر صاحب: نہیں اطمینان رکھئے افتراق نہ ہوگا، پس آپ وعظ شروع کیجئے ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔

حضرت والا نے دوبارہ دعا مانگی اور شروع کرنے سے پہلے فرمایا کہ احتیاطاً اتنا اور عرض کئے دیتا ہوں کہ اگر ان مسائل کے متعلق یا میرے مسلک کے متعلق تردد ہو تو اسکی تدبیر یہ ہے کہ دو چار منصف مزاج اور سمجھدار آدمی میرے پاس تھانہ بھون چلے آویں اور وہاں اطمینان سے گفتگو کرلیں جب تک بات طے نہ ہو میں حاضر ہوں خواہ ایک مہینہ کیوں نہ لگ جاوے اور یہاں مجھ کو مہمان بنا کر تو یہ قصے لے کر بنوانا مناسب نہیں، جن کے یہاں مقیم ہوں انکا تو مہمان ہوں ہی میں اپنے آپ کو سب مسلمانوں کا مہمان سمجھتا ہو کیونکہ سب ایک ہیں اور آج کل تو اتحاد کی لہر اس قدر دوڑ رہی ہے کہ اغیار کو بھی ایک ایسے بےغرض مہمان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں چاہئے۔

مقرر صاحب: سنا ہے کہ عام لوگوں کی رسائی آپ تک تھانہ بھون میں نہیں ہوتی پھر اس کی ہمت کیسے ہو۔

حضرت والا: جس سے آپ نے یہ خبر سنی ہو اس سے پوچھئے کہ میرے یہاں کوئی چوکی پہرہ ہے یا بڑا تھانہ تو نہیں ہے میں تو بوریئے پر بیٹھنے والا معمولی آدمی ہوں، میرے یہاں کسی کا گذارہ نہ ہونے کی کیا وجہ ہے اور زیادہ وہم ہے تو مجھ کو اس کام کے لئے یہیں بلالیا کیجئے میں اطمینان سے گفتگو کروں گا۔

مقرر صاحب: اور چند دیگر اشخاص، اگر آپ کو بلایا جائے گا تو پھر آپ مہمان ہوں گے اس وقت بھی یہی کہا جاسکے گا کہ مہمان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں چاہئے۔

حضرت والا: ہاں مہمان تو ہوں گا لیکن اسی کام کیلئے تیار ہو کر آؤں گا، آج کی حالت اور اس وقت کی حالت میں فرق ہوگا خیال کیجئے کہ ایک شخص سفر کرے تجارت

کے لئے اور راستہ میں بیمار ہو جائے تو اس کو پریشانی ہوتی ہے اور ایک شخص خاص علاج ہی کی غرض سے سفر کرے تو اس کو پریشانی نہیں ہوتی، وجہ یہی ہے کہ یہ شخص تیار ہی ہو کر علاج کیلئے چلا ہے اس وقت تو میں آیا ہوں احباب سے ملنے کے لئے اور کام مجھ سے یہ لیا جائے تو طبیعت پر گرانی ہوگی اور جب کہ اسی کام کے لئے آؤں گا تو گرانی کیوں ہوگی بلکہ اس وقت تو اس کام کے نہ لئے جانے سے گرانی ہوگی اور مہمان تحفہ بھی لایا کرتا ہے جب مجھے پہلے سے خبر ہوگی تو میں بھی آپ حضرات کے لئے تحفہ لاؤں گا، اس کے بعد وعظ شروع ہوا، درمیان وعظ میں دور سے ایک اور شخص بھی کھڑا ہوا اور کوئی ایسی بے ڈھنگی بات کہی جو سارے مجمع کو ناگوار ہوئی حضرت والا نے فرمایا کہ میں ہر ہر شخص کا جواب کہاں تک دوں گا اگر میرا بیان کرنا خلاف طبع ہے تو صاف الفاظ میں کہہ دو کہ مت بیان کر میں ابھی بند کئے دیتا ہوں اس پر سارے مجمع نے اس شخص پر بہت لعنت ملامت کی اور وعظ کے جاری رکھنے کیلئے اصرار کیا، پھر اس کے بعد مسلسل بیان شروع ہوا۔[1]

---

[1] وعظ الصالحون ملحقہ اصلاح اعمال ص:۱۸ تا ۲۶

مکالمہ نمبر ۴

سیاست حاضرہ سے متعلق ایک فقہی مکالمہ

ملفوظ (۱۱۶)

ایک مولوی صاحب نے کشمیر کے متعلق چند سوالات کئے اس پر حضرت والا نے جو جوابات ارشاد فرمائے وہ بعنوان سوال و جواب ذیل میں درج کرتا ہوں۔

سوال: میں ایک خاص واقعہ کے متعلق اپنی تسلی کے لیے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں اگر حضرت والا بطیب خاطر اجازت فرمائیں؟

جواب: نہایت خوشی سے اجازت ہے اس وقت اور بھی اہل علم موجود ہیں، ضرور ان سوالات کو ظاہر فرمائیے۔

سوال: کشمیر پر جو مسلمانوں کے جتھے جا رہے ہیں ان کا وہاں پر جا کر لڑنا مقصود نہیں صرف حکومت پر اثر ڈالنا ہے، یہ صورت شرعاً کیسی ہے؟

جواب: فرمایا: یہ شرعی لڑائی ہے تو نہیں، اب دو ہی صورتیں ہیں یا قتال پر قدرت ہے یا عجز، اگر قدرت ہے تو قتال اور اگر قدرت نہیں تو صبر، درمیان میں اور کوئی چیز نہیں ہے نہ یہ درمیانی صورتیں سمجھ میں آتی ہیں اور نہ آج کل کی درمیانی صورتیں اسلامی صورتیں ہیں، سب دوسری قوموں کی تقلید ہے۔

سوال: اس وقت کے زمانہ کے لحاظ سے یہ ہی ثابت ہوتا ہے کہ کمزور کو قوی کے مقابلہ میں اِسی صورت سے کامیابی ہوسکتی ہے، یعنی پبلک حکومت کا مقابلہ اسی صورت سے کرسکتی ہے؟

جواب: فرمایا: یہ نصوص کے مقابلہ میں اجتہاد ہے اور اجتہاد کا ہم کو حق نہیں، میں نے جو

دو صورتیں بیان کی یہ تو منصوص ہیں اور آپ جو تدابیر اور طریقِ کار بیان کر رہے ہیں یہ اس منصوص کا معارض ہے، اسی لیے یہ طریق سلف سے منقول نہیں۔

سوال: حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے عرض کرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کھدوائی تھی یہ شاہانِ عجم کی تدابیر میں سے تھی جو غیر قوم تھے؟

جواب: فرمایا: یہاں کوئی نص نہ تھی اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمالیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل فرمالینا منصوص نہ ہونے کی وجہ سے تھا اور یہاں تو منصوص ہے، یہاں پر یہ صورت اختیار نہیں کر سکتے۔

سوال: یہ صورت جو اختیار کی گئی ہے اس سے بھی کامیابی ہو جاتی ہے، سکھ اس سے کامیاب ہو ہی گئے؟

جواب: فرمایا کہ سوال کامیابی عدم کامیابی کا نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ یہ صورت جو اختیار کی گئی ہے اس کا حکم شرعی کیا ہے اس کا میں جواب عرض کر رہا ہوں۔

سوال: اگر بغیر لڑے ہوئے اس صورت کو اختیار کر کے کامیابی ہو جائے تو اس صورت کے اختیار کرنے میں شرعاً کیا حرج ہے؟

جواب: فرمایا: یہی کیا تھوڑا حرج ہے کہ نص کے خلاف ہوا۔

سوال: کچھ نہ کریں مارے جائیں برباد ہو جائیں خاموش رہیں؟

جواب: فرمایا کہ یہ میں نے کب کہا ہے؟ یہ بھی آپ کا اجتہاد ہے منجملہ اور اجتہادات کے، میں نہ واقعات کی نفی کرتا ہوں اور نہ منفعت کی، میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ صورت جو اختیار کی گئی ہے یہ منصوص کے خلاف ہے، آپ کے ذمہ ہے کہ آپ اس کا نصوص کلیہ میں داخل ہونا ثابت کریں، اگر داخل ہے تو مجھ کو بھی بتلا دیا جائے، میں بھی مان لوں گا، خدانخواستہ ضد یا ہٹ تھوڑا ہی ہے جس طرح میں صاف طور پر عرض کر رہا ہوں کہ یہ منصوص کے خلاف اور نصوص کلیہ میں داخل نہیں ہو سکتا اور نصوص کے مقابلہ میں اجتہاد اور قیاس

کوئی چیز نہیں اور نہ ہم کو اس قسم کے تصرف کا حق ہے، آپ بھی صاف بیان کریں جس وقت آپ سمجھا دیں گے میں بھی انشاءاللہ تسلیم کرلوں گا۔

سوال: موجودہ صورت نصوص کے کلیہ میں تو داخل نہیں ہوسکتی، لیکن یہاں پر قیاس سے کام لیا جاسکتا ہے۔

جواب: فرمایا: نص کے ہوتے ہوئے قیاس اور اجتہاد کیجئے، میں کب منع کرتا ہوں مجھے تو بحمداللہ کھلی آنکھوں نظر آتا ہے کہ یہ حق ہے اور یہ باطل۔

سوال: اسی لیے تو دریافت کیا جارہا ہے۔

جواب: فرمایا: اگر آپ کو شرح صدر ہو تو آپ عمل کیجئے یہی سمجھ لیجئے کہ مجھ کو شرح صدر نہیں، مجھ کو اپنے فتوے میں شریک نہ کیجئے اور نہ مجھ سے امید رکھئے کہ میں منصوصات کے خلاف کروں یا اجتہاد کروں، میں تو کٹر مقلد ہوں صاحبین کا قول بھی کہیں اضطرار میں لے لیتا ہوں ورنہ میں تو امام صاحب کے مذہب پر عمل کرتا ہوں، آپ کی تو بھلا کیا تقلید کرسکتا ہوں آپ تو بچے ہیں اور میں بڈھوں کا مقلد ہوں، پھر مزاحاً فرمایا کہ نہیں بڈھوں کا نہیں بلکہ ایک بڈھے کا۔

سوال: لڑ تو سکتے نہیں پھر کیا صورت ہو؟

جواب: جو میں عرض کررہا ہوں وہ منصوص ہے اسی پر عمل کریں، یعنی قدرت کو دیکھ لیں، اگر قدرت اور قوت ہے تو بجائے جتھے بھیجنے کے قتال کریں جہاد کریں، تلوار ہاتھ میں لیں لڑیں اور اگر قدرت نہیں جیسا کہ ظاہر ہے صبر کریں، نیز عجز کی صورت میں یہ بھی ہوگا کہ آئندہ اگر کوئی ضرر پیش آیا تو اس کے برداشت کی بھی قوت نہ ہوگی اور جس ضرر سے بچنے کی قوت نہ ہو یا مشکل ہو اس میں نہ پڑنا چاہئے۔

سوال: (آیت جہاد میں) ''مِنْ قُوَّةٍ'' نکرہ ہے اس وقت جیل جانے کی قدرت ہے۔

جواب: قدرت سے یہ قدرت مراد نہیں بلکہ وہ قدرت جس میں خصم کا کوئی ضرر ہو

اوراس کے ساتھ اپنا کوئی ضرر یقینی نہ ہو۔

سوال: جیل جانے میں تو کوئی ضرر نہیں معلوم ہوتا اور خصم کا ضرر ہے، یعنی اغاظت (غصہ دلانا) پھر کیا حرج ہے؟

جواب: اگر قدرت علی الاضرار یہی ہے تو آج اس کی بھی قدرت ہے کہ ایک دشمن کے منھ پر تھوک دیں۔

اس میں بھی اغاظہ ہے لیکن چونکہ سمجھتے ہیں کہ اس میں ضرر اپنا ہے (اسلئے) ایسا نہیں کرتے، یا ایک دشمن کے ڈھیلا ماردیں اس کی قدرت بھی ہے مگر ایسا نہیں کرسکتے، حاصل وہی ہے کہ قدرت سے مراد وہ قدرت ہے جس میں اس کا معتد بہ ضرر ہو اور اپنا یقینی ضرر نہ ہو اور ظاہر ہے کہ جیل وغیرہ میں اپنا ضرر ہے، اور ان کا کوئی ضرر معتد بہ نہیں۔

قدرت کی دو قسمیں

خوب سمجھ لیجئے کہ قدرت کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں اس پر تو ہم کو قدرت ہے لیکن اس کے کرلینے کے بعد جن خطرات کا سامنا ہوگا ان کے دفع کرنے پر قدرت نہیں، دوسرے یہ کہ فعل پر بھی قدرت ہے اور اس کے کرلینے کے بعد جو خطرات پیش آئیں گے ان کی مدافعت پر بھی قدرت ہو پہلی صورت استطاعت لغویہ ہے اور دوسری صورت استطاعت شرعیہ، خوب سمجھ لیجئے گا اور مدافعت کی فرضیت کے لیے پہلی استطاعت کافی نہیں بلکہ دوسری صورت یعنی استطاعت شرعیہ شرط ہے جس کو اس حدیث نے صاف کردیا، **قال من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه** ۔ ظاہر ہے کہ استطاعت باللسان ہر وقت حاصل ہے، پھر اس کے انتفاء کی

تقدیر کب محقق ہوگی، یعنی اگر کسی فعل کی فرضیت کے لیے محض اس فعل پر قادر ہونا کافی ہوا اور اس سے جو خطرات پیش آنے والے ہوں ان کی مدافعت پر قادر ہونا شرط نہ ہو، تو زبان سے انکار کرنا ہر حالت میں فرض ہونا چاہئے، کیونکہ زبان کا چلانا ہر وقت ہماری قدرت میں ہے پھر وہ کون سی صورت ہوگی جس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر زبان سے بھی مٹانے کی قدرت نہ ہو تو دل سے مٹادے، اس سے ثابت ہوا کہ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اس فعل پر قدرت ہونے کے ساتھ اس میں ایسا خطرہ بھی نہ ہو جس کی مقاومت اور مدافعت و مقابلہ بظن غالب عادۃً ناممکن ہو ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعد اس سے زیادہ شر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

سوال: پھر کیا صورت ہے کشمیر کے مسلمانوں کی امداد کی؟

جواب: یہ صورت ہے کہ وہاں جا کر ان کو تبلیغ کی جاوے اور آپس میں اتحاد کی ترغیب دی جاوے اور جب قوت ہو جائے، لڑیں جہاد کریں۔

سوال: دروازہ پر ہی روک لیا جاتا ہے گرفتار کر لیا جاتا ہے اندر جانے ہی نہیں دیا جاتا؟

جواب: آپ ہی دیکھ لیجئے کہ ایسی حالت میں آپ سے کشمیر کے مسلمانوں کو کیا امداد پہنچ سکتی ہے جب کہ وہاں تک پہنچنے پر بھی قدرت نہیں، جتھوں کا جیل میں جانا، پٹنا، بھوک ہڑتال وغیرہ کرنا، خودکشی کے مرادف ہے اور اگر خودکشی سے کسی کو فائدہ پہنچے تب بھی تو باوجود موجب فوائد ہونے کے جائز نہیں ہے چہ جائیکہ کوئی فائدہ بھی نہ پہنچے تو اس کا درجہ ظاہر ہے یعنی اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خودکشی کرنے سے کفار پر اثر ہوگا تو کیا خودکشی کرنا جائز ہو جائے گا؟ اور یہ جیلوں میں جانا اور بھوک ہڑتال کرنا کیا خودکشی کے مرادف نہیں ہے؟ اگر کوئی نفع بھی خودکشی پر مرتب ہو تو یہ خود ہی اتنا زبردست نقصان ہے کہ جس کا

پھر کوئی بدل ہی نہیں ،حضرت ہر منفعت کا اعتبار نہیں اس کی تو بالکل ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص یوں کہے کہ فلاں شخص کی جان بچ سکتی ہے اگر تم کنوئیں میں گر جاؤ،تو اس کی جان بچانے کی غرض سے کیا کنوئیں میں گر جانا جائز ہوگا؟

سوال: تو کیا پھر قتال ہی کیا جائے؟

جواب: ضرور،مگر قدرت عادی شرط ہےاور محض کامیابی کی خیالی توقع قدرت نہیں ہے۔

سوال: ضرر تو قتال میں بھی ہے،اشد ضرر، کہ جان جاتی ہے؟

جواب: چونکہ قتال مقصود ومنصوص ہے اس لیے اس کا ضرر معتبر نہیں اور یہ تدابیر اورطریق کار غیر منصوص ہیں اس لیے اس کے ضرر کو دیکھا جاوے گا،اور وجہ فرق دونوں میں یہ ہے کہ اصل مقصد یہ ہے کہ فتنہ نہ ہو،قتال فتنہ نہیں ہے، کیونکہ قتال میں طبیعت یکسو ہو جاتی ہے اور سکون ہوتا ہے اور ان امور میں تشتت اور پراگندگی اور اضاعت اوقات ہے،اصل یہ ہے کہ لوگ فقہ کو نہیں دیکھتے پروگرام بناتے وقت،اور فقہ کو محض رائے سے دیکھنا کافی نہیں اور نہ مفید ہے، بلکہ نصوص اور ذوق کے ساتھ دیکھنا مفید ہے اس میں سب احکام اظہر من الشّمس ہیں،فن فقہ نہایت ہی دقیق ہے اسی واسطے میں ہمیشہ احتیاط کے پہلو کو ترجیح دیتا ہوں۔

سوال: ”**من قتل دون عرضه وماله فهو شهيد**“ سے جان دینا جائز نکلتا ہے تو بھوک ہڑتال وغیرہ میں گنجائش معلوم ہوتی ہے؟

جواب: قتل سے مراد خودکشی نہیں ہے بلکہ مراد قتال ہے یعنی لڑو جنگ کرو،اس نیت سے کہ جان اور ایمان اور مال بچ جاوے، پھر اس قتال میں اگر جان چلی جائے تو چلی جائے،وہ شہادت ہے اور خود قتل مقصود نہیں ہے، بلکہ قتال سے اگر لازم آ جائے تو اس کا جواز نکلتا ہے،غرض اس سے مقصود قتال ہے قتل

نہیں، وہ بھی جبکہ اس قتال کی سب شرطیں پائی جاویں اور موانع مرتفع ہوں جس کی تفصیل کتب فقہ میں ہے، اور خود قتل کا مقصود نہ ہونا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں ہر جگہ یُقتَلُون (بصیغۂ مجہول) یَقتلون (بصیغۂ معروف) ہے پس معلوم ہوا کہ یُقتلون خود مقصود نہیں بلکہ یقتلون سے کبھی لازم آجاتا ہے۔

سوال: پوری قدرت تو نہیں مگر جو کچھ بھی ہے اس کا استعمال کس طرح کریں کچھ تو ہونا چاہئے؟

جواب: یہ بھی آپ ہی بتا سکتے ہیں کہ کیا کرنا چاہئے میری تو سمجھ میں اس سے زیادہ نہیں آتا کہ ان کو تبلیغ کرو، اور دین سکھلاؤ اس کے بعد لڑاؤ، میں پوچھتا ہوں ہجرت کے بعد جو مسلمان مکہ میں تھے ان کی جانیں جاتی تھیں، اس وقت اہل مدینہ نے ایک بھی جتھا نہ بھیجا، کوئی بھی جتھا نہ گیا، جب تک آیت قتال نازل نہ ہوئی صبر کے سوا کوئی حرکت اس آئینی جنگ کی جاری نہ ہوئی، پس جنگ اسلامی لڑو، آئین یا ئین کہاں کی خرافات نکالی ہے۔

سوال: ایسے آئین اس وقت ایجاد نہ ہوئے تھے اگر ہوتے تو جنگ بھی ایسی ہی ہوجاتی؟

جواب: بہر حال اس سے اتنا تو معلوم ہوگیا کہ یہ آئین منصوص تو ہے نہیں عقل ہی کا اختراع ہے تو صحابہ بھی عاقل تھے ان کے ذہن میں اور بڑی بڑی تدبیریں آئیں یہ تدابیر کیوں نہ آئیں؟ اور یہ کیا، آج کل کی اختراع شدہ تدابیر میں سے ایک بھی نہ آئی، آئی تو بس قتال کی آئی وہ بھی جبکہ آیت قتال نازل ہوچکی، خلاصہ یہ کہ اگر عمومات سے استدلال ہے تو سوال یہ ہے کہ آج تک امت میں ان عمومات سے استدلال کر کے کسی نے عمل بھی کیا ہے، اور کیا تیرہ سو برس میں ایسی مظلومیت کی صورتیں پیش نہ آئیں تھیں؟ پھر یہ طریقے کیوں نہیں اختیار کئے گئے۔

دوسری بات یہ پوچھتا ہوں کہ ہجرت کے بعد جو مستضعفین مکہ میں رہ گئے تھے ان مسلمانوں میں بھی کچھ قوت اور استطاعت تھی یا نہیں؟ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں قوت اس قدر نہ تھی کہ کسی قسم کا بھی مقابلہ کر سکتے، جواب یہ ہے کہ یہ بالکل غلط ہے ان میں اس قدر قوت تھی کہ ہندوستان کی قوت ان کی قوت کے سامنے گرد ہے۔

سوال: مقابل کفار بھی ایسے ہی قوی تھے اس لیے وہ ان سے مقابلہ نہ کر سکے؟

جواب: یہ تو میرے کلام کا حاصل ہے یہی تو بات ہے اور اب کیا بات رہی، اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر کوئی اختلاف ہی نہیں رہتا، مطلب یہی تو ہوا کہ صبر ہی کرنا پڑے گا عدم قدرت کی حالت میں، جیسا کہ اہل مکہ نے کیا اور جب مدینہ والوں کو قوت ہوگئی اس وقت تلواریں ہاتھ میں لیں اور مکہ پر چڑھائی کی۔

سوال: پہلے آئین کی لڑائی نہ تھی اب تو آئین کی لڑائی ہے۔

جواب: اس کا جواب پہلے ہو چکا ہے، اب پھر سمجھ لیجئے کہ یہ آئین کہاں سے آئے، یہ بھی تو گھڑے ہوئے ہیں، اور صحابہ نے تو سلطنت کی ہے اتنی بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ اس طرح جتھے بھیج کر مکہ والوں کی مدد کرتے، خیر کچھ بھی ہو منقولات سے ثابت کیجئے، عجیب بات ہے کہ آپ مجھ سے تو غیر منقولات منوانا چاہتے ہیں اور آپ منقولات کو بھی تسلیم نہیں کرتے، میں ہرگز ماننے کو تیار نہیں جب تک آپ منقولات سے ثابت نہ کریں، جسے ہمارے بزرگوں نے نظام دین کی حفاظت کے لیے قائم کیا، یعنی تقلید اس کو ایسی آسانی سے نہیں چھوڑ سکتے، اور خرابی تو آج کل زیادہ اسی وجہ سے ہو رہی ہے کہ ہر شخص مجتہد بنا ہوا ہے، واقعی سلف صالحین بڑے ہی حکیم تھے، دنیا میں یہ طبقہ حکماء کا ہے کہ اجتہاد ہی کو بند کر دیا، وہ ہم سے دین کو سمجھنے والے تھے، مزاحاً فرمایا کہ ہم لوگ تو عنداللہ بھی معذور ہوں گے پوچھا جائے گا تو عرض

کردیں گے کہ اے اللہ! کوئی دلیل ہی سمجھ میں نہ آئی تھی، اور آپ سے پوچھا جائے گا کہ باوجود دلیل معلوم ہونے کے بھی کشمیر کے مسلمانوں کی کیوں امداد نہیں کی اور وہاں پر کیوں نہیں گئے؟ ہم تو وہاں پر بھی بری، اور آپ سے وہاں بھی باز پرس۔

میں ایک کام کی بات عرض کرتا ہوں کہ ان چیزوں میں نرے دلائل کافی نہیں تھوڑے سے ذوق کی بھی ضرورت ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ ان جدید تدابیر اور طریق کار میں غیر منصوص ہونے کے علاوہ میرا ذوق بھی ان چیزوں کے خلاف ہے، اور مدار قبول اسکاتِ خصم نہیں اسقاط ہے۔

سوال: ہم ہر طرح پر کمزور ہیں کچھ نہیں کر سکتے۔

جواب: یا تو اس قدر قوت تھی جوش تھا کہ منصوص کے مقابلہ میں غیر منصوص پر عمل کرنے کو تیار تھے یا یہ عقیدہ کرلیا ہے کہ ہم کمزور ہیں، کام کیجئے، مگر شرط یہ ہے کہ حدود شرعیہ کو محفوظ رکھتے ہوئے کام کیجئے۔

انبیاء علیہم السلام کی تدابیر میں اثر نہ ہو غضب کی بات ہے اپنی اختراع کی ہوئی تدابیر کو مؤثر سمجھیں، میں پوچھتا ہوں کہ تدابیر کے استعمال میں خدا کے راضی کرنے میں کامیابی کا اثر ہوگا یا ناراض کرنے میں؟ ظاہر ہے کہ راضی کرنے میں اثر ہوگا تو اس کی ایک ہی تدبیر ہے کہ تدابیر منصوصہ پر عمل کیا جائے۔

سوال: ان غیر منصوصہ پر جو عمل کیا جائے گا غیر مشروع اور برا سمجھ کر تھوڑا ہی کریں گے تو اس میں بھی خدا تعالیٰ کی ناراضی نہ ہوگی؟

جواب: یہ تو اور بھی برا ہے کہ معصیت کو معصیت بھی نہ سمجھا جائے، بلکہ معصیت کو نیکی سمجھ کر کیا جاوے یہ درجہ تو اس سے بھی برا ہے اور بہت برا ہے پھر بدعت کوئی چیز ہی نہیں رہتی، اس لیے کہ بدعتیں جس قدر ہیں سب کو دین ہی سمجھ

کر کرتے ہیں، اہل بدعت یہی جواب دے سکتے ہیں کہ ہم برا سمجھ کر تھوڑا ہی کرتے ہیں اس سے تو سنت اور بدعت، جائز اور ناجائز میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا، ہر برے کام میں نیت اچھی کرلیا کریں کہ ہم جو کر رہے ہیں یہ برا کام نہیں بلکہ نیک کام ہے، آپ ہی بتلایئے کہ یہ کلیہ کہاں تک صحیح ہے جو آپ نے بیان کیا؟

سوال: منصوص تدابیر کے مقابل ان جدید کو منہی عنہ نہیں فرمایا گیا، نہ نہی وارد ہے نہ حکم ہے تو اس صورت میں مسکوت عنہ کہا جائے گا ممنوع ہونے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: جن چیزوں کی حاجت خیر القرون میں نہ ہوئی ہو اور خیر القرون کے بعد حاجت پیش آئی ہو اور نصوص ان کے خلاف نہ ہوں وہ تو مسکوت عنہا ہو سکتی ہیں لیکن ان چیزوں کی تو حاجت ہمیشہ ہی پیش آتی رہی پھر بھی نصوص میں صرف جہاد یا صبر ہی کا حکم ہے تو اس اعتبار سے یہ مسکوت عنہ نہ ہوگا، منہی عنہ ہوگا کہ باوجود ضرورت کے متقدمین نے اس کو ترک کیا، اختیار نہیں کیا، تو اجماع ہوا اس کے ترک پر اس لیے ممنوع ہوگا۔

علاوہ ان سب باتوں کے ایک یہ بات باریک ہے جس کو سمجھ لینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہر کام کرنے کے لیے حدود کی ضرورت ہے ان تحریکات میں بھی ضرورت ہے، سو اس کا تحفظ کون کرے گا یا کون کرائے گا، ایک لڑکا زمانۂ خلافت میں ہجرت کر گیا اس کی ماں روتی روتی اندھی ہوگئی اس کو کون دیکھے گا کہ کس کو جانا چاہئے اور کس کو نہیں اگر تدابیر جدیدہ جائز بھی ہوں تب بھی اس کی ضروت ہے کہ کوئی امیر ہو، تاکہ حدود کی رعایت خود بھی کرے اور دوسروں سے بھی کرائے، بلا امیر کے کچھ نہیں ہو سکتا۔[1]

---

[1] ملفوظات حکیم الامت ۱/۶۲ قسط:۱

مکالمہ نمبر ۵

ایک مولوی صاحب نے کشمیر کے متعلق چند سوالات کئے اس پر حضرت والا نے فرمایا کہ امیر پر یاد آیا ایک ڈاکٹر صاحب ہیں پنجاب میں بہت ہی مخلص اور سمجھ دار شخص ہیں زمانۂ تحریک خلافت میں ان کے ایک عزیز بڑے ہی جوش اور سرگرمی کے ساتھ حصہ لیے ہوئے تھے، ڈاکٹر صاحب ان معاملات سے یکسو تھے ایک روز ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ اس تحریک میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟ ڈاکٹر صاحب نے میرا نام لے دیا کہ وہ شریک نہیں اس لیے میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا، یہ سن کر بولے کہ میں اس کو تو پانچ منٹ میں اپنے ساتھ کرلوں گا دیکھیں کیسے شریک نہیں ہوتے، مجھ کو تھانہ بھون لے چلو میں گفتگو کروں گا، ڈاکٹر صاحب نے یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ میرے بھائی ایسا کہتے ہیں، اگر اجازت ہو ساتھ لے کر آؤں، میں نے لکھ دیا کہ ضرور لاؤ، ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو اس قدر ذہین ہو، مجھے خود ان سے ملاقات کا اشتیاق ہو گیا، اس لیے کہ ایسا ذہن آدمی کہاں ملتا ہے۔

میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میری ہمیشہ یہ نیت رہی اور ہے کہ مسلمان تو بڑی چیز ہیں اگر مجھ کو بھنگی کا بچہ بھی سمجھا دے، میں مان لوں گا، خدانخواستہ کوئی ضد یا ہٹ تھوڑا ہی ہے، ہاں اسی کے ساتھ یہ بھی نیت رہی کہ بدون مسئلے کو سمجھے ہوئے ایک انچ بھی قدم نہ اٹھاؤں گا، دوسرے یہ ہے کہ مصالح وغیرہ کو شریعت مقدسہ پر مقدم نہیں کرسکتا، یہ میرا فطری امر ہے میں اس میں مجبور ہوں، مجھ سے مصالح پرستی نہیں ہوسکتی، مصالح تو یہاں پر پیس دیئے جاتے ہیں، میں تو کہا کرتا ہوں کہ مصالحوں کو سل پر خوب پیسا جائے، جتنا پیسا جائے گا اتنا ہی سالن لذیذ ہوگا۔

فرمایا کہ مصالح پر یاد آیا جان سے بڑھ کر تو کوئی مصالح نہ ہوں گے، جس زمانہ میں تحریک خلافت کا شباب تھا، شورش پسند طبیعتیں جوش میں بھڑک رہی تھیں۔

چہار طرف ایک آگ لگی ہوئی تھی یہاں تک نوبت آ گئی تھی کہ علاوہ برا بھلا کہنے اور لعن طعن اور قسم قسم کے بہتان والزامات لگانے کے دھمکی کے خطوط میرے پاس آئے کہ یا تو شریک ہو جاؤ ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے، اس وقت غایت شفقت اور محبت کی بنا پر حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے ایک خاص اور معتمد شخص کی زبانی کہلا کر بھیجا کہ یہ وقت خطرہ کا ہے اگر بظاہر تھوڑی سی شرکت کر لو تو گنجائش ہے، میں نے کہلا بھیجا کہ یہ آپ کی محبت اور شفقت کا اقتضاء ہے مگر سب سے بڑا خطرہ جان کا چلا جانا ہے سو اس کے لیے میں اپنے نفس کو تیار پاتا ہوں لیکن اس پر آمادہ نہیں ہوں کہ بلا سمجھے شرکت کر لوں، اور نہ اس پر قدرت ہے کہ بظاہر تو شرکت کروں اور باطن میں الگ رہوں، اس کو میں منافقت سمجھتا ہوں اور بحمد اللہ اس وقت تک ہر خطرہ سے محفوظ آپ کے سامنے زندہ اور صحیح سلامت موجود ہوں، لڑکیوں کا کھیل بنا رکھا ہے، یہ دین ہے کہ یا تو وہ کرو جو ہم کریں ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے، اسی زمانہ میں میں جنگل معمول کے موافق صبح کو گیا، ایک ہندو راجپوت بوڑھا تھانہ بھون ہی کا رہنے والا ملا، بستی کے ہندو بھی جو پرانے خیال کے اور پرانے عمر کے ہیں محبت کرتے ہیں۔

کہنے لگے مولوی جی کچھ خبر بھی ہے تمہارے واسطے کیا تجویزیں ہو رہی ہیں تنہا اس طرح جنگل میں مت آیا کرو، میں نے کہا کہ چودھری مجھ کو اس کی بھی خبر ہے اور ایک بات کی اور بھی خبر ہے جس کی تم کو خبر نہیں کہنے لگا کہ جی وہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ بدون اس کے حکم کے کوئی کچھ نہیں کر سکتا، وہ تھا تو ہندو مگر یہ سن کر اس قدر اس پر اثر ہوا، جوش میں آ کر کہنے لگے کہ مولوی جی تم جہاں چاہے پھرو، تمہیں کچھ جوکھم (خطرہ) نہیں ایسے آدمی کے لیے گھر، جنگل پہاڑ سب ایک ہی سے ہیں۔

غرض کہ ڈاکٹر صاحب اپنے بھائی کو ہمراہ لے کر یہاں پر آئے پہلی ملاقات تھی مگر نہایت بے تکلفی سے گفتگو شروع کی، گفتگو کرنے پر معلوم ہوا کہ آدمی سمجھ دار تھے، مگر غلطی میں مبتلا تھے۔

کہنے لگے کہ میں بلاتمہید عرض کرتا ہوں کہ آپ اس تحریک میں شریک کیوں نہیں؟۔

میں نے کہا کہ میں بھی بلاتمہید عرض کرتا ہوں کہ جو کام اس وقت اٹھا ہے اس میں ضرورت ہے، اتفاق کی حدوثاً بھی، بقاءً بھی اور اول تو مجھ کو حدوث اتفاق ہی میں کلام ہے، لیکن علی سبیل التنز ل اگر مان بھی لیا جائے تو بقاء کا کون ذمہ دار ہے، اس لیے کہ بقاء کے لیے ارادت کافی نہیں قہر وقوت کی ضرورت ہے اور وہ قوت امیر المومنین ہے، اور اس وقت مسلمانوں کا کوئی امیر یا سردار نہیں، جو ان کی قوت کو ایک مرکز پر جمع رکھ سکے، جو روح ہے اس کام کے کرنے کی، تو خلاصہ شرط کا یہ ٹھہرا کہ مسلانوں کا کوئی امیر المومنین ہو سب سے بڑا اور اہم مسئلہ یہ ہے سو اس کی کیا صورت ہے؟

کہنے لگے کہ ہم آپ ہی کو امیر المومنین بناتے ہیں۔

میں نے کہا کہ میں امیر المومنین بننے کو تیار ہوں مگر اس میں کچھ شرائط ہیں، میں نے ان شرائط کی تقریر کی، جس کا حاصل یہ ہے کہ اول شرط یہ ہے کہ تمام ہندوستان کے مسلمان اپنا تمام مال اور جائداد میرے نام ہبہ کر دیں، میں بھیک مانگنے والا امیر المومنین نہیں بنوں گا، اور مانگنے کی بھی کوئی حد ہے کوئی ایک دفعہ دے گا دو دفعہ دے گا تین دفعہ دے گا، بالآخر اکتا جائے گا کہ ان کا تو رات دن کا یہی قصہ ہے۔

دوسرے ایسے کام چندوں سے نہیں چلا کرتے چندوں سے جن کے کام چلے ہیں ان کے مال ان کی جان ان کی آبرو ان کے بیوی بچے سب خدا کی راہ پر اپنے کو قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے اور اصل مقصد میں سب متحد تھے، خلوص سے ان کے قلوب پر تھے، ان کی کیا کوئی ہمسری کا دعوی کرسکتا ہے اور اس کا کوئی وقت مقرر نہیں کہ کب تک یہ ضرورت رہے اور یہ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں

تجربات کی بنا پر اس لیے کہ آج کل چندوں کی اس قدر بھرمار ہے کہ لوگ دیتے دیتے اکتا گئے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی ضرورت صرف کی فوری پیش آ گئی اور پلے ہے نہیں اب اگر رقم وقت پر اپنے موقع پر نہ پہنچی تو کیا ہوگا سوائے اس کے کہ ناکامیابی ہو اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے، مثلاً ضرورت تو ہے آج اور آپ کھڑے ہوئے چندہ کو، پھر اس میں بھی یہ ضرور تھوڑا ہی ہے کہ فوری کامیابی ہو جائے، یہ بھی تو احتمال ہے کہ کامیابی نہ ہو تو ایک یقینی ضرورت کو احتمالی بات پر معلق کر دینا یہ کونسی عقلمندی کی بات ہے، اب بتلائیے کہ اس وقت چندہ کی فکر کی جائے گی یا کام کی؟ تو پہلے اس کا انتظام کیا جائے۔

اب سنئے کہ میں اس سرمایہ سے جو میرے نام ہبہ ہوگا سامان جمع کروں گا اور یہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہبہ کرنے کے بعد ہبہ کرنے والوں میں سے کسی کو تکلیف نہ ہونے دوں گا، سب کو حسب حیثیت اور مذاق انشاء اللہ تعالیٰ خرچ دوں گا اور یہ بھی اطمینان دلاتا ہوں اور اگر اطمینان نہ ہو تو تحریر مجھ سے لکھالی جائے کہ بعد انفراغ اور کامیابی کے بجنسہٖ سب کی جائداد وغیرہ واپس کر دوں گا رکھوں گا نہیں،

دوسری شرط یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام مشاہیر علماء اور لیڈروں کے دستخط کراؤ کہ وہ مجھ کو امیر المومنین تسلیم کر لیں، اگر بلا اختلاف سب نے تسلیم کر لیا تو میں امیر المومنین ہوں گا اگر ایک نے بھی اختلاف کیا تو میں امیر المومنین نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ اختلاف کی صورت میں امیر امیر نہیں ہوسکتا، ہاں اگر تسلیم کے بعد پھر کوئی اختلاف یا خلاف کرے تو امیر کو حق ہے کہ وہ اپنی قوت سے ایسے لوگوں کو دبائے اور ٹھیک کرے، قبل از تسلیم حق نہیں کہ اس کو دبایا جائے، ایک یہ کام کرا دیجئے۔

اب سنئے کہ امیر المومنین ہونے کے بعد سب سے اول جو حکم دوں گا وہ یہ ہوگا کہ دس سال تک کے لیے سب خاموش، ہر قسم کی تحریک اور ہر قسم کا شور وغل بند، اس

دس سال میں انتظام کروں گا مسلمانوں کو مسلمان بنانے کے اور ان کی اصلاح کے لیے باقاعدہ انتظام ہوگا، غرض کہ مکمل انتظام کے بعد جو مناسب ہوگا حکم دوں گا۔

عملی صورت یہ ہے کام کرنے کی اور محض کاغذی امیر المومنین بنانا چاہتے ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج امیر المومنین ہوں گا کل کو اسیر الکافرین ہوں گا آج سردار بنوں گا کل کو سرِ دار ہوں گا۔

یہ تقریر سن کر ان کی تو سب ذہانت ختم ہوگئی اور یہی مقصود تھا اس تقریر سے کہ ان کو اپنے خیالی منصوبوں کی حقیقت معلوم ہو جائے، ورنہ امیر المومنین کون بنتا ہے اور کون بناتا ہے، یہ تقریر بھی ایک علمی ناول تھا جس میں فرضیات سے مفید سبق دیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر کام اصول سے ہو سکتا ہے بے اصول تو گھر کا بھی انتظام نہیں ہو سکتا، ملک کا تو خاک انتظام ہوگا، یہ ہیں وہ اصولی باتیں جن پر مجھ کو برا بھلا کہا جاتا ہے اور قسم قسم کے الزامات و بہتان میرے سر تھوپے جاتے ہیں اور لوگ مجھ سے خفا ہیں، اور وجہ خفا ہونے کی صرف یہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ اصول کے ماتحت کام کرو جوش سے کام مت لو ہوش سے کام لو، جوش کا انجام خراب نکلے گا، حدود شرعیہ کی حفاظت رکھو، وہ ان باتوں کو اپنے مقاصد میں روڑا اٹکانا سمجھتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر دین نہ رہا اور احکام اسلام کو پامال کرنے کے بعد کوئی کام بھی کیا تو وہ کام پھر دین کا نہ ہوگا، کیا یہ دین کی خیر خواہی اور ہمدردی کہلائی جا سکتی ہے؟

اے صاحبو! آج سے پہلے بھی تو اسلام اور مسلمانوں پر اس سے بڑے بڑے حوادث پیش آئے ہیں کہ اس وقت اس کا عشرِ عشیر (دسواں حصہ) بھی نہیں مگر انہوں نے اس حالت میں بھی اصولِ اسلام اور احکامِ اسلام کو نہیں چھوڑا، سلف کے کارناموں کو پیش نظر رکھ کر کچھ تو غیرت آنا چاہئے، تم تو معمولی معمولی باتوں میں

احکامِ اسلام ترک کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہو، وہ حضرات عین قتال کے وقت میں بھی حدود کی حفاظت اور رعایت فرماتے تھے جس پر آج ہم کو فخر ہے، اب تم ہی فیصلہ کرلو کہ وہ تھے خیر خواہِ اسلام، ہمدردِ اسلام، جاں بازِ اسلام یا تم؟ تحریکِ خلافت کے زمانہ میں صاف الفاظ میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ مسائل کا وقت نہیں، کام کرنے کا وقت ہے۔

میں بقسم عرض کرتا ہوں اور خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر مسلمان مضبوطی کے ساتھ اپنے دین کے پابند ہو جائیں اور تمام آپس کے مناقشات کو ختم کر کے متحد ہو جائیں اور اپنی قوت کو ایک مرکز پر جمع کر لیں اور جس کو اپنا خیر خواہ سمجھ کر بڑا بنائیں اس کے کہنے اور مشوروں پر عمل کریں، اس کی اتباع سے سرمو اعراض نہ کریں، تو پھر ان کو نہ کسی کی شرکت کی ضرورت، نہ ان کو کسی سے خوف کی ضرورت اور نہ ان کا کوئی کچھ بگاڑ سکتا ہے، ہر کام طریقہ اور اصول سے ہوتا ہے، معمولی معمولی باتوں میں بغیر اصول پر عمل کئے آدمی ناکامیاب رہتا ہے، یہ اتنا بڑا کام اور اس کا کوئی اصول نہ ہو، سخت حیرت ہے، ہماری تو ہستی اور وجود ہی کیا ہے، صحابۂ کرام جن کی مقبولیت اور فراست وعقل تمام دنیا کو تسلیم ہے اور بڑے بڑے عقلا اس پر متفق ہیں، انہوں نے بھی ساری عمر یہ کام کئے مگر اصول اور حدود کو ہاتھوں سے نہیں چھوڑا یہی راز ان کی کامیابی کا ہے، یہ تو ہر شخص کی زبان پر ہے کہ ان کو کامیابیاں ہوئیں، ان کی نصرت ہوئی، وہ تمام عالم پر بے سروسامانی کی حالت میں غالب آئے، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ ان کا طریقۂ کار کیا تھا، ان کا اس جد وجہد سے کیا مقصود تھا، ان کی نیت کیا تھی، ان کے اعمال کیسے تھے، وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے تھے، وہ احکامِ اسلام پر کس درجہ عامل تھے، ان کے قلوب میں اسلام اور احکامِ اسلام کی کس قدر عظمت اور محبت تھی،

ثمرات پر تو نظر ہے اسبابِ ثمرات پر بھی تو نظر ہونا چاہئے ،اوراس پر اپنی حالت کو منطبق کرنا چاہئے ،کھوٹے کھرے کا فرق بسہولت معلوم ہو جائے گا، اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ ہم ان کامیابیوں اور نصرتوں کے مستحق ہیں یا نہیں،نرے دعوے اور زبانی باتیں ہانکنے سے کہیں کام چلا کرتا ہے،کام تو کام کرنے سے ہوا کرتا ہے۔

اگر مسلمان تنہا اصول کے ماتحت حدودِ شرعیہ کا تحفظ کرتے ہوئے اور کسی کو اپنا بڑا بنا کر کام کریں ،اپنی مالی اور جانی قوت کو ایک مرکز پر جمع کرلیں ، پھر کسی کو بھی اختلاف نہ ہوگا ، مسلمانوں کے جو مقاصد شرعیہ یا اپنی بہبودی دنیا و دین کیلئے مطالبات ہیں مجھ کو ان سے اختلاف نہیں اور نہ کوئی مسلمان اختلاف کرسکتا ہے وہ تو سب ہی کو مطلوب ہیں، مجھ کو جو اختلاف ہے وہ طریق کار سے ہے۔

میرا معمول ہے کہ مجھے جب کوئی اس قسم کا مشورہ دیتا ہے کہ یہ کرنا چاہئے اور یہ ہونا چاہئے ، میں جواب میں ایسا طریقہ بتلا دیتا ہوں کہ اس میں اُن حضرت کو بھی کچھ کرنا پڑے اور خود بھی شرکت کا وعدہ کرلیتا ہوں، باوجود میرے وعدۂ شرکت کے کسی کو بھی آمادہ نہیں دیکھا، دوسروں ہی کو چاہتے ہیں کہ سب یہی کریں ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے۔[1]

---

[1] ملفوظات حکیم الامت ۱/۶۲ تا ۶۷ قسط:۱

ایضاً

فرمایا: تحریکات کے زمانہ میں ایک مولوی صاحب سے مکاتبت ہوئی وہ یہاں پر اسی سلسلہ میں گفتگو کرنے کے لئے آنا چاہتے تھے، میں نے ان کو جواب لکھا جس کا حاصل یہ ہے کہ گفتگو کی کئی قسمیں ہیں، ایک افادہ (یعنی دوسرے کو فائدہ پہنچانا) اور ایک استفادہ (یعنی دوسرے سے فائدہ حاصل کرنا) اور ایک مناظرہ، اب اگر افادہ مقصود ہے تو اجازت ہے مگر میرے ذمہ اس کا جواب نہ ہوگا بس سن لوں گا، یہ تو آپ کی طرف سے تبلیغ ہوگی، جب فرض ادا کر دیا، تو جایئے۔

اور اگر استفادہ مقصود ہے تو اس کے لئے تردد شرط ہے (کہ اس مسئلہ کا آپ کو صحیح علم نہیں) اور تردد آپ کو ہے نہیں اس لئے کہ آپ اپنی رائے کا اعلان کر چکے، تردد کی حالت میں اعلان نہیں ہوا کرتا، اور اگر اب تردد ہو گیا تو اب اعلان کر دیجئے کہ اب مجھ کو تردد ہو گیا، میری سابق رائے پر عمل نہ کیا جائے، اس طرح جب یہاں آیئے گا تو میں تقریر کروں گا۔

اور اگر مناظرہ (وتحقیق) مقصود ہے تو اس کے نافع ہونے کے لئے بے تکلفی شرط ہے اور آپ کی مجھ سے بے تکلفی ہے نہیں ایسی حالت میں گفتگو کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کو اپنی بات کی پچ ہوگی، مجھ کو اپنی بات کی، بے تکلفی نہ ہونے کی وجہ سے ایک کو دوسرے کی بات قبول کرتے ہوئے شرم دامنگیر ہوگی کہ اگر قبول کر لیا تو ہیٹی ہوگی سُبکی ہوگی، ایسی حالت میں گفتگو کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا، میرا اور آپ کا وقت فضول بیکار جائے گا۔

اس کا جواب آیا کہ ہم کو اس کا جواب نہیں آتا حاضری کی اجازت دے دی جائے، میں نے لکھا کہ آجایئے سو وہ تو نہیں آئے دوسرے مولوی صاحب

آئے، مولوی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں خلوت میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں، میں نے خلوت میں گفتگو کرنے سے انکار کردیا، اور وجہ اس کی میں نے یہ بیان کی کہ مجمع میں گفتگو کرنے میں تو آپ کو خطرہ ہے کہ حکومت کے خلاف گفتگو ہوگی مگر اس خطرہ کے لئے تو آپ تیار ہیں کیونکہ آپ اپنی رائے کا اعلان کرچکے ہیں، آپ کو نہ جیل خانے کا ڈر نہ مشین گنوں کا ڈر نہ توپوں اور فوجوں کا ڈر، خلوت میں گفتگو کرنے میں مجھ کو خطرہ ہے کہ مجھ پر اشتباہ ہوگا اور میں اس کے لئے تیار نہیں، غرض خلوت میں گفتگو کرنے میں آپ کی کوئی مصلحت نہیں اور جلوت میں گفتگو کرنے میں میری مصلحت ہے اس لئے آپ مجمع میں گفتگو کریں یہی مناسب ہے، مولوی صاحب نے بکراہت جلوت میں گفتگو کرنے کو قبول کرلیا اور گفتگو کا وقت بعد نماز مغرب طے ہوا، میں نے ملفوظات ضبط کرنے والوں سے کہا کہ تم پنسل کاغذ لے کر بیٹھ جانا اور مولوی صاحب جو فرمائیں اس کو ضبط کرلینا اور مصلحت اس ضبط میں یہ ہے کہ میں مولوی صاحب کی تقریر میں بعد میں غور کرسکوں، کیوں کہ خدانخواستہ کوئی ضد یا ہٹ تھوڑی ہے، یہ تو دین کا معاملہ ہے اور بیان کے وقت آدمی پورے طریقہ سے غور نہیں کرسکتا اور بعد میں اگر غور کرے تو کل تقریر کا ماغ میں محفوظ رہنا مشکل ہے، اس لئے ضبط کا انتظام کیا گیا، غرض یہ کہ بعد نماز مغرب میں معمول سے فارغ ہوکر بیٹھ گیا، اور مولوی صاحب سے عرض کیا کہ میں اس وقت فارغ ہوں آپ تقریر شروع فرماویں، اس وقت خانقاہ میں ایک مجمع موجود تھا، یہ رنگ دیکھ کر مولوی صاحب سمجھے کہ اس نے تو اچھا خاصہ محکمہ قائم کرلیا، خاموش رہے تقریر شروع نہیں فرمائی، مجھے قرائن سے محسوس ہوا کہ اس وقت انہیں گرانی ہے، میں نے رعایت کی اور یہ رعایت قدیم تعلق کی بنا پر تھی، مجھے ان کا ادب بھی ملحوظ ہے اور ان کو بھی مجھ سے محبت ہے، تعلقات کے حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے کہا کہ اس وقت ایک اور بات

سمجھ میں آئی، کہ جیسے میں نے اپنی مصلحت کی وجہ سے تقریر کے ضبط کا انتظام کیا ہے کہ کوئی بات غور کرنے سے نہ رہ جائے ایسے ہی آپ کی مصلحت پر بھی نظر ہے تاکہ بعد میں آپ کو بھی افسوس نہ ہو کہ فلاں بات بیان سے رہ گئی اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس وقت گفتگو ملتوی کیجئے اور اپنے مستقر پر واپس تشریف لے جایئے، کتابیں دیکھ کر علماء اور لیڈروں سے مشورہ کیجئے اس کے بعد تقریر لکھئے وہ تقریر جامع ہوگی اور وہ تحریر بذریعہ ڈاک میرے پاس بھیج دیجئے اس میں آپ کی اور میری دونوں کی مصلحت محفوظ رہے گی، آپ کو ضبط تقریر کا بہترین موقع ملے گا اور مجھ کو غور کرنے کا، اس لئے کہ اس وقت کے ضبط کرنے میں کوئی نہ کوئی بات رہ جائے گی، سب ضبط نہیں ہوگی، غرض یہ صورت اس سے بہتر ہے، اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپ کی تحریر کو دل نے قبول کرلیا تو میں رجوع کرلوں گا بلکہ اخباروں میں چھپوادوں گا اور اگر دیکھنے اور غور کرنے کے بعد دل نے قبول نہ کیا تو خاموشی اختیار کروں گا اس سے محض آپ ہی سمجھ سکیں گے کہ قبول نہیں کیا عام لوگوں کو اس کا علم بھی نہ ہوگا۔

میں نے یہ رعایت اس لئے کی کہ میں ہمیشہ اہل علم کی عزت کو برقرار رکھنے کی تدابیر اختیار کرتا ہوں، ان کی سبکی اور ذلت کبھی گوارا نہیں ہوتی، غرض وہ صاحب واپس تشریف لے گئے مگر آج تک بھی وہ تبلیغ نہ آئی، اور اس کے بعد پھر میرا اشتہار دیکھ لیا کہ یہ تحریر فتنہ ہے اس لئے پھر نہ خود آئے نہ مکاتبت کی۔

(ملفوظات حکیم الامت ص ۵۸۷ ج ۱، ۵)

مکالمہ نمبر ۶

ایک غیر مقلد انصاف پسند سے مکالمہ

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا: کہ ایک غیر مقلد مولوی صاحب لکھنؤ سے یہاں آئے تھے، نہایت صفائی کی باتیں کیں، بڑا ہی جی خوش ہوا، خوش فہم اور سمجھدار تھے، ملتے ہی کہنے لگے کہ شاید بعد میں آپ کو معلوم ہوکر کہ یہ فلاں جماعت کا شخص ہے تنگی ہوتی اس لئے میں پہلے ہی عرض کئے دیتا ہوں کہ میں عامل بالحدیث ہوں، میں نے کہا میں آپ کے صدق اور خلوص کی قدر کرتا ہوں، اور میں بھی صاف بتلائے دیتا ہوں کہ ہمارے یہاں اتنی تنگی نہیں کہ محض فرعی اختلاف سے انقباض ہو، ہاں جن لوگوں کا شیوہ بزرگوں کی شان میں گستاخی کرنا اور بدتمیزی اور بدتہذیبی سے کلام کرنا ہے ایسے لوگوں سے ضرور لڑائی ہے، یہ مولوی صاحب حسین عرب صاحب کے پوتے ہیں جو بھوپال میں تھے، کئی روز رہے اور بڑے لطف سے رہے، ویسے بھی آنکھیں کھل گئیں کیونکہ ان لوگوں کو عامل بالحدیث ہونے کا بڑا دعویٰ ہے، دوسروں کو بدعتی اور مشرک ہی سمجھتے ہیں، کہتے تھے کہ یہاں پر تو کوئی بات بھی حدیث کے خلاف نہ دیکھی۔

دو مسئلے بھی پوچھے ایک تو یہ کہ اہل قبور سے فیض ہوتا ہے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ ہوتا ہے اور حدیث سے ثابت ہے اس پر ان کو حیرت ہوگئی کہ حدیث سے اہل قبور سے فیض ہونا کہاں ثابت ہوگا، اس لئے کہ ساری عمر حدیث میں گذر گئی کسی حدیث میں نہیں دیکھا، میں نے کہا کہ سنئے ترمذی میں حدیث ہے کہ کسی صحابی نے لاعلمی میں ایک قبر پر خیمہ لگالیا، وہاں ایک آدمی سورہ پڑھ رہا تھا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا آپ نے فرمایا یہ سورہ مردہ کو عذاب قبر سے نجات دیتی ہے، دیکھئے قرآن کا سننا فیض ہے یا نہیں؟ اور مردے سے قرآن سنا تو اہل قبور سے فیض ہوا یا نہیں؟ بے حد مسرور ہوئے،

خوش ہوئے کہا کہ آج تک اس طرف نظر نہ گئی۔

دسرا مسئلہ سماع موتی کا پوچھا اور کہا کہ ''اِنَّکَ لاتُسْمِعُ الْمَوْتیٰ'' قرآن میں ہے جس سے اس کی نفی معلوم ہوتی ہے، میں نے کہا کہ حدیث میں وقوع سماع مصرح ہے اور اس آیت سے نفی نہیں ہوتی، اس لئے کہ یہاں پر حق تعالیٰ نے کفار کو موتی سے تشبیہ دی ہے اور تشبیہ میں ایک مشبہ ہوتا ہے اور ایک مشبہ بہ اور ایک وجہ تشبیہ جو دونوں میں مشترک ہوتی ہے، تو یہاں وہ عدم سماع مراد ہے جو موتی اور کفار میں مشترک ہے، اور اموات کا سماع وعدم سماع تو معلوم نہیں مگر کفار کا تو معلوم ہے کہ قرآن وحدیث کو سنتے ہیں مگر وہ سماع نافع نہیں اور یہ معلوم ہے کہ مشبہ مشبہ بہ میں وجہ شبہ میں تماثل ہوتا ہے، پس کفار سے جو سماع منفی ہے یعنی سماع نافع ویسا ہی سماع اموات سے منفی ہوگا نہ کہ مطلق سماع، بے حد دعا دی، پھر بیعت کی درخواست کی، میں نے کہا کہ اس میں تعجیل مناسب نہیں، پھر بیان کیا کہ میں فلاں عالم غیر مقلد سے بیعت بھی ہو چکا ہوں، میں نے کہا کہ اب تکرارِ بیعت کی کیا ضرورت؟ کہنے لگے کہ ان سے بیعت تو بہ ہوجائے گی آپ سے بیعت طریقت، میں نے کہا کہ یہ بتلایئے کہ انہوں نے بوقت بیعت آپ سے کیا عہد لیا تھا؟ کہا کہ کتاب وسنت پر عمل اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔

میں نے کہا کہ یہی یہاں پر ہے، اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں، بس مقصود حاصل ہے، اس پر سوال کیا کہ کیا تکرارِ بیعت خلاف شریعت ہے؟ معصیت ہے؟ میں نے کہا کہ معصیت تو نہیں مگر بواسطہ مفضی ہوسکتی ہے معصیت کی طرف، وہ یہ کہ جب شیخ اول کو معلوم ہوگا کہ یہاں کے تعلق کے بعد فلاں جگہ تعلق پیدا کیا، تو بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ انقباض کا اثر قبول کرتی ہیں تو اس اثر سے حُب فی اللہ میں کمی ہوگی، یا بالکل زائل ہوجائے گی، پھر اس کے ساتھ ہی تکدر ہوگا اور یہ تکدر اذیت ہے، اور حب فی اللہ کا بقا واجب ہے اور اذیت سے بچانا بھی واجب ہے، اور یہ تکرارِ بیعت سبب ہوا

اس واجب کے اخلال کا تو بواسطہ مفضی ہوا معصیت کی طرف، حیرت میں تھے بیچارے کہ یہاں تو ہر چیز حدیث کے ماتحت ہے، سمجھ تو گئے ہوں گے کہ ہم حدیث وقرآن کو خاک نہیں سمجھتے، یہ اللہ کا فضل ہے کہ ہر چیز بقدر ضرورت قلب میں پیدا فرمادیتے ہیں ، بحمداللہ تعالیٰ اپنے بزرگوں سے ضرورت کی ہر چیز کانوں میں پڑ چکی ہے، جس نے زیادہ کتابوں کے دیکھنے سے بھی مستغنی کردیا ہے، اور کتابیں تو پہلے ہی سے نہیں آتی تھیں نہ کبھی طالب علمی کے زمانہ میں زیادہ کنج وکاوش کی گئی اور نہ اس کے بعد کتب بینی کی طرف رغبت ہوئی، بس یہ جو کچھ ہے اپنے بزرگوں کی دعاء کی برکت اور خداوند جل جلالہٗ کا فضل ہے کہ گاڑی کہیں اٹکتی نہیں [1]۔

مکالمہ نمبر ۷

(ایک غیر مقلد مولوی صاحب کا میرے پاس خط آیا کہ میں تمہارے پاس امتحان لینے کے لئے آنا چاہتا ہوں، چنانچہ وقت مقررہ پر وہ تشریف لائے اور مجلس میں بھی بیٹھے، اس مجلس میں) ایک شخص میرے پاس آیا اس پر خواہش نفسانی کا غلبہ تھا، مگر غریب نادار تھا اتنی قدرت نہ تھی کہ وہ نکاح کرسکے، اس نے آکر مجھ سے اپنی حالت بیان کی اور علاج کا طالب ہوا ابھی میں اس کو جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ میرے بولنے سے قبل اس کی گفتگو سنتے ہی آپ (غیر مقلد صاحب) بولے کہ روزے رکھا کرو کیونکہ حدیث میں آیا ہے **ومن لم یستطع فعلیه بالصوم** یعنی جو شخص نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اس کو روزے رکھنا چاہے اس شخص نے جواب دیا کہ میں نے روزے بھی رکھے تھے مگر اس سے بھی میری خواہش کم نہیں ہوئی اس کا یہ جواب سن کر ان (غیر مقلد) صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

---

[1] ملفوظات حکیم الامت ص ۵۲۹ ج ۳ قسط ۵ ملفوظ نمبر ۲،۸۷ ۲۴ جمادی الاولی ۱۳۵۱ھ

میں نے ان صاحب کو سنا کر اس شخص سے دریافت کیا کہ تم نے کتنے روزے رکھے تھے، اس نے کہا دو روزے رکھے تھے میں نے کہاں یہی وجہ ہے کہ تم کو کامیابی نہیں ہوئی، کیونکہ تم کو کثرت سے روزے رکھنے چاہئے تھے، اور یہ شرط خود اس حدیث پاک سے ثابت ہے اور وہ اس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، فعلیہ بالصوم لفظ علیٰ لزوم کے لئے آتا ہے اور لزوم کی دو قسمیں ہیں ایک لزوم اعتقادی دوسرے عملی مگر دلائل سے یہاں لزوم اعتقادی تو مراد ہو نہیں سکتا۔

کیونکہ یہ صوم (روزہ رکھنا) فرض نہیں محض علاج ہے بس لزوم عملی مراد ہوگا اور لزوم عملی ہوتا ہے تکرار و کثرت سے، چنانچہ جب کوئی شخص کسی کام کو بار بار اور کثرت سے کرتا ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ کام اس نے اپنے اوپر عملی طور پر لازم کر لیا ہے پس مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ کثرت سے روزے رکھو۔

اور مشاہدہ ہے کہ قوت بہیمیہ (شہوانی قوت) کے انکسار (توڑنے) کے لئے جو کہ علاج کا حاصل ہے، تھوڑے روزے کافی نہیں بلکہ کثرت صوم پر یہ اثر مرتب ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شروع رمضان میں ضعف نہیں ہوتا اور آخر رمضان میں ضعف ہو جاتا ہے۔

اور یہ تجربہ ہے کہ شروع رمضان میں تو قوت بہیمیہ شکستہ نہیں ہوتی بلکہ رطوبات فضلیہ کے سوخت ہو جانے کی وجہ سے اس قوت میں اور انتعاش (جوش) ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ ضعف بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ آخر میں پورا ضعف ہو جاتا ہے جس سے قوت بہیمیہ شکست ہو جاتی ہے کیونکہ اس وقت روزہ کی کثرت متحقق ہو جاتی ہے

وہ سائل تو چلا گیا مگر مجتہد صاحب پھر کچھ نہیں بولے میرے پاس ان کا خط آیا تھا کہ میں تمہارا امتحان لینے آتا ہوں ان ہی غریب کا امتحان ہو گیا۔[1]

---

[1] الافاضات الیومیہ ص ۱۶۵ ج ۹

مکالمہ نمبر ۸

شملہ کے جلسہ میں حضرت تھانویؒ کے لباس پر ایک صاحب کا اشکال اور حضرت تھانویؒ کا جواب

ایک واقعہ یاد آیا کہ ہم بعض معززین کی درخواست پر شملہ گئے تو وہاں وعظ کا اعلان ہوا، کرنل عبدالحمید صاحب نے اپنے نام سے اعلان کیا، جس وقت میں وعظ کے لئے کھڑا ہوا تو میرے کپڑے دیکھ کر بعض جنٹلمینوں نے کرنل صاحب سے کہا کہ تمہارے علماء کے کپڑے تو ایسے ہیں جیسے ابھی پاخانہ سے نکل کر آرہے ہوں، حالانکہ میں اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور جمعہ کا دن تھا اس لئے صاف بلکہ استری کے تھے، مگر ہاں کرتہ لمبا تھا اور پاجامہ اونچا تھا یہ نہ تھا کہ کرتہ اونچا ہو اور پائجامہ ٹخنوں سے نیچا ہو، ان نوتعلیم یافتہ صاحب کو یہ لباس حقیر معلوم ہوا، کرنل صاحب نے ان سے کہا کہ ابھی اس بات کا جواب نہیں دینا چاہتا، وعظ ختم ہونے کے بعد پوچھنا اس وقت جواب دوں گا، چنانچہ وعظ ختم ہونے کے بعد کرنل صاحب منتظر رہے کہ اس اعتراض کا اعادہ کریں مگر وہ کچھ نہیں بولے تب کرنل صاحب نے خود یاد دلایا کہ اب آپ کہئے، کیا کہتے ہیں؟ کہنے لگے کچھ نہیں اور جو کہا تھا حماقت تھی، میں سمجھتا تھا کہ لیاقت بھی کپڑوں کے موافق ہوتی ہے، مگر اس وقت اپنی غلطی ظاہر ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ کپڑے معیار لیاقت نہیں۔

اتفاق سے یہ بات میرے کانوں تک بھی پہونچ گئی، میں نے دوسرے جلسہ میں ممبر پر جاتے ہی کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض حضرات ہمارے لباس پر خاص رائے رکھتے ہیں اور میں حسن ظن سے اس کا منشاء نیک نیتی سمجھتا ہوں کہ غالباً محبت ہے وہ چاہتے ہوں گے کہ علماء عمدہ اور قیمتی لباس پہن کر وعظ کہا کریں تا کہ سامعین کے قلوب

میں ان کی عظمت ہواوران کی عظمت سے مضمون کی عظمت ہو، مجھے اس منشاء پر اعتراض نہیں اور میں اس کے حسن وقبح (اچھائی برائی) سے اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتا، میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ علماء کو عمدہ لباس پہن کر ہی وعظ کہنا چاہئے، مگر سوال یہ ہے کہ عمدہ لباس آئے کہاں سے؟ ہمارے پاس اتنا روپیہ نہیں جو آپ کی تجویز اور منشاء کے موافق لباس بنائیں تو اس صورت میں اتنا روپیہ کہاں سے آئے زیادہ روپیہ حاصل کرنے کے جو ذرائع ہیں وہ دو قسم کے ہیں، بعض تو شرعاً قبیح ہیں جن کو ہم جائز نہیں سمجھتے جیسے ڈپٹی کلکٹری، اور بعض عقلاً بھی قبیح ہیں جن کو نہ ہم جائز سمجھتے ہیں اور نہ آپ جیسے وعظ کہہ کر اپنی حاجت پیش کرنا، جب یہ دونوں ذرائع ناجائز ہیں صرف ایک ذریعہ ہی رہ گیا کہ ہم میں کوئی مدرس ہے کوئی مصنف کوئی محشی کوئی کسی مطبع کا مصحح تو اس صورت میں ہماری مالی حیثیت اسی لباس سے ہوگی جس کو پہنے ہوئے ہیں، اور اس سے زیادہ حیثیت بھی ہوتی تب بھی ہم کو کیسے معلوم ہوتا کہ آپ کی منشاء کے موافق کس قیمت کا لباس ہونا چاہئے، ممکن ہے کہ ہم اس موجودہ لباس سے بڑھیا (عمدہ) لباس پہن کر آئیں اور آپ کی نظر میں وہ بھی حقیر ہو اس لئے اس کی آسان صورت یہ ہے کہ معترض صاحب اپنی منشاء کے موافق نہایت قیمتی جوڑے ہمارے لئے بنادیں تاکہ جب تک ہم شملہ میں رہیں اسی لباس کو پہن کر وعظ کہا کریں اور اس کا ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جب شملہ سے جانے لگیں گے وہ لباس آپ کے حوالے کر جائیں گے اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے، تاکہ ہمارے بعد کوئی اور مولوی وعظ کہنے آئے تو آپ اس کو بھی وہ لباس دے سکیں کہ مولانا یہ کپڑے پہن کر وعظ فرمائیے، اس میں آپ کا مقصود بھی حاصل ہو جائے گا کہ سامعین وعظ کی نظروں میں قیمتی لباس کی وجہ سے علماء کی عظمت ہوگی اور ہم بھی خرچ کے بارے میں سبکدوش رہیں گے، اور آپ کا بنایا ہوا لباس پھر آپ کے پاس واپس آجائے گا، آپ کو ہر مولوی کے واسطے بار بار جوڑا تیار نہ کرنا پڑے گا، ایک دفعہ کا بنایا ہوا برسوں کام دے گا، اور غالباً معترض صاحب میں اتنی وسعت تو ضرور ہوگی کہ ایک دفعہ ہمارے لئے قیمتی

جوڑے تیار کردیں کیونکہ ہمارا لباس اس شخص کی نظروں میں حقیر ہوسکتا ہے جو مالدار صاحب وسعت ہو کیونکہ دوسرے مقامات پر ہمارے لباس کو کسی نے حقیر نہیں بتلایا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بہت ہی مالدار لوگ رہتے ہیں جن کی نظروں میں ہمارا اچکن کالباس بھی حقیر ہے تو مہربانی فرما کروہ لباس ہمارے لئے تیار کرادیں، ہم اس کو پہن کر وعظ کہہ دیا کریں گے اس سے ہمیں انکار نہ ہوگا، اور یہاں سے روانگی کے بعد اگر کسی دوسری جگہ بھی ہمارے لباس کو حقیر سمجھا گیا تو ہم وہاں کے لوگوں سے بھی یہی کہہ دیں گے جو آپ سے کہا ہے، اگر ان کو قیمتی لباس میں وعظ سننا ہوگا تو وہ بھی اس کا انتظام خودکریں گے آپ کے بنائے ہوئے جوڑے ہم یہیں چھوڑ جائیں گے، یہ صورت اس لئے بھی سہل ہے کہ وعظ کہنے والا تو ایک آدمی ہے جو سینکڑوں مقامات پر جاتا ہے تو ایک آدمی کو ہر جگہ کے مزاج کی رعایت کرنا دشوار ہے اور ہر ہر شہر کے آدمیوں کو ایک جوڑا اپنے مزاج کے موافق تیار کرلینا آسان ہے، اب میں منتظر ہوں کہ ہمارے واسطے جوڑے تیار ہوکر کب آتے ہیں، اگر غیرت ہوگی تو بہت جلد اس کا انتظام کیا جائے گا، اس تقریر سے معترضین کی گردنیں جھک گئیں اور نگاہیں نیچی ہوگئیں۔

آج کل لوگوں کا ایسا مزاج بگڑا ہے کہ ان کی نظروں میں صرف قیمتی لباس والے کی عظمت ہوتی ہے۔ [1]

[1] برکات رمضان وعظ تقلیل الاختلاط ص ۲۲۰

مکالمہ نمبر ۹

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر کے متعلق

مولانا شہیدؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کا فیصلہ

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ایک صاحب کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نامزد تصویر ہے اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے؟

فرمایا کہ حضرت مولانا شہید اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں بھی ایسی بات پیش آئی تھی، ایک شخص نے آ کر حضرت شہیدؒ سے سوال کیا کہ میرے پاس ایک تصویر ہے جو حضور کے ساتھ نامزد ہے میں اس کے ساتھ کیا معاملہ اور کیا برتاؤ کروں؟ فرمایا کہ معاملہ کیا ہوتا حضور کے نامزد ہونے سے حکم شرعی نہیں بدلتا، پھر یہ شخص حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے پاس پہنچا اور یہی عرض کیا حضرت شاہ صاحب نے دریافت فرمایا کہ جاندار ہے یا بے جان؟ عرض کیا کہ بے جان! فرمایا کہ جب صاحب تصویر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بے جان ہوگئے تھے تو کیا معاملہ کیا گیا تھا؟ عرض کیا کہ غسل وکفن دے کر دفن کر دیا گیا تھا، فرمایا: تم بھی ایسا کرو کیوڑے اور گلاب سے غسل دو اور بہت قیمتی کپڑے میں لپیٹ کر کسی ایسی جگہ دفن کردو جہاں کسی کا پاؤں نہ پڑے، بات ایک ہی ہے کہ وہ تصویر محو کر دی گئی یعنی ختم کر دی گئی مگر عنوان کا فرق ہے، دوسرے طریقہ کا اختیار کرنا سہل ہوگیا پھر تدریجاً پہلا طریقہ گوارہ ہوگیا۔

حضرت تھانویؒ کا فیصلہ

پھر سائل نے عرض کیا کہ (فلاں صاحب) یہ کہتے تھے کہ اس کو لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور سپرد کر کے چلا آؤں گا، حضرت جو چاہیں اس کے ساتھ

معاملہ کریں فرمایا: میں اس میں کیا کروں گا، جو شریعت کا حکم ہے وہی کروں گا۔

یہاں ایک طرف تو ہے **ھذا تمثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** اور ایک طرف ہے **ھذا حکم رسو ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** دیکھ لو کون مقدم ہے اور ایک اس سے بھی اچھا فیصلہ ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اگر یہ پیش کی جاتی تو حضور کیا معاملہ فرماتے، ظاہر ہے کہ اتنا بھی نہ فرماتے جتنا شاہ عبدالعزیز صاحب نے فرمایا، بلکہ مولانا شہیدؒ ہی جیسا فتویٰ (دیتے) اور عمل فرماتے، پھر فرمایا کہ حضرت مولانا شہیدؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تجویزوں میں فرق یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا نفع عام ہے اور حضرت شہید کا نفع تام ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ نفع عام سے نفع تام افضل ہے گو نفع عام سہل (زیادہ آسان) ہے، دونوں حضرات کے مسلک کا یہ خلاصہ ہے جو میں سمجھتا ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ بزرگ بھی باوجود مقصد میں متحد ہونے کے مختلف الاحوال اور مختلف الطبائع ہوتے ہیں اس لیے نفس احکام میں تو نہیں مگر رائے اور طریقہ کار میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ [1]

حضور ﷺ اور صحابہ کرام کی تصاویر سے متعلق مزید تحقیق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ کی تصاویر میں نے ایک دفعہ کھتولی میں دیکھی تھی اور وہ حیدر آباد سے آئی ہوئی تھیں، احترام کی بابت پوچھا گیا تو فرمایا قابل احترام نہیں، اولاً تو واقع کے مطابق ہونا مشکل ہے اور اگر ہو بھی تو مفسدہ زیادہ ہے۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ میں سے حضرت ابراہیم وحضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے ساتھ دوسری تصویروں کی طرح معاملہ فرمایا تھا ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ طبیعت احترام کو چاہتی ہے مگر حکم کے سامنے طبیعت کو دخل نہ دینا چاہئے، طبعی تقاضا پر حکم کا غلبہ ہونا چاہئے حکم کے ماننے ہی میں احترام ہے۔ [2]

[1] الافاضات الیومیہ ۳۱۰/۷ و ۳۱۱۔ [2] الافاضات الیومیہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر کو دیکھنا

ایک شخص نے پوچھا کہ اس تصویر کو دیکھے یا نہیں؟ فرمایا: نہ دیکھے، یہ تو صورت اصلیہ کا عکس ہے خود اصل صورت کی نسبت بھی مثلاً اگر حضور اپنے زمانہ میں یوں فرمادیتے کہ ہماری صورت مت دیکھنا تو بتایئے حکم مقدم ہوتا یا صورت دیکھنا، ایک صحابی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سامنے آنے سے منع فرمادیا تھا، چنانچہ وہ نہیں آتے تھے اگر یوں کہا جائے کہ تصویر دیکھنے سے رسول اللہؐ کا نقشہ قلب میں پیدا ہوگا......
اس کا جواب یہ ہے کہ حضور کے احکام ماننے سے قلب میں ایسا نقشہ پیدا ہوگا جیسا مطلوب ہے عاشق کا، مذہب محض صورت نہیں بلکہ حکم پرستی ہے اگر محبوب یوں کہے کہ ہماری رضا اس میں ہے کہ صورت مت دیکھوتو عاشق کا یہی حال ہونا چاہئے کہ حکم کی تعمیل کرے، ہاں اگر صورت دیکھنا اور تعمیل حکم دونوں جمع ہوجائیں تو نورٌ علیٰ نور ہے۔

(دیکھئے! اجنبی عورت کو دیکھنا فرحت کا باعث، قدرت خداوندی کے مشاہدہ کا سبب ہے مگر حکم ہے نہ دیکھنے کا اس لیے حکم ماننا لازم ہے)[1]

تعزیہ توڑنے میں توہین ہے یا نہیں؟ جس میں کہ حضرت حسین کا نام لکھا ہو

فرمایا: کسی نے کہا کہ تعزیہ توڑنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس میں حضرت امام حسین کا نام لگا ہے ایک صاحب نے خوب جواب دیا کہ گوسالہ سامری میں اللہ میاں کا نام لگا تھا چنانچہ ارشاد ہے فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى تو موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو کیوں توڑا؟[2]

---

[1] الافاضات الیومیہ [2] کلمۃ الحق ص۱۲۲۔

مکالمہ نمبر ۱۰

اصلاح الرسوم اور بہشتی زیور کی بابت اشکالات اور جوابات

ایک صاحب کا خط آیا ہے (جس میں انہوں نے) بہشتی زیور کے ان مسائل پر اعتراض کیا ہے جو عورتوں کے متعلق ہیں، اور مشورہ دیا ہے کہ ان مسائل کو کتاب سے نکال دیا جائے اس لئے کہ یہ شرمناک مسائل ہیں، یہ مشورہ دے کر اپنے دل میں کہتا ہوگا کہ ملّانوں کو بھی تہذیب کی وہ بات نہ سوجھی جو ہم کو سوجھی، طرز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی انگریزی تعلیم یافتہ ہے ان ہی جیسے محاورات خط میں استعمال کئے ہیں، یہ اس قسم کا خناس ان بد دماغوں کے اندر بھرا ہے، جب کوئی کام نہیں تو بیٹھے ہوئے یہی مشغلہ سہی، میں بھی انشاء اللہ ایسا ہی جواب دوں گا جس سے ان کی طبیعت خوش ہو جائے گی، یہ نامعقول لڑکیوں کو ڈاکٹری کی تعلیم دلواتے ہیں ان کو تجربہ کرایا جاتا ہے اس پر کبھی اعتراض نہ سوجھا، وجہ اس کی یہ ہے کہ سمجھتے ہیں کہ دنیا تو ضروری چیز ہے اور دین غیر ضروری اور ضروری کے لئے سب گورا کیا جاتا ہے، ان سے کوئی پوچھے کیا صحابہ کے زمانے میں یہ مسائل نہ تھے اور کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتیں ایسے مسائل نہ پوچھتی تھیں، نیز یہ مسائل تو فقہی ہیں جو فقہ کی کتابوں میں منقول ہیں ان سے بھی ان مسائل کو نکال دینا چاہئے، ممکن ہے کہ اس پر یہ شبہ ہو کہ وہ کتابیں تو عربی میں ہیں ان کو کون عورت پڑھتی ہے میں کہتا ہوں کہ اول تو عرب کی عورتوں کیلئے عربی ایسی ہی ہے جیسا یہاں کی عورتوں کے لئے اردو، دوسرے اگر عورتیں عربی پڑھنا شروع کر دیں اس وقت کیا کہو گے؟ پھر کیا تمہاری طرح ساری دنیا جاہل ہی ہے، اب بھی ایسی عورتیں بہت ہوں گی جو عربی پڑھ سکتی ہوں گی تو اسکو کیا کرو گے، اور یہ شبہ تو تم کو ابھی ہوا ہے پہلے زمانہ میں تو کثرت سے عورتیں عربی کی تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور ان کے لئے عربی

ایسی ہی تھی جیسی ہمارے لئے اردو اس وقت کسی کو یہ اعتراض نہ سوجھا تم ہی بڑے روشن دماغ ہو اور سب کے دماغوں میں اندھیرا ہی ہے، اور دینی کتابوں کا تو ان کو انتظام سوجھ رہا ہے مگر یہ جو انگریزی کی (مخلوط) تعلیم ہو رہی ہے اور عورتوں کے متعلق بے پردگی کی کوشش کی جارہی ہے، پروفیسری اور ڈاکٹری کی تعلیم عورتوں کو دی جارہی ہے اس کا انہوں نے کیا انتظام سوچا ہے، بددینوں کو دین ہی میں ساری احتیاطیں سوجھتی ہیں، اصل بات وہی ہے جو میں کہہ چکا ہوں کہ دین کو غیر ضروری اور دنیا کو ضروری سمجھتے ہیں، اگر دنیا کی طرح دین کو بھی ضروری سمجھتے تو کبھی اعتراض ہی دل میں پیدا نہ ہوتا، اب ان واقعات کو پیش نظر رکھ کر کیا کوئی مشورہ دے سکتا ہے کہ ان بیہودوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے، اگر ان کو محض خیر خواہی مقصود ہوتی اور تہذیب سے بزعم خود اس کے نامناسب ہونے پر مطلع کیا جاتا تو اس کا عنوان اور تھا اور اس کا جواب بھی ویسا ہی ہوتا یہ تو محض شرارت ہے سو اس کا جواب بھی ایسا ہی ہوگا۔

اب میں ان کے خط کا جواب لکھتا ہوں یہ فرما کر جواب تحریر کر کے اہل مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں نے جواب لکھ دیا ہے کہ لڑکیوں کو ناول پڑھائے جاتے ہیں کبھی اس پر بھی شبہ ہوا؟ فن موسیقی سکھایا جاتا ہے اس پر شبہ نہ ہوا؟ پردہ اٹھایا جاتا ہے اس پر شبہ نہ ہوا؟ تھیٹروں میں لڑکیوں کو لے جاتے ہیں وہاں ہر قسم کی تصویریں عاشق معشوق کی دکھائی جاتی ہیں وہاں شبہ نہ ہوا؟ اور اگر ہوا تو اس کے ازالہ کی کیا تدابیر سوچیں اور کس اخبار یا اشتہار کے ذریعہ اس سے اظہار نفرت کیا؟ یا کسی کو بذریعہ خط ان مذموم حرکات کی اطلاع دی؟ پہلے اس سے مطلع کرو تب میں بہشتی زیور کے اعتراض کا جواب دوں گا اس پر فرمایا کہ ایسے خر دماغوں کو ایسا ہی جواب دینا چاہئے تاکہ معلوم ہو کہ خالی ہم ہی خرِ دماغ نہیں مولویوں میں بھی اسپ دماغ ہیں، اور جب مخاطب کوڑ مغز اور بدفہم ہو تو وہاں حکیمانہ جواب کارآمد نہیں ہوتا، حاکمانہ جواب نافع ہوتا ہے یہی طرز قرآن

پاک کا ہے شیطان کے سجدہ نہ کرنے پر حق تعالیٰ کو اس کے مقدمات کا حکیمانہ جواب کیا مشکل تھا جس کا حاصل یہ ہوتا کہ مخلوق من النار کا مخلوق من الطین سے افضل ہونا غیر مسلم ہے، مگر چونکہ مخاطب کوڑ مغزا اور بدفہم تھا، حاکمانہ شان سے کام لیا، اور پھر نفس جواب بھی اس وقت ضروری ہے جب تبلیغ نہ ہوئی ہو یعنی یہ معلوم ہو جائے کہ اس کو معلوم نہیں ہے اس وقت واجب ہے کہ وہاں تبلیغ کر دی جائے اور اگر معلوم ہو کہ تبلیغ ہو چکی تو پھر مطلق جواب ہی واجب نہیں۔[1]

ایک مولوی صاحب صرف اصلاح الرسوم کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے تشریف لائے بڑے جوش میں تھے کہنے لگے کہ مجھ کو اصلاح الرسوم کے بعض مقامات پر شبہات ہیں گفتگو کرنا چاہتا ہوں میں نے کہا بڑی خوشی ہے لیکن میری بے ادبی بدتہذیبی معاف کیجئے گا، آپ کو تین باتوں میں قسم کھانا ہوگی ایک تو یہ کہ واقعی میرے دل میں شبہ ہے محض تصنیف نہیں کیا گیا، دوسرے یہ کہ اس شبہ کا جواب میرے ذہن میں نہیں، تیسرے یہ کہ صرف تحقیق مقصود ہے اپنے کسی بڑے کی نصرت مقصود نہیں، ان تینوں باتوں پر قسم کھا لیجئے پھر جو شبہ ہو فرمائیے، اس سے ان کے سب شبہات ختم ہو گئے، وہ سمجھے کہ یہ قسم بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

اپنی ہی جماعت کے ایک بزرگ نے بذریعہ خط مشورہ دیا کہ آپ اصلاح الرسوم پر نظر ثانی فرمالیں میں نے جواب میں لکھا کہ میں نظر ثانی، نظر ثالث، نظر رابع۔ سب کر چکا، ہر نظر کا وہی نتیجہ نکلا جو نظر اول کا تھا، اب آپ اصلاح فرمادیں، میں اس کو شائع کر دوں گا، اگر اس سے لوگوں کو ان رسوم میں ابتلاء ہو گیا تو آپ ذمہ دار ہوں گے پھر ان بزرگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔[2]

مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے کسی نے عرض کیا کہ آپ نے تو اس تقریب میں شرکت فرمائی اور فلاں شخص نے یعنی میں نے شرکت نہیں کی یہ کیا بات ہے؟

---

[1] ملفوظات حکیم الامت ص ۱۵۸ ج ۵ ملفوظ نمبر ۱۸۳ مطبوعہ ملتان [2] الافاضات ۳۶۸/۲

حضرت نے جواب میں فرمایا کہ بھائی ہم نے فتوی پر عمل کیا، اس نے تقویٰ پر عمل کیا، یہ تو تواضع کا جواب ہے مگر اسی طرح کا سوال مولانا محمودالحسن سے کسی نے کیا تھا حضرت نے محققانہ جواب دیا کہ عوام الناس کے مفاسد کی جیسی اس کو خبر ہے ہم کو نہیں، حضرت نے حقیقت کو ظاہر فرما دیا۔[1]

بہشتی زیور کے ایک مسئلہ پر ایک صاحب کا اشکال اور حضرت تھانویؒ کا جواب

میں دیوبند سے سہارنپور جانے کا ارادہ کر رہا تھا دیوبند ہی میں مجھ کو ایک خط ملا جس میں بہشتی زیور کے اس مسئلہ پر اعتراض تھا کہ:

''مرد مشرق میں اور عورت مغرب میں اور ان کا نکاح ہو جائے اس کے بعد بچہ پیدا ہو جائے تو نسب ثابت ہوگا''۔

جب میں سہارنپور پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک شخص بازاروں میں یہ اعتراض بیان کرتا پھرتا ہے اور مجھ سے ایک دن پہلے مولانا خلیل احمد صاحب کے پاس بھی آیا تھا اور مولانا کے دو گھنٹے خراب کئے پھر بھی نہیں مانا۔

جب میں سہارنپور پہنچا تو میرے پاس بغل میں بہشتی زیور دبائے ہوئے آئے، میں نے کہا فرمایئے اس نے بہشتی زیور کھول کر سامنے رکھ دیا اور کہا اس کو ملاحظہ فرمایئے، میں نے کہا کہ اس کو میں نے چھپنے سے پہلے ملاحظہ کر لیا تھا بعد میں ملاحظہ کی حاجت نہیں، کہا کہ اس مسئلہ کی بابت کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں میں نے کہا یہ بتلاؤ کہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا یا اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہا کہ مسئلہ تو معلوم ہو گیا وجہ سمجھ میں نہیں آئی، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ مسائل اور بھی معلوم ہیں، کہا ہاں! میں نے کہا آپ کو سب کی وجہ معلوم ہے؟ کہا نہیں، میں نے کہا بس اس کو بھی ایسے ہی مسائل کی

[1] حسن العزیز ۲۶۳/۴

فہرست میں داخل سمجھ لیجئے، اگر وہ کہتا کہ سب کی وجہ معلوم ہے تو میں کہتا کہ میں سننا چاہتا ہوں پھر ایک ایک کو پوچھتا بس وہ شخص بالکل خاموش ہو گیا کہ اب میں کیا کروں، مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے خوش ہو کر فرمایا کہ تم نے دو گھنٹہ کا جھگڑا اس قدر جلد ختم کر دیا[1]

ایک عامی شخص کا جزئی مسئلہ میں دلیل کا مطالبہ اور حضرت تھانویؒ کا جواب

ایک نابینا شخص نے مجھ سے ایک فرعی مسئلہ کی دلیل پوچھی میں نے کہا آپ بڑے محقق معلوم ہوتے ہیں آپ کو ہر بات کی تحقیق کا شوق ہے اس فرعی مسئلہ کی تحقیق سے مقدم اصول دین کی تحقیق ہے وہ آپ غالباً کر چکے ہوں گے تب ہی تو فرع کی تحقیق کی نوبت آئی ہے۔

اگر یہ بات ہے تو میں اصل الاصول یعنی توحید کے مسائل کی دلیل پوچھتا ہوں اور اس پر ملاحدہ کے شبہات کروں گا ذرا میرے سامنے بیان تو کیجئے آپ نے اس کے متعلق کیا تحقیق کر لی ہے اور نقلی جواب نہ دینا، کیونکہ توحید کے ثبوت کے لیے عقلی دلیل چاہئے کیونکہ مخاطبین غیر مسلمین ہیں کہنے لگے یہ تو میں نہیں کر سکتا میں نے کہا ڈوب مرو، اصل الاصول میں تو تقلید کرتے ہیں اور فرع میں تحقیق کا شوق ہوا ہے[1]

عنوان اور طرز تعبیر کا فرق

فرمایا کہ عنوان کا بھی بڑا اثر ہوتا ہے، بات ایک ہی ہوتی ہے مگر تعبیر کا طریقہ جدا جدا ہوتا ہے، مثلاً مولانا شہیدؒ بی بی فاطمہ کے نام پر کونڈوں کو منع فرمایا کرتے تھے۔

شاہی خاندان کی ایک بڑی بی نے حضرت شہیدؒ کو بلایا اور کہا کہ بیٹا ہم نے سنا ہے تم بی بی فاطمہ کے نام کے کونڈوں کو منع کرتے ہو؟ حضرت نے فرمایا کہ میری کیا مجال ہے

---

[1] کلمۃ الحق ص ۹۸۔

کہ بی بی فاطمہ کے نام کے کونڈوں کو منع کروں، میں نے منع نہیں کیا کسی نے آپ سے غلط کہہ دیا بلکہ بی بی فاطمہ کے ابا جان (یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) منع کرتے ہیں [1]

أبهموا ما ابهمه الله

''یعنی اللہ نے جن امور کو مبہم رکھا ہے ان کو مبہم رکھو''۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ قرآن مجید کے ایصالِ ثواب میں سب کو برابر ثواب ملے گا یا سب پر تقسیم ہوگا؟ فرمایا: عقائد مبہمہ میں جازم (یقینی) جواب دینا ضروری نہیں اس میں صحابہ کرام کا طرز نہایت اچھا تھا کہ مبہم کا عقیدہ مبہم رکھتے تھے، شریعت نے اس میں تفصیل بیان کرنے کو ضروری نہ سمجھا۔

اسی طرح نماز اور وضو دونوں نص کی تصریح کے مطابق مکفّر سیئات ہیں ہم کو اس سے بحث نہیں کہ کس قدر کس سے کفارہ ہے یہ نصوص میں بھی مبہم ہے تم بھی مبہم رکھو، محض ظن کی بناء پر خاص تعیین کے درپے نہ ہو یہ تو وہ پوچھے جس کو نعوذ باللہ! اللہ سے مطالبہ کرنے کا ارادہ ہو۔ عقائد میں ظن کا دخل نہیں البتہ فقہیات میں ہے کیونکہ فقہ میں عمل کی ضرورت ہے اور عقائد میں کون سی گاڑی اٹکی ہے اس کو طالب علم یاد رکھیں [2]

سوال: (۷۳۴) ایصالِ ثواب جو چند مردگان کو کیا جاتا ہے وہ سب کو برابر پہنچتا ہے یا تجزی سے پہنچتا ہے؟

الجواب: جس امر میں نص نہ ہو اگر وہ احکام فقہیہ جواز وعدم جواز میں سے ہو تو اس میں قیاس کرنا ''فَاعْتَبِرُوْا یَا اُوْلِی الْاَبْصَار'' غیرہ نصوص سے مامور بہ ہے، اور اگر وہ احکام فقہیہ سے نہ ہو تو اس میں قیاس کرنا'' لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ'' وغیرہ نصوص سے منہی عنہ ہے، اور امر مسئول عنہ احکام فقہیہ میں سے نہیں، اور نص موجود نہیں، لہٰذا قیاس سے کلام کرنا منہی عنہ ہوگا، اور جن علماء سے کلام منقول ہے مقصود ان کا حکم لگانا نہیں، بلکہ محض بعض احتمالات کی اقربیت بیان کرنا ہے۔ واللہ اعلم۔ [3]

---

[1] الافاضات الیومیہ ص۲۰۹ ج۲، حسن العزیز ۲۶۳/۴۔ [2] کلمۃ الحق ص۲۳۔ [3] امداد الفتاوی ۶۸۴/۱۷

آداب استفتاء

افادات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

انتخاب وترتیب

محمد زید مظاہری ندوی

استاد حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدلله رب العٰلمين

اللهم صل علىٰ سيدنا ومولانامحمد

وعلىٰ آلهٖ واصحابهٖ وبارک وسلم

باب ۸

آداب استفتاء

احکام سے ناواقف لوگوں کیلئے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اِنَّمَاشِفَاءُ الْعَیِّ السُّوَالُ۔[۱]

(ترجمہ) مرض جہل کی شفاء سوال ہے یعنی اگر کسی بات کی خبر نہ ہو تو اس سے شفاء پوچھ لینا ہے اور الفاظ گو عام ہیں لیکن مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص ہے یعنی جہل سے ہر جہل مراد نہیں ہے بلکہ احکام الٰہی سے جہل مراد ہے اس لئے کہ حضور ﷺ کو دنیا کے قصوں سے کیا بحث ہے، حضور جس غرض کے لئے بھیجے گئے ہیں اسی سے بحث ہوگی پس جہل کا مضاف الیہ وہی امر ہوگا کہ جس کا تعلق بواسطہ یا بلاواسطہ دین سے ہو، پس جہل سے دین کا جہل مراد ہوگا اور یہ مطلب نہ ہوگا کہ تجارت یا زراعت میں کسی امر کو تم نہ جانو تو اس سے شفاء سوال ہے۔ پس حاصل یہ ہوگا کہ اگر اللہ جل جلالہ کے احکام سے ناواقفیت ہو، تو اس کی شفاء پوچھنا ہے۔ پس بے خبری سے مراد اللہ ورسول کے احکام سے بے خبری ہے، دوسرے یہ کہ جس موقع پر یہ حدیث وارد ہے وہ بھی اسی پر دال ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے فتوی دینے میں غلطی ہوگئی تھی اس پر حضور نے یہ ارشاد فرمایا تھا، جیسا آیت کے لئے اس کا شان نزول ہوتا ہے اسی طرح حدیث کے لئے سبب ورود ہوتا ہے جیسے شانِ نزول کے جاننے سے آیت کی تفسیر ہوتی ہے اسی طرح سببِ ورودِ حدیث کے جاننے سے حدیث کی شرح ہوتی ہے، پس اس قصہ کو ملانے سے مراد صاف طور سے متعین ہوگئی کہ اگر احکام دینیہ سے بے خبری ہو تو اس سے شفاء پوچھ لینا ہے یہ حاصل ہے حدیث شریف کا۔[۲]

---

[۱] ابن ماجہ، کشف الخفاص ۱۹۲ ج ۱ [۲] وعظ السوال ملحقہ اصلاح اعمال ص ۳۲۵

احکام سے ناواقفیت ایک مرض ہے جس کا علاج مسئلہ معلوم کرنا ہے

غور کیجئے کہ شفاء کی اضافت عیّ بمعنی جہل کی طرف کی گئی ہے اور شفاء ہوا کرتی ہے مرض سے پس گویا جہل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض ٹھہرایا ہے اور پہلے عرض کیا گیا کہ جہل کے مضاف الیہ کے اندر عموم نہیں بلکہ احکام الٰہیہ سے جہل مراد ہے، پس ان دونوں امروں سے ثابت ہوا کہ جس طرح اور بیماریاں ہیں اسی طرح مسائل شرعیہ کا نہ جاننا بھی ایک بیماری ہے، اس سے آپ کو اس جہل کا بیماری ہونا تو معلوم ہوا۔

اب اس میں غور کرنا چاہئے کہ جب کوئی بیماری آپ کو یا آپ کی اولاد کو پیش آتی ہے تو اس کے ساتھ آپ کا کیا برتاؤ ہوتا ہے؟ برتاؤ یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے تو ایک فکر پیدا ہو جاتی ہے بلکہ اگر شبہ بھی بیماری کا ہو جاتا ہے تو اس سے بھی فکر ہو جاتا ہے، اور فکر بھی کیسا کہ آدمی کا دل دہل جاتا ہے کہ دیکھئے اس کا انجام کیا ہو، اول مرحلہ تو یہ ہے، اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ کس کو دکھلاؤ؟ کس سے دوا لکھواؤ اور اس دکھلانے میں یہ نہیں کرتے ہو کہ کیفما اتفق جس کو چاہا دکھلا دیا بلکہ تلاش اس کی ہوتی ہے کہ کسی ہوشیار طبیب کو جو فن سے واقف ہو دکھلانا چاہئے اس کی تلاش میں جس قدر بھی مشقتیں واقع ہوں سب برداشت کرتے ہو اور وہ جس قدر فیس مانگے اس کا بھی تحمل کرتے ہو۔

اس کے بعد جو کچھ وہ تجویز کرتا ہے اس کے سر مو خلاف نہیں کرتے ہو جس شئ کا پرہیز بتلاتا ہے اس میں بہت اہتمام کرتے ہو اور بار بار اس سے مریض کا

حال بیان کرتے ہو اگر اس نسخہ سے آرام نہ ہو تو وہ دوسرا نسخہ بدلتا ہے اس کو بھی اسی جدوجہد کے ساتھ تیار کرا کے استعمال کراتے ہو اور اگر اس معالجہ سے آرام نہ ہو تو اکتا کر علاج نہیں چھوڑتے بلکہ برابر کوشش کرتے رہتے ہو بلکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض بیماریوں سے شفا نہیں ہوتی پھر بھی برابر علاج کرتے ہو حتیٰ کہ موت آنے تک بھی مریض کے منھ میں دوا ٹپکاتے ہو، یہ برتاؤ ہوتا ہے ہمارا مریض کے ساتھ۔

اب غور تو کیجئے! واقعی بڑی غیرت اور ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ جس مرض کو ارسطو اور بقراط اور جالینوس مرض بتلا دیں اس کا تو تم کو اتنا فکر اور اس قدر اہتمام اور غضب کی بات ہے کہ جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرض بتا دیں اس کا اہتمام تو کیا کسی درجہ میں خیال تک نہ ہو بلکہ اس کو بیماری بھی نہیں جانتے۔[1]

اپنی فکر کرو اور اپنی ضرورت ہی کا مسئلہ پوچھو

اب اس حدیث کے اندر تھوڑا اور غور کرو تو سوال کے (بعض) آداب بھی اسی حدیث سے نکلتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ حکیم جی سے اول آدمی اپنے امراض کے متعلق پوچھتا ہے یہ نہیں کرتا کہ خود تو سیکڑوں بیماریوں میں مبتلا ہے اور اپنے پڑوسیوں کے امراض حکیم جی کے سامنے گا رہے ہیں اور وہ بھی بلا وجہ، کیونکہ ان کا معالجہ اس کو مقصود نہیں اگر ایسا کوئی کرے تو اس کو بیوقوف کہا جاوے گا، اسی طرح طبیب روحانی یعنی عالم (ومفتی) سے اگر ملنے کا اتفاق ہو تو اپنے متعلق جو مسائل ہیں جن کی تم کو ضرورت ہے ان کا سوال کرو ایسا نہ کرو کہ دوسروں کی عیب جوئی کے واسطے مسائل پوچھو، ورنہ اس کی تو ایسی مثال ہوگی کہ خود تو دِق (ٹی بی کے مرض) میں مبتلا ہے اور دوسرے کے پاؤں میں جو موچ آ گئی ہے اس کا نسخہ لکھوا رہے ہیں۔[1]

---

[1] وعظ السوال ملحقہ اصلاح اعمال ص ۳۲۶

فرضی مسائل مت پوچھو

اوراسی طرح مرض کے ساتھ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ جو مرض واقع ہواس کے متعلق سوال کرتے ہیں، یہ نہیں کرتے کہ مرض فرض کر کے اور گھڑ گھڑ کے حکیم جی سے بیان کریں، ایسے ہی علماء سے وہ مسائل دریافت کرنے چاہئیں کہ جن کا وقوع ہو، احتمالات کا اختراع مت کرو، جیسا ایک شخص نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا کہ ایک عورت اور اس کا بھائی اور خاوند چلے جارہے تھے بھائی اور خاوند کو دشمنوں نے آ کر مارڈالا اور سر کاٹ ڈالا، اس کے بعد کوئی اللہ کا بندہ آیا اس نے خاوند کے دھڑ میں بھائی کا سر اور بھائی کے دھڑ میں خاوند کا سر جوڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی وہ زندہ ہوگئے تو اب اس عورت کا خاوند کونسا ہے اور بھائی کونسا؟ بالکل مہمل بات ہے، بھلا کہیں ایسا واقع ہوا ہے؟

فتویٰ ایسے مفتی سے لواور مسئلہ ایسے شخص سے پوچھو جس پر پورا اطمینان ہو

ایک اور ادب معلوم ہوا، وہ یہ ہے کہ دوا (اور علاج) ایسے شخص سے پوچھا کرتے ہیں جس پر اطمینان ہو، ہر کسی سے علاج نہیں کرایا کرتے اور جس پر اطمینان ہو وہ خواہ تلخ (کڑوی) دوا بتادے یا میٹھی، بدل وجان قبول کر لیتے ہیں اسی طرح دینی مسائل بھی اس شخص سے پوچھو جس پر کامل اطمینان ہو اور پھر وہ خواہ نفس کے موافق حکم بتاوے یا خلاف، خوشی سے قبول کرلو[1]

---

[1] وعظ السوال ملحقہ اصلاح اعمال ص ۳۳۶

مسئلہ کی صورت پوری پوری بیان کردو

ایک ادب یہ معلوم ہوا کہ طبیب کے سامنے جو واقعہ ہے اور اصل مرض وہ (پورا پورا) بیان کردیا کرتے ہیں یہ نہیں کرتے کہ حالت تو کچھ ہے اور بیان کچھ، اسی طرح دینی مسائل بھی جس سے پوچھو تو جو واقعہ ہو بے کم وکاست (پورا کا پورا) بیان کردو، پیچ پاچ نہ کرنا چاہیے، کچا چٹھا بیان کردینا چاہیے، غور کرنے سے اور بھی نکات اور آداب معلوم ہوسکتے ہیں۔[1]

غیرضروری سوالات کی ممانعت قرآن پاک میں

قرآن شریف میں تو ان احکام کے پوچھنے سے بھی منع کیا گیا ہے جن کی ضرورت نہ ہو فرماتے ہیں لَا تَسْـئَلُوْا عَنْ اَشْیَاءَ اِنْ تُبْدَلَکُمْ تَسُؤْکُمْ یعنی وہ باتیں مت پوچھو کہ اگر وہ ظاہر کردی جاویں تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو چنانچہ اس آیت کا شان نزول بعض مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ جب حج کی فرضیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تو ایک شخص نے پوچھا کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے؟ آپ نے تین بار سکوت فرمایا پھر ارشاد فرمایا کہ اگر میں ہاں کردیتا تو ہر سال فرض ہوجاتا اور پھر کسی سے ادا نہ ہوسکتا تو جب احکام کے متعلق ایسی باتوں کے پوچھنے سے بھی منع کیا گیا ہے جو غیرضروری ہیں تو ان باتوں کا کیا پوچھنا جو مضر بھی ہیں، تجربہ کرکے دیکھئے کہ غیرضروری سوالات وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو کچھ کام کرنا نہیں چاہتے اور جن کے ذہن میں دین کی کچھ وقعت نہیں ہوتی، جن کے دلوں میں علماء کا اور دین کا کچھ ادب نہیں ورنہ دیکھئے کہ ایک کلکٹر سے ملنے جاتے ہیں تو وہاں گنی چنی ہی باتیں کرتے ہیں اور باہر نکل کر کہتے ہیں کہ میں نے قصداً زیادہ باتیں نہیں

[1] وعظ السوال ملحقہ اصلاح اعمال ص ۳۳۶

چھیڑیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بلا پیچھے لگ جائے، دیکھئے وہاں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ کسی قانونی مسئلہ کو چھیڑ دیں کہ اس کا حکم قانون میں ایسا کیوں ہے، وجہ یہ ہے کہ وہاں ہیبت اور ادب ہے اور یہاں کچھ بھی نہیں۔

حضرات صحابہ کا عمل

صحابہ ایسے باادب تھے کہ جو ضروری باتیں پوچھنا بھی چاہتے تھے تو کئی کئی دن تک نہ پوچھتے، یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے بعض دفعہ فرشتہ کو بصورت انسان بھیجا اور اس نے وہ سوالات کئے جو صحابہ کے دل میں تھے تا کہ لوگوں کو علم ہو یہ ان کے ادب کی برکت تھی کہ حق تعالیٰ نے خود ان سوالات کو حل فرما دیا چنانچہ حدیث جبریل ایک مشہور حدیث ہے جس کا خلاصہ یہی ہے کہ جبرئیل بصورت انسان آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوالات کئے اور اس سے غرض یہی تھی کہ لوگوں کو ان باتوں کا علم ہو جائے، ادب کی یہ برکت ہے کہ خود خدا تعالیٰ کی طرف سے ضرورت پوری کی گئی۔

بنی اسرائیل کی بے ادبی اور کثرتِ سوال کا انجام

اور بے ادبی کا یہ نتیجہ ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم ہوا تھا کہ ایک گائے کی قربانی کرو انہوں نے اس حکم میں حجتیں نکالنا شروع کیں کہ بتلایئے گائے کیسی ہو؟ بتلایا گیا کہ جوان گائے ہو، کہا یہ بھی بتلایئے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ حکم ہوا کہ رنگ زرد ہونا چاہئے، پھر کہا کہ ٹھیک ٹھیک اور مشرّح بتلایئے کہ کیسی گائے ہو اب تک ہماری سمجھ میں پوری حالت اس کی آئی نہیں، حکم ہوا کہ ایسی گائے ہو کہ جس سے نہ جوتنے کا کام لیا گیا ہو اور نہ سینچائی کا کام لیا گیا ہو اور بالکل یک رنگ ہو کہیں اس

میں داغ دھبہ نہ ہو، چنانچہ ایسی گائے ان کو تلاش کرنا پڑی اور بہ ہزار دقت رقم کثیر خرچ کر کے بہم پہنچی، حدیث میں آیا ہے کہ اگر بنی اسرائیل اتنی حجت نہ کرتے اور جیسے ہی حکم ہوا تھا فوراً کوئی سی گائے ذبح کرڈالتے تو کافی ہوجاتی، یہ تنگی کثرت سوال کی وجہ سے ہوئی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس امت کو حق تعالیٰ نے خود ہی اس فعل سے منع فرمادیا، چنانچہ ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لاَ تَسْئَلُوْاعَنْ اَشْيَاءَ اِنْ تُبْدَلَكُمْ تَسُؤْكُمْ(مائدہ پ ۷)

(اے ایمان والو! وہ باتیں مت پوچھو کہ اگر ظاہر کردی جاویں تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو) اور آگے یہ بھی فرمادیا قَدْسَأَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْابِهَا كَافِرِيْنَ (مائدہ پ۷) یعنی تم سے پہلی امت نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ احکام میں اس طرح حجتیں کرتے تھے گویا تحقیق کررہے ہیں لیکن جب حکم ہوتا اور اس کی پوری شرح کردی جاتی تو اس کی امتثال (اطاعت) سے انکار کردیتے ہیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ حجتیں کرنا اسی بات کی علامت ہے کہ اس شخص کو کام کرنا منظور نہیں کام کرنے والا ہمیشہ ڈرا کرتا ہے کہ خدا جانے مجھ سے تعمیل ہوسکے گی یا نہیں، اسی واسطے وہ اپنے اوپر تنگی کو اختیار کرتا ہے، بنی اسرائیل بڑے سرکش تھے انہوں نے حجتیں چھانٹیں اور تقریریں کرکے اپنے اوپر مصیبت لادی، اس امت پر خدا کا فضل رہا کہ حضرات صحابہ حکم کو سن کر اس میں شقوق اور احتمالات نہ نکالتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت وشفقت

یہ برکت حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے کہ اس امت نے سہولت پسندی کو اپنا شعار بنایا اور جب کبھی اس کے خلاف کوئی جھوٹا واقعہ بھی ہوا جب ہی حق تعالیٰ نے آیت اتاردی اور بالتصریح اس کی ممانعت فرمادی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی یہ شفقت کہ جب کبھی ایسا موقع ہوا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو سنبھالے رہے اور قولاً وفعلاً دونوں طرح اس سے باز رکھا جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا کہ جب حج کی فرضیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تو ایک شخص نے عرض کیا کہ حج ایک ہی دفعہ فرض ہے یا ہر سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اعراض کیا اور جواب نہیں دیا، اس نے پھر پوچھا پھر جواب نہیں دیا، پھر سہ بارہ پوچھا جواب نہیں دیا اور یہ فرمایا کہ اگر میں ہر سال کہہ دیتا تو ہر سال فرض ہو جاتا پھر تم سے ہو نہ سکتا، واقعی حق تعالیٰ کا شکر نہ ادا ہو سکتا کہ ہم کو ایسا رہبر دیا جو ہمارے اوپر ماں باپ سے بھی زیادہ بلکہ ہماری جانوں سے بھی زیادہ شفیق ہے، دیکھئے ہم خود اپنے اوپر تنگی کر رہے ہیں اور آپ ہم کو بچاتے ہیں بس اصل بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو اس امت پر فضل ہی کرنا تھا۔[1]

غیر ضروری سوالات کی ممانعت حدیث پاک میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان اللہ کرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السوال واضاعۃ المال(مسلم)

(ترجمہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے ناپسند فرمایا ہے قیل وقال کو اور کثرت سوال کو اور مال کے ضائع کرنے کو۔

(اس حدیث پاک میں) اگر سوال سے مراد مسائل پوچھنا ہو تو اس کی بھی کثرت سے حدیث میں منع کیا گیا ہے جس پر ظاہراً شبہ ہو سکتا ہے کہ مسائل پوچھنا تو موجب ترقی دین ہے اس کی ممانعت کیسی؟ تو میں عرض کرتا ہوں کہ:

اس منع سے تعجب نہ کیجئے کیونکہ کثرت سوال کا منشاء عمل نہ کرنا ہے (باریک

---

[1] وعظ ذم المکروھات ملحقہ اصلاح اعمال ۴۴۷

بات ہے) جس کو کام کرنا ہوتا ہے وہ تو ذرا سا حکم پا کر اس کی تعمیل میں لگ جاتا ہے بلکہ وہ ڈرا کرتا ہے کہ اگر کچھ پوچھوں گا تو کوئی دشواری کام میں نہ پیدا ہو جائے اور پھر مجھ سے ہو نہ سکے اور جس کو کام کرنا نہیں ہوتا وہ یہی تقریریں چھانٹا کرتا ہے، غرض مسائل میں خواہ مخواہ خوض کرنا اچھا نہیں یہ عمل سے لاپروائی کی دلیل ہے۔

علماء سے ایک شکایت

دقیق غیر ضروری سوالوں کا جواب دینے کا نقصان

اور اس میں تقصیر (کوتاہی) صرف سائلین ہی کی نہیں بلکہ گروہ علماء (اور مفتیوں) کی بھی ہے جو ان سوالوں کا جواب دیتے ہیں، وہ کوتاہی یہ ہے کہ یہ حضرات ہر سوال کے جواب کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، پوچھنے والوں کو تو دل لگی ہوتی ہے اور ان کا وقت ضائع ہوتا ہے، یہ تو وقتی مفاسد ہیں اور جو خراب نتائج بعد میں پیدا ہوتے ہیں ان کا سلسلہ دور تک پہنچتا ہے اول تو سننے والے اکثر صحیح نہیں سمجھتے نیز روایت کرنے میں احتیاط بالکل نہیں اس میں عوام اور جہلاء کی تو کیا شکایت کی جائے پڑھے لکھے بھی احتیاط نہیں کرتے کہا جائے کچھ اور دوسری جگہ بات ہو جائے کچھ سے کچھ، کچھ تو سمجھنے میں غلطی کی اور کچھ روایت میں بے احتیاطی کی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے مفتی تک وہ مضمون کچھ کا کچھ ہو کر پہنچ گیا پھر وہ دوسرے سننے والے جن کو یہ مضمون پہنچایا گیا وہ بھی محتاط نہیں، انہوں نے سوء ظن سے مفتی اول پر کوئی فتوی لگا دیا اور دل میں عداوت بٹھالی پھر وہ فتوی لوٹ کر وہاں بھی نقل کیا گیا جہاں سے بات چلی تھی اور درمیان میں وہ بھی کچھ سے کچھ ہو گیا، اب چونکہ ان کے فتوے کی مخالفت کی گئی تھی اس واسطے انہوں نے ان کے فتوے سے بھی تیز کوئی فتوی لگا دیا یہ ہے

اصل اکثر علماء کے باہم مخالفت کی، اس میں قصور عوام کا تو ہے ہی مگر علماء کی بھی یہ کوتاہی ضرور ہے کہ کیوں فضول باتوں کے جواب کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جس کے یہ نتائج ہوتے ہیں یہ کونسا کمال ہے کہ جواب میں سائل کے بھی مذاق کا اتباع کیا جائے جب ہم کو معلوم ہو جائے کہ یہ سوال بے ضرورت کیا جاتا ہے اور اس کے یہ نتائج ہونے والے ہیں تو ہم سکوت کیوں نہ اختیار کر لیں، میں تو اس سوال کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا جس میں گو کچھ بھی مفاسد نہ ہوں لیکن بے ضرورت ہو کیونکہ کم سے کم تضییع وقت (یعنی وقت کو ضائع کرنا) تو ہے ہی، یہ فضول ایسا ہے جیسا کوئی سائل آکر پوچھے کہ تم نے مکان کتنے گز زمین میں بنوایا ہے، تو کون عقلمند ہے کہ اس کا تحقیقی جواب دینے کے لئے تیار ہو جائے گا؟ بس اس کا جواب یہی دے گا کہ اس سوال سے غرض بتلاؤ؟ جب غرض صحیح نہیں ہے تو ہم جواب بھی نہیں دیتے پھر بھی برتاؤ ان سائلوں کے ساتھ نہیں کیا جاتا جو دین کے متعلق بیکار سوال کرتے ہیں۔ اس کثرت سوال کو بھی منع فرمایا گیا ہے۔[1]

غیر ضروری سوال کرنے اور دقیق بحثوں میں پڑنے اور دلیلوں کے پوچھنے کا نقصان

کثرت سوال کے ایک معنی وہ بھی ہیں جس کا ترجمہ ہے بہت پوچھنا یعنی وہ باتیں پوچھنا جو ضرورت اور اپنے حوصلہ سے باہر ہوں جیسے لوگوں نے آج کل مشغلے کر لئے ہیں کہ جب پوچھتے ہیں تو تقدیر کا مسئلہ اور وحدۃ الوجود کا مسئلہ پوچھتے ہیں جو ایسے باریک مسئلے ہیں کہ بڑے بڑے عقلاء نے ان میں سر مارا اور کچھ نہ پا سکے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ مسئلے صحیح نہیں، مسئلے بالکل صحیح ہیں اور عقل سے خارج بھی

[1] ذم المکروہات ملحقہ الاح اعمال ص ۴۵۰، ۴۵۱

نہیں لیکن مشکل اور دقیق بہت ہیں ہر شخص کے سمجھ میں نہیں آ سکتے بلکہ عقل محض سے حل ہو ہی نہیں سکتے، ہاں اگر کوئی با قاعدہ علم حاصل کر لے اور عقل کی امداد نقل سے لے تو وہ ان کی تہ کو بخوبی پہنچ سکتا ہے بالکل کھلے ہوئے مسئلے ہیں، پھر غضب یہ ہے کہ پوچھنے والوں میں لیاقت تو گلستاں اور بوستاں کی بھی نہیں ہوتی اور بحث کرتے ہیں ان مسئلوں میں پھر اس کے نتیجے دو ہوتے ہیں اگر مزاج میں آزادی ہوئی تب تو آگے چل نکلتے ہیں اور کوئی ہمہ اوست کہتا پھرتا ہے اور کوئی جبر کا قائل ہو جاتا ہے حالانکہ سمجھتے کچھ بھی نہیں کہ ہمہ اوست کیا بلا ہے اور جبر واختیار کس کو کہتے ہیں اور اگر آزادی نہ ہوئی تو ان دونوں مسئلوں میں قسم قسم کے شکوک پیدا ہو جاتے ہیں پھر معاذ اللہ یہ نوبت آتی ہے کہ نفس کہتا ہے یہ کیسا دین ہے جس میں ایسے مشتبہ مسائل ہیں، قصور تو اپنا اور بدظنی دین سے، صاحبو! ان مشغلوں کو چھوڑ و اور کام میں لگو۔

علماء اور مفتیوں کو مشورہ

اور مجیب صاحبوں کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ جب ایسے مسئلہ پوچھے جائیں اور سائل ان کے سمجھنے کا اہل نہ ہو تو ہرگز جواب نہ دیں، عالم ہونے کی شان یہی نہیں کہ ہر بات کے جواب کے لئے تیار ہو جائیں آج کل دونوں طرف سے بے احتیاطی ہے سائل تو ایسے ہی مسئلوں کی چھیڑ چھاڑ کو دین سمجھے ہوئے ہیں اور علماء اپنا کمال اس کو سمجھتے ہیں کہ سارے مسائل کو سمجھا ہی کر چھوڑیں۔[1]

[1] وعظ ذم المکروہات ص۴۴۵

صرف ضروری اور کام ہی کی باتیں پوچھئے فضولیات سے بچئے

ایک عالم صاحب سے کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین شریفین کے ایمان کی نسبت سوال کیا، انہوں نے فرمایا کہ نماز کے فرض تم کو یاد ہیں؟ جواب دیا کہ نہیں، فرمایا فرائضِ نماز یاد کرو جن میں سے اگر کوئی متروک ہو جائے تو نماز ہی نہ ہو، اور نماز وہ چیز ہے کہ قیامت میں سب سے اول اسی کی باز پرس ہوگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے متعلق (تو تم سے) سوال بھی نہ ہوگا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: **من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه** یعنی اسلام کی خوبی یہ ہے کہ آدمی فضول کو ترک کردے۔

اور کوئی وجہ تو ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ تقدیر میں گفتگو کرنے کی ممانعت فرمائی، کیا حضرات صحابہ اس کو سمجھ نہ سکتے تھے؟ حالانکہ ہم جیسے بھی کچھ تفصیل سمجھ لیتے ہیں، وجہ یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ مسئلہ تقدیر کی تحقیق پر کوئی کام اٹکا ہوا نہیں، جو اعمال کرنے کے ہیں ان کی تحقیق چاہئے، تقدیر پر اجمالی ایمان بالکل کافی ہے۔

اور دیکھو قرآن شریف میں ہے **يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ** یعنی صحابہ دریافت کرتے ہیں کہ چاند چھوٹا بڑا کیوں ہوتا ہے؟ جواب ملا **قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ** یعنی چاند کے یہ حالات مختلفہ حج وغیرہ کے اوقات معلوم کرنے کے واسطے ہیں، تو سوال تو علت سے تھا مگر جواب میں حکمت بیان کی، اس میں یہی اشارہ ہے کہ کام کی بات پوچھو اور غیر ضروری سے پرہیز کرو، یہ جواب علیٰ اسلوب الحکیم کہلاتا ہے اور دیکھئے نص میں تصریح ہے **وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ** (پ ۱۸) لایعنی کے معنی ہیں **مالا نفع فیه** (یعنی جس میں کوئی نفع نہ ہو) اور یہ عام ہے خواہ مضر ہو یا نہ ہو، پس کتاب وسنت تو لایعنی کے ترک کرنے کا حکم دے رہی ہے مگر آج کل عموماً اسی میں ابتلاء ہو رہا ہے۔[1]

[1] وعظ شفاء العی ملحقہ تدبیر وتوکل ص ۲۲۹

فصل (۱)

مستفتیوں کے لئے چند ضروری ہدایات وآداب

مسئلہ ہر مولوی یا عالم سے نہ پوچھنا چاہیئے

لوگ کیف ما اتفق کسی سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں بعض اوقات تو یہ بھی نہیں تحقیق کرتے کہ واقعی یہ شخص عالم بھی ہے یا نہیں کسی کا نام مولوی سن لیا اور اس سے دین کی باتیں پوچھنے لگے۔

اور بعض اوقات عالم ہونا معلوم ہوتا ہے مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس مشرب کا ہے، کس عقیدہ کا ہے، ایسے شخص کے جواب سے بعض اوقات تو عقیدہ یا عمل میں خرابی ہو جاتی ہے اور بعض اوقات تردد وشبہ میں پڑ کر پریشان ہوتا ہے یا پریشان کرتا ہے۔[۱]

عامی شخص کو مسائل کے دلائل اور علتیں نہ دریافت کرنا چاہیئے

ایک غلطی یہ ہے کہ مسائل کے دلائل دریافت کئے جاتے ہیں جن کے سمجھنے کے لئے علوم درسیہ کی حاجت ہے اور چونکہ سائل کو وہ حاصل نہیں اس لیے وہ دلیل کو سمجھتا نہیں اور اگر اسی خیال سے کوئی مجیب (جواب دینے والا) دلیل دینے سے انکار کرتا ہے تو اس مجیب غریب کو بدخلقی پر محمول کیا جاتا ہے۔[۲]

غیر ضروری اسرار اور علل پوچھنے کی مذمت

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ الآية (پ۱۵ بنی اسرائیل)

---

۱ اصلاح انقلاب ص۱۳۱۔ ۲ اصلاح انقلاب ۱/۱۳۱۔

(ترجمہ) اور یہ لوگ آپ سے روح کو پوچھتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

فائدہ: اس میں دلالت ہے کہ اسرار غیر ضروریہ کا تفحص (یعنی احکام کی مصلحتوں اور حکمتوں کی جستجو اور اس کے متعلق سوال) مذموم ہے، جب کہ آیت کا مدلول نہی عن السوال کہا جائے، جیسا کہ ظاہر ہے[1]۔

آپسی بحث ومباحثہ کی وجہ سے استفتاء نہ کرنا چاہئے

(کچھ لوگ) کسی سے کسی مسئلہ میں مباحثہ شروع کرتے ہیں پھر اپنی تائید کے لیے فتویٰ حاصل کرتے ہیں پھر وہ اپنے مخالف کو دکھلا کر اس پر احتجاج کرتے ہیں پھر وہ اپنے موافق فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح خوامخواہ باہم جنگ وجدل کیا کرتے ہیں حالانکہ عوام کو اس میں پڑنا موجب خطر ہے اگر ان سے کوئی اہل باطل الجھے تو علماء کا حوالہ دے کر اس کو قطع کر دیا جائے اگر غرض ہوگی تو خود پوچھے گا[2]۔

غیر ضروری اور فضول سوال نہیں کرنا چاہئے

غیر ضروری چیزوں سے جن میں غیر ضروری سوال بھی آ گیا اجتناب رکھو! اسلام کی خوبی میں سے ہے کہ لایعنی یعنی فضول باتوں کو ترک کر دیا جائے حدیث شریف میں ہے **من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ۔**

جس سوال کی انسان کو خود ضرورت نہ ہو کیوں فضول وقت خراب کرے اپنا بھی اور دوسرے کا بھی، اور اگر بلاضرورت ہی تحقیقات کا شوق ہے تو مدارس میں جا کر ترتیب سے تعلیم حاصل کیجئے، مگر آج کل یہ مرض عام ہو گیا ہے کہ لاؤ خالی بیٹھے کچھ نہ کچھ مشغلہ ہی سہی (یہ بہت بڑی غلطی ہے) ہر شخص کو اپنے عمل کے لیے پوچھنا چاہئے[3]۔

---

[1] بیان القرآن، مسائل السلوک ص ۳۰۹ [2] اصلاح انقلاب ۱/۳۱ [3] الافاضات الیومیہ ۲/۱۲۷۔

ضروری سوال کی تعریف

ضروری چیز کا معیار یہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتو ضرر مرتب ہو۔[1]

جس چیز کا اپنے سے تعلق نہ ہو بس وہ غیر ضروری ہے، بس جو چیز ضروری ہو (یعنی اپنے سے متعلق ہو) آدمی اس کا حکم معلوم کرے۔[2]

سائل و مستفتی پر مفتیوں کے آداب ملحوظ رکھنا ضروری ہے

یَـاأَیُّهَـا الَّـذِیْـنَ آمَـنُـوْا لَاتَـرْفَعُـوْا أَصْـوَاتَـکُـمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِـیِّ وَلَاتَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ کَجَهْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ الآیة۔ (پ۲۶ سورہ حجرات)

(ترجمہ وتفسیر) اے ایمان والو! اپنی آوازیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند مت کیا کرو، اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہو، یعنی نہ بلند آواز سے بولو، جب کہ آپ کے سامنے بات کرنا ہو، گو باہم ہی مخاطبت ہو اور نہ برابر کی آواز سے بولو جب کہ خود آپ سے مخاطبت کرو، بے شک جو لوگ حجروں کے باہر سے آپ کو پکارتے ہیں ان میں اکثروں کو عقل نہیں ہے، ورنہ آپ کا ادب کرتے اور ایسی جرأت نہ کرتے، اور اگر یہ لوگ ذرا صبر کرتے اور انتظار کرتے یہاں تک کہ آپ خود باہر ان کے پاس آجاتے، تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا، کیونکہ یہ ادب کی بات تھی، اور یہ لوگ اگر اب بھی توبہ کرلیں تو معاف ہو جاوے کیونکہ اللہ غفور رحیم ہے۔

(فائدہ) علماء نے تصریح کی ہے کہ جو حضرات دین کی بزرگی رکھتے ہوں ان کے ساتھ بھی یہی آداب برتنا چاہئے گو سوءِ ادب کا وبال اس درجہ کا نہ ہوگا لیکن تأذی بلا ضرورت (یعنی بلاوجہ ان کی ایذا کا باعث بننے) میں حرمت ضرور ہے۔[3]

---

[1] الافاضات ۳۸/۴ [2] ملفوظات حکیم الامت ۱۲۴ ج ۵ ملفوظ نمبر ۱۳۱ [3] بیان القرآن پ ۲۶ سورہ حجرات

مسئلہ پوچھنے میں موقع ومحل کی رعایت کرنا چاہئے

(مسائل) پوچھنے کے لیے ہمیشہ الگ جلسہ ہونا چاہئے، بے وقت سوال کرنا بڑی غلطی ہے جیسے کوئی طبیب راستے میں چلا جارہا ہے اور کوئی مریض کہے چلتے چلتے نسخہ ہی لکھتے جاؤ اس حالت میں کیا نسخہ لکھے گا، پوچھنے کے لیے الگ جلسہ ہونا چاہئے جس میں یہی کام ہوتا، کہ جواب دینے والے کے تمام خیالات اسی طرف متوجہ ہوں۔[1]

بعض لوگ کھانا کھاتے میں کچھ پوچھا کرتے ہیں تو میں منع کردیتا ہوں کیونکہ کھانے میں خلل ہوتا ہے کھانا کھانے میں تو تفریح کی باتیں کرنا چاہئے (یعنی) اس وقت ایسی کوئی بات جس میں سوچنا پڑے نہ کرنا چاہئے اس سے غذا کے ہضم میں بھی تو فرق پڑتا ہے۔[2]

ایک صاحب نے دور سے بیٹھے ہوئے بلند آواز سے عرض کیا کہ حضرت ایک مسئلہ دریافت کرنا ہے، فرمایا کہ اتنی دور سے مسئلہ نہیں پوچھا کرتے کوئی مسئلہ بیکار نہیں، تم کو بھی اذان دینا پڑے گی، اور مجھ کو بھی، جب مجمع کم ہوجائے اور قریب آسکو تب پوچھنا ابھی انتظار کرو۔[3]

راستہ چلتے مسئلہ پوچھنے کی ممانعت

فرمایا کہ میں راستہ میں مسئلہ نہیں بتلایا کرتا وہاں اطمینان تو ہوتا نہیں ہے۔[4]

سوال کرنے کا طریقہ

سوال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو کہنا ہو اپنی طرف منسوب کرکے پوچھے دوسروں کے اقوال نقل کرکے تصویب وتخطیہ نہ کرائے (کہ یہ صحیح ہے یا غلط) اس سے طبیعت پر بار ہوتا ہے۔

(مطلب یہ ہے کہ) جو شبہ اپنے کو پیش آئے اس کا خود سوال کیجئے دوسروں کے اقوال سوال کے وقت نقل نہ کیجئے۔ (الافاضات الیومیہ)

---

[1] حسن العزیز ۲/۹۷۔ [2] الافاضات الیومیہ ۲/۸۔ [3] الافاضات ۲/۸۔ [4] الافاضات الیومیہ ۲/۱۳۵۔

ہر سوال واضح اور علیحدہ ہونا چاہئے

ایک صاحب نے مسئلہ دریافت کیا اور دو صورتوں کو ایک ہی مسئلہ میں جمع کر دیا کہ ''اگر یہ کیا یا یہ کیا'' تو کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ اس طرح دو سوالوں کو ایک ساتھ جمع کر کے نہ پوچھئے یعنی ''یا'' کر کے نہ پوچھئے! بہت سے سوال میرے پاس لفظ ''یا'' کے ساتھ آتے ہیں جہاں ''یا'' ہوا واپس کر دیتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں کہ علیحدہ علیحدہ سوال قائم کر کے بھیجئے۔[1]

ایک ہی مسئلہ کو بار بار نہ پوچھنا چاہئے

ایک صاحب نے ایک مسئلہ مولانا صاحب سے دریافت کیا اور اس کے ذیل میں یہ بھی کہنے لگے کہ فلاں مولوی صاحب نے اس مسئلہ کو اس طرح بیان کیا تھا، مولانا نے فرمایا کہ جب تم نے ایک جگہ اس مسئلہ کو دریافت کر لیا تھا پھر دوبارہ کیوں دریافت کرتے ہو؟ اور اگر تم کو ان مولوی صاحب پر اعتقاد نہیں تو پھر میرے سامنے ان کا نام لینے سے کیا فائدہ یہ حرکت سخت بے ہودگی کی ہے۔[2]

ایک ہی مسئلہ کو کئی جگہ نہ دریافت کرنا چاہئے

فرمایا کہ دو جگہ مسئلہ نہ دریافت کیا کرو، اس طرح تسلی و تشفی نہیں ہوتی بلکہ تشویش بڑھ جاتی ہے جس سے عقیدت ہو اس سے دریافت کرو، اور اگر (کبھی کسی ضرورت سے) چند جگہ دریافت کرو تو فیصلہ خود کیا کرو، ایک کا جواب دوسری جگہ دوسرے کے سامنے نقل کرنا بالکل نامناسب ہے اور کوئی عالم کسی کا مقلد نہیں ہو سکتا۔[3]

---

[1] حسن العزیز ۱۹۵/۱ [2] دعوات عبدیت ۱۴/۱۰۱ ۴ ملفوظات ۳۲/۳ ۔ [3] ملفوظات ۳۲/۳۔

ایک ہی مفتی کا انتخاب کر لینا چاہئے

اسی طرح مذہب کے علماءِ اخیار میں سے ایک ہی کو متعین کر لینے میں یہی حکمت ہے کیونکہ زمانہ کی حالت بدل گئی ہے لوگوں پر غرض پرستی غالب ہے اور ایک مذہب کے علماء میں بھی آپس میں مسائل کے اندر اختلاف ہے پس اگر ایک عالم کو متعین نہ کیا جائے گا تو اس میں اندیشہ ہے کہ کہیں غرض پرستی میں نہ پڑ جائیں کہ جس عالم کی رائے نفس کے موافق ہوئی اس کو مان لیا اور جس کی رائے خلاف ہوئی اس کو نہ مانا۔[1]

ایک ہی مسئلہ کوئی جگہ دریافت کرنے کی خرابی

(کچھ لوگ) ایک مسئلہ کوئی جگہ پوچھتے ہیں اور بعض اوقات جواب مختلف ملتا ہے تو اس وقت یا تو تعیّن راجح (یعنی کس فتویٰ کو ترجیح دیں اس) میں پریشان ہوتے ہیں یا جس میں نفس کی مصلحت ہوتی ہے اس پر عمل کرتے ہیں اور کبھی اس کی عادت ہو جاتی ہے تو استفتاء سے یہی مقصود ہوتا ہے کہ نفس کے موافق جواب ملے اور جب تک ایسا جواب نہیں ملتا برابر اس کدو کاوش میں رہتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ وضع تدین سے بہت بعید ہے، سراسر اتباع ہویٰ وتلعُّب فی الدین ہے (وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ، اس سے بڑا گمراہ کون ہوگا جو اپنے نفس کی پیروی کرے، یعنی یہ صورت دین سے دور اور دین کے ساتھ کھیل اور خواہش نفس کی پیروی کے مرادف ہے)۔[2]

ایک مفتی کا جواب دوسرے مفتی کے سامنے نقل کرنے کا نقصان

بعض اوقات ایک مجیب (مفتی) کا جواب دوسرے مجیب کے سامنے نقل کر دیا جاتا ہے چونکہ بعض اوقات طبیعت کا رنگ خاص ہوتا ہے اور بعض اوقات نقل کا

---

[1] اشرف الجواب ۱۲۶/۲ [2] اصلاح انقلاب ص ۳۔

لب ولہجہ کچھ معارضانہ ہوتا ہے، اس لیے بھی اس مجیب کی زبان سے دوسرے مجیب کی نسبت یا اس کے جواب کی نسبت ناملائم (غیر مناسب) لفظ نکل جاتا ہے پھر یہی ناقل یا دوسرا (شخص) اس مجیب تک اس کو پہنچا دیتا ہے پھر وہ کچھ کہہ دیتا ہے، اس کی خبر اس پہلے تک پہنچتی ہے، اور بعض دفعہ بلکہ اکثر ان منقولات (نقل کی ہوئی بات) میں بھی لفظی یا معنوی تغیر وتبدل کر دیا جاتا ہے اور اس طور پر باہم ایک فساد عظیم ان میں برپا ہوجاتا ہے۔[1]

ایک خط میں تین سے زائد سوال نہ کرنا چاہئے

ایک صاحب نے بہت سے سوالات ایک خط میں لکھ کر بھیجے، یہاں سے یہ جواب گیا کہ ایک خط میں دو تین سوال سے زیادہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ اتنی فرصت نہیں ہے۔[2]

ایک خط میں اس قدر سوالات کی کثرت نہ کرنا چاہئے

ایک صاحب کا کارڈ آیا تھا اس میں سات سوالات کئے تھے میں نے لکھ دیا کہ تمہیں رحم نہیں آیا، خود لفافہ میں بھی دو سوال سے زیادہ نہ ہوں نہ کہ کارڈ میں سات سوالات، اب بتلایئے کہاں تک خوش اخلاق بن سکتا ہوں، ایک کارڈ میں سات سوالات کا جواب کس طرح لکھ دیتا، لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ اور کوئی کام نہ ہوگا اس لئے اتنے سوال بھیج دیتے ہیں، پھر یہ سب سوالات اسی وقت تک ہیں کہ مفت جواب مل جاتا ہے، اگر فی سوال قلیل فیس بھی مقرر کر دی جائے تو امید ہے کہ ایک سوال بھی نہ آئے، ایک مولوی صاحب فتویٰ کی فیس لیتے ہیں اور وہ اس لینے کو چھپاتے بھی نہیں، اعلان کر کے لیتے ہیں اور صاحب تجارت کا تو اعلان ہونا ہی چاہئے، اور دیوبند میں کثرت سے فتوے آتے ہیں، ایک پیسہ بھی نہیں لیا جاتا اور گو لینا جائز ہے مگر اس طرز میں یعنی لینے میں آزادی نہیں رہ سکتی اس لئے یہ اچھا طرز نہیں۔[3]

---

[1] اصلاح انقلاب ص ۱۳۱ [2] حسن العزیز ۲/۱۷ [3] ملفوظات حکیم الامت ص ۵۷۴ ج ۱ قسط ۴

فصل (۲)

ائمہ مجتہدین اور علماء کے اختلافی مسائل پر اعتراض کرنا دراصل اللہ ورسول پر اعتراض کرنا ہے

بعض جہلاء علماء پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے یہاں ہر بات میں اختلاف ہے اب ہم کس کا اتباع کریں؟ کس کو سچا سمجھیں، کس کو جھوٹا سمجھیں؟ سو (ماقبل) میں جب اس اختلاف کا قرآن وحدیث واقوال اکابر امت سے محمود ہونا ثابت ہو چکا ہے تو اس اختلاف پر اعتراض کرنا حق تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر امت پر اعتراض کرنا ہے۔

اس اختلاف کا حکم یہ ہے کہ یہ باتفاق واجماعِ علماء امت محمود ومقبول ہے اور ان احادیث واقوال اکابر کا یہی محمل ہے:

عن عمر بن الخطابؓ قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول سألت ربى عن اختلاف اصحابى من بعدى فاوحى الى يامحمد أن اصحابك عند ى بمنزلة النجوم فى السماء بعضها أقوى من بعض ولكل نور فمن اخذبشىء مماهم عليه من اختلافهم فهو عندى على هدى .

قال وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اصحابى كالنجوم فبايهم اقتديتم اهتديتم (رواه رزين ،مشكوٰة باب مناقب الصحابة)

فى المقاصد الحسنة من المدخل للبيهقى من حديث سفيان عن أفلح بن حميد عن القاسم بن محمد قال: اختلاف اصحاب محمد

رحمة للعباد.

ومن حديث قتادة ان عمر بن عبدالعزيز كان يقول: ماسرني لو أن اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم لم يختلفوا لانهم لولم يختلفوا لم تكن رخصة.

ومن حديث الليث بن سعد عن يحى بن سعيد قال اهل العلم اهل توسعة ومابرح المفتون يختلفون فيحل هذا ويحرم هذافلايعيب هذا على هذا اه .

وكان اختلاف موسى وهارون عليهما السلام فى معاملة بنى اسرائيل من هذاالقبيل، وغضب موسىٰ عليه السلام كان قبل العلم بوجه اجتهاد هارون عليه السلام [1]

رہا یہ کہ پھر ہم کس کا اتباع کریں سو اس کا فیصلہ نہایت سہل ہے وہ یہ کہ جب کسی مریض کے باب میں ماہرین اطباء کا اختلاف ہوتا ہے یا کسی مقدمہ کے متعلق وکلاء کا اختلاف ہوتا ہے کیا تم سب کو چھوڑ کر مریض کے معالجہ سے اور مقدمہ کی پیروی سے بیٹھ رہتے ہو یا کسی اصول کی بناء پر ان میں سے ایک کو ترجیح دے کر اپنے مقصود میں مشغول ہو جاتے ہو؟

اسی طرح یہاں بھی ترجیح کے کچھ اصول ہیں جو عقل صحیح سے معلوم ہو سکتے ہیں ان ہی اصول سے یہاں بھی ایک کو ترجیح دے کر کام میں لگنا چاہئے ،مگر اختلاف اطباء کے وقت ان اصول کو اپنانا اور اختلاف علماء کے وقت ان اصول کا نہ اپنانا صرف اس وجہ سے ہے کہ وہاں دنیوی مقصود کو ضروری سمجھتے ہیں اور وہ موقوف ہے اتباع پر اور یہاں دینی مقصود کو ضروری نہیں سمجھتے اس لئے بہانے ڈھونڈتے ہیں [2]

---

[1] رسالہ احکام الائتلاف فی احکام الاختلاف ملحقہ بوادر النوادر ص ۶۷۳

[2] بوادر النوادر ص ۶۷۳، ۶۸۰

یہ رائے صحیح نہیں کہ احکام شرعیہ میں علماء کو کمیٹی قائم کر کے اختلاف ختم کر لینا چاہئے

بعض لوگ آج کل یہ بھی کہتے ہیں کہ مجتہدین میں آپس میں اختلاف کیوں رہا، سب نے مل کر کمیٹی کر کے اتفاق رائے کیوں نہ کرلیا؟ یہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ دنیا کی کون سی چیز اختلاف سے خالی ہے، بہت سے مسائل طب کے ایسے ہیں جن میں اطباء مجتہدین کا اختلاف رہا، تو انہوں نے کمیٹی کر کے اختلاف کو کیوں نہ رفع کرلیا؟ آج کل کمیٹی کا بڑا زور ہے، ڈاکٹر لوگ تو کثرت رائے کے معتقد ہیں تو ذرا ان سے پوچھئے کہ انہوں نے اپنے باہمی اختلاف کو جو ان کے درمیان طبی مسائل میں اس وقت بھی موجود ہیں، کمیٹی کے کر کے کیوں نہ دور کیا؟ اور اس سے بھی واضح نظیر لیجئے کہ سلطنت موجودہ کا قانون ایک ہے، لیکن پھر بھی دو ججوں میں اختلاف ہوتا ہے انہیں واقعات کی بناء پر جو مثل میں موجود ہے ایک پھانسی کا حکم دیتا ہے دوسرا اس کو رہا کرتا ہے، دونوں موجود ہیں دونوں مل کر کمیٹی کر کے ایک بات پر کیوں نہیں اتفاق رائے کر لیتے ہیں؟

یہ سوال ان ہی کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے، جن کے دلوں میں دین کی عظمت ووقعت ذرا بھی نہیں ہے اور دین کو صرف رسم ورواج کے طور پر مانتے ہیں اس واسطے رفع الزام کے طور پر کہتے ہیں کہ مجتہدین نے اتفاق رائے کیوں نہ کرلیا، ان کے نزدیک دین کوئی مہتم بالشان چیز نہیں لہٰذا ان کے نزدیک رفع اختلاف کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ جن لوگوں میں اختلاف ہو وہ جمع ہو کر بیٹھ جاویں اور دو چار آدمی اِدھر اور دو چار اُدھر ہو جائیں اور جس طرف کثرت رائے ہو اسی کو ٹھیک سمجھ لیا جاوے اور اسی کو دین قرار دیا جائے چاہے وہ صحیح ہو یا غلط۔[1]

[1] وعظ الصالحون ملحقہ اصلاح اعمال ص ۱۴۵

یہ خواہش غلط ہے کہ احکام ومسائل میں سب علماء جمع ہوکر ایک شق پر متفق ہوجائیں

بعض لوگ اس سے بڑھ کر جہالت پر کارفرما ہوتے ہیں اور یہ مشورہ دیتے ہیں کہ علماء سب جمع ہوکر ایسے مسائل کا فیصلہ کرکے سب ایک شق پر متفق ہوجاویں، اس کا حقیقی جواب سمجھنے کے لئے تو علوم شرعیہ میں مہارت کی ضرورت ہے جو ان صاحبوں میں اس وجہ سے مفقود ہے کہ علم دین میں مشغول ہونا ان کے نزدیک منجملہ جرائم وتنزل کے ہے اس لئے ایک سطحی جواب عرض کرتا ہوں وہ بھی کافی ہے وہ یہ کہ کیا اس کے قبل کسی زمانہ میں ایسے علماء وسلاطین نہیں گذرے جنہوں نے اس ضرورت کا احساس کیا ہو اور اس کا انتظام بھی کرسکتے ہوں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو آفتاب نصف النہار کا انکار ہے اور اگر اثبات میں ہے تو اس سے اجمالاً سمجھ لیجئے کہ اس میں کوئی مانع شرعی ضرور تھا جس کے سبب اس کا قصد نہیں کیا گیا تو کیا ایک ممنوع شرعی کی ہم سے درخواست کی جاتی ہے؟ ع ایں خیال ست ومحال ست وجنوں

کیا علماء دنیوی خواہشوں پر اس آیت کو بھول جائیں گے ”وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَائَهُمْ بَعْدَالَّذِیْ جَاءَکَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَکَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلاَ نَصِیْر“۔[1]

علماء کے مسئلوں اور مفتیوں کے فتوؤں کو رد کرنا دراصل اللہ ورسول کے فرمان کو رد کرنا اور مقابلہ کرنا ہے

مسائل دینیہ میں جہلاء کا دخل دینا اور دلیل کے مقابلہ میں اس کہہ دینے کو کافی سمجھنا

---

[1] بوادر النوادر ص ۶۸۰

کہ ''ہمارا خیال یہ ہے'' ایک عام طریقہ ہے۔

اس کا مذموم ہونا (ماقبل) میں گذر چکا ہے اتنا اور مزید کرتا ہوں کہ کیا یہ حضرات کبھی کسی حکیم وڈاکٹر کی تجویز سننے کے بعد اس کے خلاف رائے قائم کر کے یہ کہنے کی ہمت کر سکتے ہیں کہ ''ہمارا خیال یہ ہے'' یا کسی حاکم وافسر کے سامنے اس کے حکم کے خلاف رائے ظاہر کر کے یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ ''ہمارا خیال یہ ہے''؟

توافسوس خدا اور رسول کے احکام کے سامنے یہ کہنے کی کیسے جسارت ہوتی ہے۔

اگر کہا جائے کہ وہ اللہ ورسول کے احکام ہی نہیں ہوتے یا تو وہ علماء کا اجتہاد ہوتا ہے یا اگر نصوص ہوتے ہیں تو ان کی تفسیر علماء کی ہوتی ہے، ہم علماء کے مقابلہ میں کہتے ہیں۔

اس کا جواب ظاہر ہے کہ نصوص کو بھی علماء جیسا سمجھتے ہیں تم قیامت تک نہیں سمجھ سکتے اور اگر ان کا اجتہاد ہے تو وہ اجتہاد بھی ماخوذ نصوص ہی سے ہے اس کے اخذ کا سلیقہ بھی علماء ہی کو ہے تم کو نہیں، لہٰذا دونوں حالتوں میں علماء کے مقابلہ میں یہ کہنا درحقیقت خدا اور رسول ہی کے مقابلہ میں کہنا ہے۔[1]

احکام شرعیہ اور دینی مسائل میں اپنی رائے کو دخل دینا ناجائز ہے

آج کل مدعیانِ عقل میں عام مرض ہوگیا ہے کہ علم دین حاصل کئے بغیر مسائل دینیہ میں دخل دیتے ہیں اور بجائے دلیل کے اس کہنے کو کافی سمجھتے ہیں کہ ''ہمارا یہ خیال ہے'' اور علماء کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں۔

اس اختلاف کا حکم یہ ہے کہ یہ سخت معصیت اور مذموم ہے اور یہ احادیث اسی باب میں وارد ہیں۔

[1] بوادر النوادر ص ۶۸۱

عن عبدالله بن عمرقال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الىٰ قوله حتى اذا لم يبق عالم اتخذالناس رؤساجها لا فسئلوا فافتوابغير علم فضلوا واضلوا (متفق عليه ،مشكوٰة، باب العلم)

عن عوف بن مالک رفعه تفترق امتى على بضع وسبعين فرقة اعظمها فتنة على امتى قوم يقيسون الا مور برأيهم فيحلون الحرام ويحرمون الحلال (للكبير والبزار)

(عن ابن عمر وبن العاص) رفعه. لم يزل امر بنى اسرائيل معتدلاً حتى نشأ فيهم المولد ون وابناء سباياالا مم فقالوبالرأى فضلوا واضلوا.للقزوينى.

(عن ابن سيرين) قال اول من قاس ابليس وماعبدت الشمس والقمر الا بالمقائيس، للدارمى يعنى قوله تعالىٰ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَارٍ وَّخَلَقْتَه' مِنْ طِيْن (المراد بالقياس الغير الماخوذ من الشرع) من جمع الفوائد)[1]

(ان حدیثوں میں واضح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ جب کوئی عالمِ دین باقی نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے،ان سے مسئلہ پوچھا جائے گا ،بغیرعلم وتحقیق وہ فتوے دیں گے ،خودبھی گمراہ ہوں گے اورلوگوں کوبھی گمراہ کریں گے۔

آپ نے فرمایا میری امت میں ۷۲فرقے ہوں گے،میری امت کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہوگا کہ احکام ومسائل میں (شرعی دلیل کے بغیرمحض)اپنی رائے سے قیاس کریں گے،حرام کوحلال اورحلال کوحرام کریں گے،بنی اسرائیل کا معاملہ درست رہاحتی کہ ایسے لوگ ان میں پیداہوئے جنہوں نے (حکم الٰہی اورشرعی دلیل کے بغیر) رائے سے فیصلے

[1] بوادرالنوادرص۶۷۴

کئے، خود گمراہ ہوئے، دوسروں کو گمراہ کیا۔

سب سے پہلے (فاسد قیاس، دلیل شرعی کے بغیر) ابلیس نے کیا یہ کہہ کر کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَه' مِنْ طِیْن کہ آپ نے آدم (علیہ السلام) کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے، (آگ مٹی سے افضل ہے، میں کیوں آدم کے سامنے جھکوں) آج شمس وقمر کی پرستش شیطان کے اس فاسد قیاس کے نتیجہ ہی میں ہورہی ہے۔

(ان سب حدیثوں سے معلوم ہوا کہ مسائل میں اپنی رائے کو دخل دینا حرام اور ابلیس کا طریقہ ہے، اپنی اور دوسروں کی گمراہی کا سبب ہے، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کی حفاظت فرمائے (مرتب)

عامی شخص اور غیر مجتہد کو مجتہد کے قول اور فتویٰ کا اتباع لازم ہے

جس شخص میں اجتہاد کی اہلیت (وقابلیت) نہ ہو خواہ وہ عامی محض ہو یا کسی قدر ان علوم کو حاصل کر چکا ہو جو اجتہاد کی شرائط میں سے ہیں، ان دونوں کو مجتہدین کے قول اور فتویٰ کا اتباع لازم ہے، محققین اہل اصول کا یہی مذہب ہے۔[1]

یعنی جس کو اجتہاد کی قابلیت نہ ہو اسے خود قرآن وحدیث سے مسائل مستنبط کرنا اور اپنے استنباط پر عمل کرنا جائز نہیں جب تک اس کے قول کا مجتہدین کے قول سے موافق ہونا ظاہر نہ ہو جائے۔

العامی ومن لیس له اهلیة الاجتهاد وان کان محصلا لبعض العلوم المعتبرة فی الاجتهاد یلزمه اتباع قول المجتهدین والاخذبفتواهم عند المحققین من الاصولیین۔[2]

ای لایجوز الاجتهاد فی القرآن والحدیث والعمل باجتهاده

---

[1] امداد الفتاویٰ ص ۱۸۰ ج ۳ [2] احکام الاحکام للآمدی ص ۳۰۶ ج ۴

مالم يظهر موافقة لقول المجتهدين۔[1]☆

فتویٰ کی مخالفت کس کو کہتے ہیں؟

کسی کے فتویٰ جواز کے بعد اس فعل کو ترک کرنا صاحب فتویٰ کی مخالفت نہیں ہے، البتہ فتویٰ وجوب کے بعد اس فعل کو ترک کرنا یا فتویٰ حرمت کے بعد اس فعل کا ارتکاب کرنا یہ بیشک (فتویٰ کی) مخالفت ہے۔[2]

☆قال العلامه الشاطبی رحمه الله تعالیٰ:

فتاوی المجتهدين بالنسبة الى العوام كالأدلة الشرعية بالنسبة الى المجتهدين ،والدليل عليه أن وجود الأدلة بالنسبة الى المقلدين وعدمها سواءٌ اذكانوا لايستفيدون منها شيئاً ،فليس النظر فی الأدلة والاستنباط من شأنهم ،ولا يجوز ذالک لهم البتة ، وقد قال تعالیٰ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ،والمقلد غيرعالم ،فلايصح له الا سوال أهل الذكر ،واليهم مرجعه فی احكام الدين على الاطلاق ، فهم اذاً القائمون له' مقام الشارع، واقوالهم قائمة مقام الشارع ،..........فثبت أن قول المجتهد دليل العامی ۔

(الموافقات للشاطبی، کتاب الاجتہاد، المسئلۃ التاسعۃ ص ۱۸۵ ج ۴)

مطلب یہ کہ: مجتہدین کے فتاویٰ عوام کے لئے شرعی دلیل کا درجہ رکھتے ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ مقلدین کے حق میں دلائل کا ہونا نہ ہونا برابر ہے کیونکہ وہ ان دلائل سے مستفید نہیں ہوسکتے، استنباط اور ادلۂ شرعیہ سے انہیں کچھ سروکار نہیں، اور ان کے لئے یہ جائز اور ممکن بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کہ غیر عالم عالم سے پوچھیں، اور مقلد غیر عالم ہے لہٰذا اس کے لئے اہل علم کے سوال کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں، احکام دین میں علماء ہی اس کا مرجع ہیں، اس لئے علماء مجتہدین اور ان کے اقوال عامی کے لئے شریعت کا درجہ رکھتے ہیں ۔۔۔۔۔۔اس سے ثابت ہوگیا کہ مجتہدین کا قول عامی کے حق میں دلیل کا درجہ رکھتا ہے۔

[1] امداد الفتاویٰ ص ۱۸۰ ج ۳ رسالہ کشف الدجیٰ عن وجہ الربوا [2] امداد الفتاویٰ ۱۵۷ ج ۳ سوال نمبر ۲۰۴

فصل (۳)

علماء ومفتیوں میں اختلاف کے وقت عوام کے لئے دستور العمل

یہ شکایت آج کل اکثر زبانوں پر ہے کہ ہم کس کی پیروی کریں، علماء اور مشائخ میں خود اختلاف ہے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ، اور بعض لوگ تو اس کے متعلق بہت ہی دریدہ دہن ہیں اور جو منھ میں آتا ہے بک دیتے ہیں (کہتے ہیں) کہ سب کو چھوڑ و اس غم ہی کو مت پالو، ان حضرات سے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اختلاف کس چیز میں نہیں ہے؟ دنیا کی کوئی چیز بھی اختلاف سے خالی نہیں، معاملہ علاج ہی کو لے لیجئے کہ جس ڈاکٹر کے پاس جاؤ جس حکیم کے پاس جاؤ اس کی تشخیص الگ، تجویز الگ ہیں، دوائیں الگ۔۔۔۔غرض اتنا اختلاف ہے کہ خدا کی پناہ، مگر ہم کسی کو نہیں دیکھتے کہ اس اختلاف سے یہ نتیجہ نکالے کی ڈاکٹروں اور طبیبوں کو مطلقاً چھوڑ دے اور بیماری میں علاج ہی نہ کرے، بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ ذرا سی پھانس بھی لگ جائے یا خفیف ساز کام بھی ہوجائے تو ڈاکٹر اور حکیم کی تلاش ہوتی ہے اور اختلافِ اطبآء سے متاثر نہیں ہوتے اور یہ نہیں کرتے کہ کسی کا بھی علاج نہ کریں اور خود کو اپنے ہی حال پر چھوڑے رکھیں بلکہ ڈاکٹر اور طبیب کو ڈھونڈھتے ہیں اور یہ کام بھی کسی اناڑی اور عطائی سے نہیں لیتے بلکہ اس کے لئے بھی ہوشیار اور کارکردہ معالج کو تلاش کرتے ہیں اور کوئی نہ کوئی مل جاتا ہے، ایک پھانس کے لگ جانے میں تو یہ حالت ہوتی ہے اور دین کے بارہ میں یہ حکم لگا دیا کہ چونکہ علماء میں اختلاف ہے لہٰذا سب کو چھوڑ دو، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک دین اتنا بھی مہتم بالشان نہیں جتنی ایک پھانس کا لگنا۔[۱]

---

[۱] جلاء القلوب ملحقہ ذکر وفکر ص ۳۵۵

حق تک پہونچنے کا اور اہل حق کی پہچان کا ایک طریقہ

چند جگہ کا انتخاب کرو اور ہر ہر جگہ ایک ایک ہفتہ رہو، مگر یہ شرط ہے کہ خالی الذہن ہو کر رہو نہ کسی کے معتقد ہو نہ مخالف اور وہاں کی ہر ہر حالت میں غور کرتے رہو، دن بھر وہاں کے حالات دیکھو اور باتیں سنو اور رات کو غور کرو اور سوچو، اگر طلب صادق ہے تو حق واضح ہو جائے گا اور صاف معلوم ہو جائے گا کہ کہاں مصری ہے کہاں تنکے، کہیں تصنع اور بناوٹ ملے گی کہیں جعلسازی اور فریب ہوگا، مگر کہیں سچی اور کھری بات بھی ہوگی، اگر طلب میں خلوص ہے تو کھرے کھوٹے میں تمیز کر لینا کچھ مشکل نہ ہوگا، اس طریق سے کوشش کرو اور حق تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہو، صرف اپنی کوشش پر بھروسہ نہ کرو، ہدایت حق تعالیٰ کے کرم پر موقوف ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ عجز و نیازی ہے، دعاء کا مغز یہی عجز و نیاز ہے، کوئی اپنے علم وفہم وذہانت سے ہدایت نہیں پاتا ہے، بڑے بڑے عقلا گمراہ ہو چکے ہیں اور اب بھی موجود ہیں، ہدایت جس کو ہوئی ہے حق تعالیٰ کے فضل ہی سے ہوئی ہے، اس واسطے کوشش کے ساتھ عجز و نیاز و دعا کی بھی سخت ضرورت ہے۔ یہ طریقہ ہے حق کے حاصل کرنے کا اس سے ضرور حق مل جاتا ہے۔[1]

دونوں طرف دلیل موجود ہے تو عوام کس کو ترجیح دیں؟

اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ علماء کے اختلاف کے وقت اس پر نظر نہ کرو کہ دلیل تو ان کے پاس بھی ہے، دلیل تو سبھی کے پاس ہوا کرتی ہے کیا اس کے پاس دلیل نہ تھی جس نے ساس سے نکاح کو حلال کر دیا؟ کوئی شخص جب ایک دعوی کرتا ہے تو دلیل اس کی پہلے سوچ لیتا ہے۔

[1] وعظ جلاء القلوب ملحقہ ذکر وفکر ص ۳۵۵

اب آپ شاید یہ کہیں یہ تو عجیب گڑبڑ ہے، دونوں طرف دلیل موجود ہے تو اس میں ہم کس کو ترجیح دیں، ہمارے لئے تو بڑی مشکل ہوگئی، لڑیں تو علماء اور بیچ میں مارے جائیں ہم، میں کہتا ہوں کہ اس وقت بھی حق کے معلوم کرنے کا ایک طریقہ ہے، طلب صادق چاہئے طالب حق کے لئے کہیں راستہ بند نہیں، وہ طریقہ یہ ہے کہ اگر طالب صاحب فہم ہے تو دونوں دلیلوں میں قوت وضعف کو دیکھ کر ترجیح دے سکتا ہے، بشرطیکہ انصاف سے کام لے اور خدائے تعالیٰ کا خوف اور راہ حق کی طلب کو پیش نظر رکھے اور اگر صاحب فہم نہیں ہے اور دلیل کو کسی طرح سمجھ ہی نہیں سکتا تو اس کے لئے آسان طریقہ ترجیح کا یہ ہے کہ دونوں فتوے دینے والوں کو دیکھے اور دونوں کے حالات پر غور کرے، اس کے نزدیک جو متقی اور پرہیز گار زیادہ ثابت ہو اس کے فتوے کو ترجیح دے اور اسی پر عمل کرے، مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ محض ایک نظر میں سرسری طور پر دیکھنے سے یہ بات نہیں معلوم ہوسکتی اس کے لئے ضرورت ہے کہ کم از کم ایک ایک ہفتہ دونوں کے پاس بالکل خالی الذہن ہوکر رہو نہ ان کے معتقد بنو نہ مخالف بلکہ منصفانہ نظر سے دونوں کو دیکھتے رہو اور سفر وحضر خلوت وجلوت میں ان کے حالات میں غور کرتے رہو، اس میں اگر دیر لگے گی تو کچھ مضائقہ نہیں تم عنداللہ ماجور ہوگے، اتنے غور کے بعد ضرور تم پر حق واضح ہوجائے گا، طالب صادق کی تائید حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور اگر بالفرض تلاش سے بھی فیصلہ نہ ہوا اور کسی فریق کی ترجیح سمجھ میں نہ آوے اور تمہارے نزدیک دونوں علم وتقوی میں برابر ثابت ہوں تو اس صورت میں جس طرف دل گواہی دے اس طرف ہوجاؤ، بس جو کام تمہارے کرنے کا تھا تم کر چکے اب اگر غلطی بھی رہی تو تم معذور ہو، اس بات کو میں پھر دہرائے دیتا ہوں کہ اس طریق کے ہر جزو میں اس کا اہتمام ضروری ہے کہ محض طلب حق اور للّٰہیت رہے نفسانیت وغرض اور ضد نہ آنے پائے، یہ ممکن نہیں کہ اس طرح کوئی تلاشِ حق کرے اور اس کو حق نہ ملے، حق تو بہت واضح چیز ہے وہ کسی طرح چھپ ہی نہیں سکتا۔

ہاں اغراض وغیرہ سے اس پر پردہ ضرور پڑ جاتا ہے، جب اغراض وغیرہ کو آپ بالائے طاق رکھ دیں گے تو آپ کو حق بھی اور عالم حقانی بھی سب مل جائے گا، بس اس کا اتباع کیجئے اب یہ اتباع اس عالم کا اتباع نہ ہوگا بلکہ اتباع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوگا، غرض ہر بات میں اتباع کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خواہ بواسطہ ہو اور وہ واسطہ عالم حقانی ہے یا بلا واسطہ اور اس وقت تو بواسطہ ہی ہوسکتا ہے کیونکہ حضور دنیا میں تشریف فرما نہیں ہیں۔[1]

تحقیق کے بعد عوام جس کا بھی اتباع کریں گے کافی ہے

میں اس کی نظیر پیش کرتا ہوں (جس سے بات بالکل سمجھ میں آجائے گی) دیکھو! مسئلہ یہ ہے کہ اگر جنگل میں چار آدمی ہوں اور نماز کا وقت آجاوے اور قبلہ نہ معلوم ہو سکے تو ایسی حالت میں شرعاً جہتِ تحری قبلہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خوب سوچ لینا چاہئے جس طرف قبلہ ہونے کا ظن غالب ہو اسی طرف نماز پڑھ لینی چاہئے، اب فرض کیجئے کہ ان چاروں آدمیوں میں اختلاف ہوا ایک کی رائے پورب کی طرف، ایک کی پچھم جانب، ایک کی دکھن، ایک کی اتر طرف قبلہ ہونے کی ہوئی تو اب مسئلہ فقہ کا یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی رائے پر عمل کرنا چاہئے اور جس سمت کو اس کی رائے میں ترجیح ہو وہ اسی طرف نماز پڑھے، اگر دوسرے کی رائے کے موافق پڑھے گا تو نماز نہیں ہوگی خواہ وہ سمت واقع میں صحیح ہی کیوں نہ ہو، اب یہ بات صریحاً ظاہر ہے کہ سمت صحیح کی طرف ان چاروں میں سے ایک ہی کی نماز ہوئی ہوگی لیکن عنداللہ سب ماجور ہیں اور قیامت میں کسی سے یہ سوال نہ ہوگا کہ تم نے نماز غیر قبلہ کی طرف کیوں پڑھی تھی؟ جس کی یہ وجہ نہیں کہ سب نے نماز قبلہ ہی کی طرف پڑھی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ قبلہ چاروں سمتوں میں تو ہو نہیں سکتا لامحالہ ایک ہی طرف رہا ہوگا، بلکہ وجہ یہ ہے کہ سبھوں

[1] وعظ الصالحون ملحقہ اصلاح اعمال ص ۱۴۷، ۱۴۸ تا ۱۵۲

نے قصداتباع قبلہ ہی کا کیا ہے مگر صحیح سمت معلوم کرنے سے معذور رہے، جتنا ان کا اختیاری فعل تھا وہ انہوں نے ادا کر دیا، اس سے ثابت ہو گیا کہ اختلاف کی حالت میں جس کا بھی اتباع کیا جائے گا حق تعالیٰ کے نزدیک وہ مقبول ہے حتیٰ کہ اگر خطا پر بھی ہے تب بھی کوئی باز پرس نہیں بلکہ اجر ملے گا، تو ثابت ہو گیا کہ دین کے راستہ میں کوئی ناکام نہیں بلکہ اگر وہ مقلد ہے تو اس کو معذور سمجھا جائے گا اور اگر مجتہد ہے تو اس پر بھی ملامت نہیں بلکہ ایک اجر اس خطا کی صورت میں بھی ملے گا، تو دین میں کسی طرح بھی ناکامی نہ ہوئی حتی کہ خطا کی صورت میں بھی کامیابی ہی رہی، تو اب وہ حیلہ آپ کا کہ علماء میں اختلاف ہے، ہم کس کا اتباع کریں بالکل نہیں چل سکتا۔

علماء کے اختلاف کی صورت میں آپ جس کا بھی اتباع کریں گے تعمیل حکم ہو جائے گی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس بات میں اختلاف دیکھو بے سوچے سمجھے یا ہوائے نفسانی سے جس کا چاہو اتباع کر لو، مثلاً قادیانی اور سنی کا اختلاف دیکھو تو کیفما اتفق ایک فریق کو اختیار کر لو، قرآنی اور غیر قرآنی کا اختلاف دیکھو تو جس فریق کو چاہو اختیار کر لو یہ مطلب ہرگز نہیں، کیونکہ گفتگو ہے علماء حقانی کے اختلاف کے بارہ میں پہلے اس کی تحقیق کر لو کہ دونوں علماء حقانی ہیں یا نہیں؟ جب تحقیق ہو جاوے کہ دونوں حقانی ہیں تو اب دونوں کی اتباع میں گنجائش ہے، جس کی بھی موافقت کر لی جائے گی تعمیل حکم ہو جائے گی اور وہ موجب رضاء خدا ہو گی، اب آپ کہیں گے کہ ہم یہ کیسے تحقیق کریں کہ کون علماء حقانی ہیں، اس کے لئے میں بہت مختصر طریق بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ اپنے معاندانہ اعتراضات اور اغراض کو چھوڑ کر اور حق تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر اور دین کو ضروری سمجھ کر ان علماء کے حالات میں غور کیجئے، اگر آپ ایسا کریں گے تو عادۃً ممکن نہیں کہ نہ پہنچان سکیں کہ یہ علماء حقانی ہیں یا نہیں، دیکھو علاج کی ضرورت کے وقت اور قتل کے مقدمہ کی پیروی کے وقت آپ طبیبوں اور وکیلوں کی تلاش کرتے ہیں تو آپ کو

دو چار طبیب اور دو چار وکیل قابل اطمینان ضرور مل جاتے ہیں اور وہ سب قابل اعتماد ہوتے ہیں لیکن اس وقت بھی آپ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کرتے کہ ان سب قابل اعتماد لوگوں میں سے ایک کو چھانٹ کر علاج اور مقدمہ کی پیروی اس کے سپرد کر دیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ طبیب یا وکیل تو ہم نے کامل اور قابل اطمینان ڈھونڈ لیا ہے اب صحت ہونا یا پھانسی کے مقدمہ سے بری ہونا تقدیر کے اوپر منحصر ہے، اسی طرح دین کے لئے جتنی کوشش آپ کے امکان میں ہے وہ کر کے علماء حقانی کو تلاش کر لیجئے اور ان کے اختلاف کی صورت میں کسی ایک کے قول کو لے لیجئے جس کے متعلق دل زیادہ گواہی دیتا ہو، اور بلا چون و چرا اس قول کا اتباع کر لیجئے۔

(خلاصہ یہ کہ) اگر علماء میں اختلاف ہو تو آپ کو گنجائش ہے کہ اس مسئلہ میں کسی کا بھی اتباع کر لیں یہ اختلاف برا نہیں بلکہ عنداللہ دونوں مقبول اور ماجور ہیں۔حق تعالیٰ کے یہاں دونوں اسی طرح ماجور ہیں جیسے جہت تحری کی طرف دونوں مختلف سمتوں کے نماز پڑھنے والے کہ کسی پر ملامت نہیں، غرضیکہ علماء کا ایسا اتباع بعینہٖ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے اور علماء حضور کے نائب ہیں اور یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر یاد دلاتا ہوں کہ علماء سے مراد علماء حقانی ہیں کیونکہ علماء بھی دو قسم کے ہیں ایک علماء حقانی دوسرے علماء شیطانی علماء حقانی کے کچھ اوصاف میں اوپر بیان کر آیا ہوں مختصرا پھر بھی بیان کئے دیتا ہوں علماء حقانی وہ ہیں جو اپنی رائے اور اغراض کو حق تعالیٰ کے حکم کے سامنے بالکل فنا کر چکے ہوں اور ان کے نزدیک اس حکم کے مقابلہ میں دنیا و مافیہا کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

بس خلاصہ تمام اوصاف کا یہ ہے اور جو اپنی اغراض وہوائے نفسانی کے بندے ہوں وہ اس قابل بھی نہیں کہ ان کو عالم کہا جائے، حق بات وہ کبھی کہہ ہی نہیں سکتے، بلکہ وہ حق بات کو سمجھ بھی نہیں سکتے کیونکہ جب تک اغراض باقی رہتے ہیں تو علم

قلب میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ اغراض کے سبب قلب کے اوپر پردہ پڑ جاتا ہے۔[1]

احکام میں علماء کا اختلاف رحمت ہے ان سے بدگمان نہ ہونا چاہئے

علماء امت کے درمیان رایوں اور اس کی بناء پر اجتہادی مسائل میں اختلاف ایک امر فطری ہے اور حضرات صحابہ، تابعین کے زمانہ سے ہوتا چلا آیا ہے ایسے اختلاف کو حدیث میں رحمت کہا گیا ہے مگر آج کل لوگوں نے اس اختلاف کو بھی طبقۂ علماء سے بدگمانی پیدا کرنے کے کام میں استعمال کر رکھا ہے اور سیدھے سادھے عوام ان کے مغالطہ میں آ کر یہ کہنے لگے کہ جب علماء میں اختلاف ہے تو ہم کدھر جائیں، حالانکہ دنیا کے کاموں میں جب بیماری کے علاج میں ڈاکٹروں حکیموں کے درمیان اختلاف ہوتا ہے تو اس میں عمل کے لیے سب اپنا راستہ تلاش کر لیتے ہیں اور اس اختلاف کی بناء پر سب ڈاکٹروں اور حکیموں سے بدگمان نہیں ہو جاتے۔[2]

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! فلاں مسئلہ کے متعلق علماء میں اختلاف ہے ایک کہتا ہے کہ یہ کام بدعت ہے اگر کیا گیا تو عذاب ہے دوسرا کہتا ہے کہ نہیں بدعت حسنہ ہے تو اسکے کرنے میں ثواب ہے تو ایسے موقع پر ہم کیا کریں اور کس کا اتباع کریں، بڑی پریشانی کی بات ہے۔

اس کے متعلق حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ پریشانی کی کیا بات ہے ان لوگوں کو چاہئے کہ اس کی تحقیق کریں کہ حق کس جانب ہے؟ جو عالم اس مسئلہ میں حق پر ہو بس اس مسئلہ میں اس کے قول پر عمل کریں۔ اور اگر اپنے اندر اتنی لیاقت نہ دیکھیں کہ یہ معلوم کر سکیں کہ کون عالم حق پر ہے یا ان کو اتنی فرصت نہیں کہ حق کی تحقیق کر سکیں تو پھر ان لوگوں کو چاہئے کہ احتیاط پر عمل کریں اور وہ احتیاط یہ ہے کہ عقیدہ تو یہ رکھیں کہ اللہ اعلم یعنی اللہ ہی بہتر جانتے ہیں کہ کون سی بات حق ہے، اور عمل یہ رکھیں کہ جس کے جائز

---

[1] وعظ الصالحون ص ۱۴۲ ملحقہ اصلاح اعمال، اصلاح انقلاب ص ۱۳۱ [2] مجالس حکیم الامت ص ۲۳۹۔

ناجائز ہونے میں اختلاف ہواس کو ترک کردیں کیونکہ اس کے ترک کردینے میں زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اس فعل کا ثواب نہ ملے گا تو خیر اور بہت سی باتوں سے ثواب حاصل ہوسکتا ہے لیکن اس کام کو اگر کیا تو کرنے میں عذاب ہوگا، پس اس احتیاط میں گو کچھ ثواب میں کمی ہو جائے مگر عذاب سے تو بچ جائے گا[1]

مفتی کے فتوے پر بغیر دلیل معلوم کئے عمل کرنا جائز ہے

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
جس شخص کو بے تحقیق کوئی فتویٰ دیدے تو اس کا گناہ اس فتویٰ دینے والوں کو ہوگا (ابوداؤد)

فائدہ: دیکھئے اگر تقلید جائز نہ ہوتی اور کسی کے فتویٰ پر بدوں معرفتِ دلیل کے عمل جائز نہ ہوتا جو حاصل ہے تقلید کا تو گنہگار ہونے میں مفتی کی کیا تخصیص؟ بلکہ جس طرح مفتی کو غلط فتویٰ بتلانے کا گناہ ہوتا اسی طرح سائل کو دلیل تحقیق نہ کرنے کا گناہ ہوتا[2]

علماء کے اختلاف کے وقت عوام کے لئے دستور العمل

سلامتی اسی میں ہے کہ جس کام میں کھٹک ہو اور جس میں علماء کا اختلاف ہو، اس کو ترک کردو، جب کہ جواز وعدم جواز ہی میں اختلاف ہو اور اگر فرض وحرام میں اختلاف ہو، تو وہاں اس شخص کا اتباع کرو جس پر زیادہ اعتقاد ہو جیسے فاتحہ خلف الامام کہ اس میں صوفیہ حنفیہ اپنے امام کے قول کو نہیں چھوڑتے کیونکہ گو امام شافعیؒ قراءت خلف الامام کو فرض کہتے ہیں مگر امام ابوحنیفہؒ مکروہ تحریمی کہتے ہیں۔

باقی جن مسائل میں جواز وعدم جواز کا فتوی ہو، ان میں صوفیاء کا بھی یہی عمل ہے کہ وہ اس فعل کو ترک کردیتے ہیں، اسی واسطے کہا جاتا ہے **الصوفی لامذھب له**

[1] الافاضات الیومیہ ۱۰/۱۵۰-۱۵۱۔ [2] الاقتصاد ص ۱۱

یہ مطلب نہیں کہ صوفی لامذہب ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ محتاط ہوتا ہے اور ہر مسئلہ میں احتیاط کی جانب کو اختیار کرتا ہے ورع اور تقویٰ اسی کا نام ہے، ہمارے فقہاء نے بھی اس کی تصریح کی ہے: رِعَایَةُ الْخِلافِ وَالْخُرُوْجُ مِنْهُ اَوْلٰی مَالَمْ یَرْتَکِبْ مَکْرُوْہَ مَذْھَبِہٖ. کہ اختلاف سے بچنا مستحب ہے جب تک کہ اپنے مذہب کے کسی مکروہ کا ارتکاب نہ ہو۔[1]

"استفت بالقلب" کی تشریح اور اس کا محل وموقع

جہاں تاویل کی صحت کا احتمال بھی ہو مگر دل قبول نہ کرے وہاں بھی اس پر عمل نہ کیا جائے، ایسے ہی مواقع کے لئے یہ حکم ہے۔

استفت قلبک ولو افتاک المفتون کہ باطنی مفتی (یعنی قلب کی شہادت) کے خلاف ظاہری مفتی کا قول نہ لیا جائے خصوصاً جب کہ مفتی خود مفتون ہو، وہاں تو فتووں پر اعتماد ہی نہ کرنا چاہئے بلکہ فتوی کے ساتھ اپنے دل کو بھی دیکھو کہ وہ کیا کہتا ہے، جب دل کو لگتی ہے اس وقت جواز کے سارے فتوے رکھے رہ جاتے ہیں اور اس وقت تک چین نہیں ملتا جب تک کہ کھٹک کی بات کو دور نہ کیا جائے۔[2]

حضرت نواس بن سمعانؓ سے روایت ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے متعلق سوال کیا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ (بڑی) نیکی حسن خلق ہے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تم اس پر لوگوں کے مطلع ہونے کو ناگوار سمجھو (روایت کیا اس کو مسلم وترمذی نے)۔

حدیث میں گناہ سے مراد وہ امور ہیں جن کے گناہ ہونے کی کوئی نص نہیں مگر کسی کلیہ سے اس میں گناہ ہونے کا شبہ ہو جاوے تو ایسے امور کے لئے آپ نے یہ پہچان بتلائی اور یہ پہچان اسی قلب کے اعتبار سے ہے جو سلیم ہو چنانچہ صحابی کا مخاطب ہونا اس کا قرینہ ہے۔

---

[1] ارضاء الحق ملحقہ رضا وتسلیم ص ۸۹ [2] ارضاء الحق ملحقہ تسلیم ورضاء ۱۵/۹۴، ۹۶

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض امور غیر منصوصہ عملیہ میں مسلم کامل کے قلب کا حکم معتبر اور جائز العمل ہے۔[1]

حق تک پہنچنے کے لئے دعا کی ضرورت اور اس کا فائدہ

ایک نومسلم کا بیان ہے کہ جب میں نے مذہب حق کو تلاش کرنا شروع کیا تو مجھے ہر مذہب میں حق کی جھلک نظر آتی تھی جس سے میں پریشان ہوگیا آخر میں نے یوں دعا کی کہ اگر آسمان وزمین کا پیدا کرنے والا کوئی ہے تو میں اس سے دعا کرتا ہوں کہ مجھ پر حق واضح ہوجائے بس یہ دعا کرتے ہوئے دو چار دن نہ گزرے تھے کہ اسلام کا حق ہونا مجھے واضح ہوگیا، اگر دعا کے بعد بھی کس پر حق واضح نہ ہو جب بھی اس کو ترک نہ کرے کیوں کہ اس وقت دعا کا یہی فائدہ ہوگا کہ اس سے دل میں قوت پیدا ہوگی، قلب کو راحت وسکون ہوگا اور یہ بھی مطلوب ہے۔

اور دعاء سے راحت قلب ضرور حاصل ہوتی ہے میں اس پر حلف کرسکتا ہوں نیز حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ''اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب'' علاوہ قوت قلب کے اس میں ایک نفع یہ ہے کہ یہ شخص حق تعالیٰ کے یہاں معذور سمجھا جائے گا کیونکہ جب اس سے سوال ہوگا کہ تم نے حق کا اتباع کیوں نہیں کیا؟ یہ کہہ دے گا کہ میں نے طلبِ حق کے لئے بہت سعی کی اور اللہ تعالیٰ تو ایک ہی تھے میں نے ان سے بھی عرض کردیا تھا کہ مجھ پر حق واضح کردیا جائے اب میں دوسرا ہادی کہاں سے لاتا اور یہ بات میں نے علی سبیل التنزیل کہی ہے کہ اگر دعا کے بعد بھی حق واضح نہ ہوا تو قلب کو قوت تو حاصل ہوگی اور خدا کے یہاں معذور تو ہوجائے گا، ورنہ عادۃ اللہ یہی ہے کہ جو شخص دل سے دعا کرتا ہے وضوح حق اس پر واضح ہو ہی جاتا ہے اس کے خلاف ہوتا ہی نہیں پس دعاء کو ہرگز ترک نہ کیا جائے۔[2]

---

[1] التکشف عن مہمات التصوف ص ۳۰۶ [2] الارتیاب والاغتیاب ملحقہ اصلاح اعمال ص ۵۱۰

فتویٰ لینے میں ایک عالم ومفتی کو متعین کرنے کی ضرورت ومصلحت

مناسب یہ ہے کہ زندہ لوگوں میں سے ایک شخص کو اپنی متبوعیت (پیروی) کے لئے پسند کر لیجئے اور میں یہ بہت فائدہ کی بات بتلاتا ہوں، تجربہ سے معلوم ہے کہ سلامتی اسی کے اندر ہے، گواہل انابت (اور مقتدا) متعدد ہوں مگر متبوع ان میں سے ایک کو بنالیا جائے اور اسی کے سبیل (طریقے اور کہنے) کا اتباع کیا جائے۔

پس اب ان میں سے ایک کو ترجیح دینے کا طریقہ معلوم ہونا چاہئے سو وہ یہ ہے کہ جس کی انابت زیادہ ہو، یعنی یہ دیکھ لیجئے کہ اس کا علم کیسا ہے، تقویٰ کی کیا حالت ہے، پھر دیکھئے کہ نسبت مع اللہ کیسی ہے، اور یہ معلوم ہوگا اس کی صحبت میں رہنے سے، یعنی اگر اس کے پاس بیٹھنے سے دنیا کی محبت کم ہو تو سمجھو کہ اس کی نسبت کامل ہے اور وہ متبوع بنانے کے قابل ہے، اور اگر اپنے اندر اثر محسوس نہ ہو تو اس کے پاس رہنے والوں کو دیکھے کہ ان لوگوں کی حالت کیسی ہے؟ اگر ان میں سے اکثر کی حالت اچھی دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ شخص کامل ہے۔

سلف کی (اگرچہ) یہی حالت تھی کہ کبھی امام ابوحنیفہؒ سے پوچھ لیا کبھی اوزاعیؒ سے، اور اسی سلف کی حالت دیکھ کر آج بھی لوگوں کو یہ لالچ ہوتا ہے، سو فی نفسہٖ تو یہ جائز ہے مگر ایک عارض کی وجہ سے ممنوع ہو گیا ہے۔

اس کے سمجھنے کے لئے اول ایک مقدمہ سن لیجئے، وہ یہ کہ حالتِ غالبہ کا اعتبار ہوتا ہے سو حالتِ غالبہ کے اعتبار سے آج میں اور اُس وقت میں یہ فرق ہے کہ اس وقت کے لوگوں میں تدیّن (یعنی دین اور تقویٰ) غالب تھا، ان کا مختلف لوگوں سے پوچھنا یا تو اتفاقی طور پر ہوتا تھا اور یا اس لئے کہ جس کے قول میں زیادہ احتیاط ہوگی اس پر عمل کریں گے، پس اگر تدیّن کی اب بھی وہی حالت ہوتی تو ایک کو خاص کرنے اور اس کی تقلید کرنے کی ضرورت نہ تھی، مگر اب تو وہ حالت ہی نہیں رہی اور کیسے رہتی، حدیث میں

ہے ثُمَّ یَفْشُو الْکِذْبُ کہ خیرالقرون کے بعد کِذب (جھوٹ) پھیل جائے گا اور لوگوں کی حالت بدل جائے گی سو جتنا خیرالقرون سے بُعد (فاصلہ زیادہ) ہوتا گیا اتنی ہی لوگوں کی حالت ابتر ہوتی گئی، اب تو وہ حالت ہوگئی ہے کہ عام طور پر غرض پرستی غالب ہے، اب مختلف لوگوں سے اس لئے پوچھا جاتا ہے کہ جس میں اپنی غرض نکلتی ہوگی اس پر عمل کریں گے۔۔۔۔۔ جیسے کہ مجتہدین کی تقلید شخصی میں یہ حکمت ہے اسی طرح اس مذہب کے علماءِ اخیار میں سے ایک ہی (عالم و مفتی یا دارالافتاء کو مسئلہ پوچھنے اور فتویٰ لینے کے لئے) متعین کر لینے میں یہی حکمت ہے کیونکہ زمانہ کی حالت بدل گئی ہے کہ لوگوں میں غرض پرستی غالب ہے، اور ایک مذہب کے علماء میں بھی آپس میں مسائل کے اندر اختلاف ہے پس اگر ایک عالم کو متعین نہ کیا جائے گا، تو اس کے اندر بھی اندیشہ ہے کہ کہیں غرض پرستی میں نہ پڑ جائیں کہ جس عالم کی رائے نفس کے موافق ہوئی اس کو مان لیا اور جس کی رائے نفس کے خلاف ہوئی اس کو نہ مانا، اور اس اختلاف علماء ہی کی وجہ سے عام لوگ یہ شبہ کرنے لگے ہیں کہ صاحب ہر مولوی کی جدا رائے ہے، ہم کدھر جائیں؟ مگر اس کا تو میرے پاس ایسا جواب ہے کہ اس کا کسی سے رد ہی نہیں ہو سکتا۔

وہ یہ کہ طبیب کے پاس بھی تو آخر جاتے ہی ہو ان میں بھی تو آپس میں اختلاف ہوتا ہی ہے، تو جس طرح ان کاموں میں ایک کو منتخب کر لیتے ہو، اسی طرح یہاں کیوں پریشانی ہے کہ کس کا کہنا مانیں، اس کا بھی یہی انتظام کر لو کہ ایک عالم اور ایک شیخ کو منتخب کر لو، پس ہر شخص کو اکثر دو آدمیوں کے متعین کرنے کی ضرورت ہوگی، ایک عالم کی اور ایک شیخ کی، کیونکہ دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک اعمال صالحہ کی اور ایک اس کی تکمیل کی، پس دو شخصوں سے تعلق پیدا کرو، عالم سے تو اعمال صالح سیکھو اور شیخ سے اس کی تکمیل کرو اور اگر کوئی جامع مل جائے جس سے دونوں چیزیں حاصل ہو جائیں تو خوش قسمتی ہے، اگر پریشانی سے اپنی نجات چاہتے ہو تو ایسا کرو، اور اس کی ہی سخت ضرورت ہے۔

پھر ہر ایک امر میں جوشبہ ہواس سے پوچھ لو، جوکام کرنا چاہو پہلے اس سے پوچھ لو، اگر وہ جائز بتلائے تو کرو ورنہ نہیں اور یہ بھی سمجھ لو کہ باتیں دوقسم کی پوچھی جاتی ہیں، ایک تو احکام دوسرے اس کے دلائل، جو بات وہ بتلائے اگر اس کی دلیل تمہاری سمجھ میں نہ بھی آئے تب بھی اس شخص کی اطاعت نہ چھوڑو بلکہ اس کی بات بلا دلیل مان لو، دنیاوی امور میں بھی عقلاء کا یہی طریقہ ہے، آخر سول سرجن کا قول مان لیتے ہو، کچھ اگر مگر نہیں کرتے گو دلیل نہ سمجھ میں آئے، اسی طرح دین میں جس کو متبوع قرار دو (یعنی جس پر اعتماد کرو) اس سے زیادہ گڑبڑ نہ کرو، زیادہ محقق نہ بنو، عمل کرو، اگر محقق بننے کا شوق ہو تو مدرسہ میں آکر پڑھو، غرضیکہ ایک شخص کو متبوع مقرر کر لینے میں بہت پریشانیوں سے بچ جاؤ گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے اس مسئلہ مختلف فیہا کا جو آج کل بہت معرکۃ الآراء سمجھا جاتا ہے فیصلہ کیا ہے اور دونوں مرضوں کا علاج کیا ہے، خودرائی کا بھی اور عدم معیار کا بھی جس کا حاصل یہ ہے کہ اتباع کرو سبیلِ حق کا مگر مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ کے واسطے سے (یعنی ان لوگوں کے واسطے سے جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتے ہیں) اور گو مَن اناب میں متعدد اشخاص کے اتباع کرنے کا مضائقہ نہ تھا، لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ ایک کے متعین کر لینے میں راحت اور انتظام اور نفس کی حفاظت ہے، پس اس زمانہ میں علماء اور مشائخ کو اس معیار سے جانچئے، اگر کوئی جامع مل جائے تو ایک کو ورنہ دو کو منتخب کر کے ان کا اتباع کیجئے۔

اگر دین پر چلنا چاہتے ہو تو اس کا یہ طریقہ ہے ورنہ اس کے بغیر آج کل دین سالم رہنے کا کچھ اعتبار نہیں، جو شخص اس طریقہ کے خلاف کرے گا، کچھ تعجب نہیں کہ وہ دین سے بہک جائے، میں نے ایک ایسی بات بتلادی ہے کہ عمر بھر کے لئے دستور العمل بنانے کے قابل ہے، اور جو اس پر عمل کرے گا اس کو کبھی گمراہی نہ ہوگی۔[1]

---

[1] اتباع المنیب ملحقہ نظام شریعت ص ۲۳۳، ۲۳۸ تا ۲۴۰

عوام کے لیے ضروری دستور العمل

۱- سب سے پہلے کسی شخص کی حالت کو خوب جانچ لو، خوب امتحان کرلو، جب اس کے علم وعمل پر کافی اطمینان ہوجائے اب اس سے پوچھ پوچھ کر عمل کرلو، اور فضول باتیں نہ پوچھو۔

۲- اور یہ یاد رکھو کہ اچھی طرح جانچے ہوئے بغیر کسی کو اپنا بڑا نہ بناؤ کیونکہ دین بڑی قدر کے قابل چیز ہے اس لیے ہر کس وناکس کو رہنما نہ بناؤ لیکن جب کسی کا محقق ہونا ثابت ہوجائے پھر اس سے حجت نہ کرو جو بتلادے اسی پر عمل کرو۔

۳- اپنا دستور العمل یہ رکھئے، بقدر ضرورت احکام کا علم حاصل کیجئے جس کی صورت یہ ہے کہ جو دینی رسائل محققین کی تصنیف سے ہیں ان کو مطالعہ میں رکھئے اور دوران مطالعہ جہاں شبہ ہو وہاں نشان بناتے رہیں اور بعد میں ان مشتبہ مقامات کو کسی محقق سے زبانی حل کرلیں اور جو ان پڑھ ہیں وہ ان رسالوں کو سن لیا کریں۔

۴- ایک تو اس کا التزام کریں دوسری بات یہ کرو کہ جو کام کرنا ہو خواہ نوکری یا ملازمت یا تجارت یا شادی یا غمی سب کے متعلق پہلے کسی محقق سے شرعی حکم دریافت کرلو، اگر چہ عمل کی بھی توفیق نہ ہو دریافت کرلینے سے کم سے کم یہ فائدہ ہوگا کہ اس کے جائز ناجائز ہونے کا تو علم ہوجائے گا۔

ممکن ہے کہ یہ علم کسی وقت اس سے بچنے کی ہمت پیدا کردے اور اگر مبتلا ہی رہے تو حرام کو حلال سمجھ کر تو نہ کروگے [۱]

۵- جو ضرورت پیش آتی جائے کاملین سے اس کے متعلق استفتاء کرلیں، اس وقت تو کلکتہ (کیا کسی بھی دوسرے شہر اور ملک) تک سے ہر بات بذریعہ خط (یا آج کل موبائل، انٹرنیٹ وغیرہ کے ذریعہ آسانی سے) دریافت ہوسکتی ہے۔

---

[۱] التبلیغ اسباب الفتنہ ص ۱۲۳۔

ہوجائیں گے پھر ایک سوال میں ان کی کتنی تعداد ہوجائے گی اور چند سال میں ایک معتد بہ ذخیرہ ہوجائے گا، یہ ان کے لیے ہے جو پڑھے لکھے ہیں اور جو حرف شناس نہیں ہیں ان کے لیے یہ کیا جائے کہ کسی شخص کو مقرر کیا جائے جو ان کو ہر ہفتہ مسائل سنادیا کرے، اور یہ لوگ اپنی عورتوں کو سنادیا کریں مگر اس کے لیے ایک مرکز کی ضرورت ہوگی وہ اس کو اپنے ذمہ لے لے اور وہ کوئی عالم ہونا چاہئے اس کا کام یہ ہو کہ محض مسائل کا وعظ کہا کرے لوگ اس کی طرف توجہ کریں اور ہمت کر کے ایک مولوی کو مناسب معاوضہ پر اس کام کے لیے رکھ لیں۔

۶- اور ایک اس کا التزام ہو کہ جب کبھی فرصت اور مہلت ہوا کرے تو ایسے بزرگوں سے ملتے رہا کرو اور ان سے ڈرو نہیں کہ ہمارے افعال پر لتاڑ دیں گے ہرگز نہیں، وہ تمہارے سامنے منہ توڑ کر کوئی جواب نہ کہیں گے۔

ایسے بزرگوں کی صحبت سے تمہاری حالت انشاء اللہ خود بہ خود درست ہوتی چلی جائے گی۔

یہ ہے وہ دستور العمل جو دل پر سے پردے اٹھاتا ہے جس کے چند اجزاء ہیں (۱) کتابیں دیکھنا (۲) دوسرے مسائل دریافت کرنا (۳) تیسرے اہل اللہ کے پاس آنا جانا (۴) اور اگر ان کی خدمت میں آمدورفت نہ ہو سکے تو بجائے ان کی صحبت کے ایسے بزرگوں کی حکایات وملفوظات ہی کا مطالعہ کرو یا سن لیا کرو (۵) اور اگر تھوڑی دیر ذکر اللہ بھی کرلیا کرو، تو یہ اصلاح قلب میں بہت ہی معین ومددگار رہے (۶) اور کچھ وقت محاسبہ کے لیے نکال لو جس میں اپنے نفس سے باتیں کرو کہ ایک دن دنیا سے جانا ہے، مال ودولت سب مجھے چھوڑ دیں گے۔[1]

---

[1] دعوات عبدیت ازالۃ الفتنہ ۱۰/۱۱۷۔

مستفتیوں کے لئے چند ضروری ہدایات وآداب

۱- اپنا دستور العمل اس باب میں یہ رکھیں کہ:

جب کوئی ضروری بات پیش آئے اپنے عمل کرنے کے لیے نہ کہ مباحثہ کرنے کے لیے تو ایسے شخص سے مسئلہ پوچھیں جس کا معتبر ومحقق ہونا صحیح ذریعہ سے معلوم ہوا اور اس پر اعتماد بھی ہو۔

۲- اور دلیل دریافت نہ کریں۔

۳- اور کسی اور عالم سے (وہی مسئلہ) بلاضرورت نہ پوچھیں۔

۴- اور اگر جواب میں شبہ رہے اور شفا نہ ہو تو ایسے ہی صفت کے دوسرے عالم سے پوچھ لیں۔

۵- اگر جواب پہلے کے خلاف ہو تو پہلے (مفتی) کا جواب اس کے (دوسرے مفتی کے) سامنے اور اس کا جواب پہلے کے سامنے نقل نہ کریں اور جس قول پر قلب مطمئن ہو اس پر عمل کریں [۱]

استفتاء لکھنے کے آداب

اور اگر استفتاء تحریراً ہو تو ان رعایات کے علاوہ اور بھی بعض رعایتوں کا لحاظ رکھیں:

۱- سوال کی عبارت اور خط بہت صاف ہو۔

۲- حتی الامکان فضول غیر متعلق باتیں اس میں نہ لکھیں۔

۳- اپنا پتہ اور نام صاف لکھیں۔

۴- اگر کئی بار ایک ہی جگہ استفتاء لے جائیں تب بھی ہر خط میں پتہ ونام صاف لکھیں۔

---

[۱] اصلاح انقلاب ص:۳۱

۵- جواب کے لیے ٹکٹ (جوابی لفافہ) ضرور رکھ دیا کریں۔

٦- اگر سوال دستی بھی ہو تو تب بھی جواب کے لیے ٹکٹ (دستی لفافہ) رکھ دیں اور اپنا پورا پتہ لکھ دیں شاید اس وقت جواب مسئلہ کا نہ دے سکیں تو بعد میں بھیج دیں گے ورنہ ٹکٹ واپس آجائے گا۔

۷- اور اگر کئی سوال ہوں تو کارڈ پر نہ بھیجا کریں۔

۸- اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہو جائے تو ان سوالوں پر نمبر ڈال کر ان کی ایک نقل اپنے پاس بھی رکھ لیں اور مکتوب الیہ (مفتی) کو اطلاع دیں کہ ہمارے پاس سوالات کی نقل نمبروار ہے آپ اعادۂ سوال کی تکلیف نہ کریں۔ نمبروں کی ترتیب سے صرف جواب لکھ دیں۔[1]

متفرق آداب

۹- جلد جواب تحریر کرنے پر مجبور نہ کریں۔[2]

۱۰- استفتاء میں حاکمانہ لہجہ سے گریز کریں۔[3]

۱۱- غیر ضروری اور فرضی مسائل سے اجتناب کریں۔[4]

۱۲- سوال پورا اور بالکل واضح ہو، مجمل اور ادھورا نہ ہو۔[5]

۱۳- حتی الامکان سوال تحریری لکھ کر معلوم کریں زبانی دریافت کرنے سے گریز کریں۔[6]

۱۴- علماء سے صرف مسائل شرعی پوچھے جائیں ان کے ذاتی افعال کی تحقیق سے گریز کریں۔[7]

۱۵- عمل کی نیت سے مسئلہ دریافت کریں محض مشغلہ مقصود نہ ہو۔[8]

---

[1] اصلاح انقلاب ۱/۳۲ [2] الافاضات الیومیہ ۵/۲۷، مطبوعہ کراچی۔ [3] ایضاً ص ۴۵ [4] ایضاً ص ۴۵۔ [5] ایضاً ۵/۱۵۲۔ [6] الافاضات الیومیہ ص ۱۱۲، مطبوعہ کراچی۔ [7] ایضاً ص ۲۶۴۔ [8] ایضاً، ماخوذ از رسالہ البلاغ شمارہ: ۱۰، شوال ۱۴۰۳ھ۔

ضمیمہ

آداب المستفتی (از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

عوام الناس پر علماء ومفتیوں سے مسئلہ معلوم کر کے عمل کرنا اوران کی تقلید کرنا واجب ہے

فَاسْئَلُوا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ۔ (سورہ نحل)

(اگر تم کو علم نہیں ہے تو دوسرے اہل علم سے پوچھو) یہ اہم ضابطہ ہے جو عقلی بھی ہے نقلی بھی کہ جو لوگ احکام نہیں جانتے وہ جاننے والوں سے پوچھ کر عمل کریں اور نہ جاننے والوں پر فرض ہے کہ جاننے والوں کے بتلانے پر عمل کریں، اسی کا نام تقلید ہے، یہ قرآن کا واضح حکم بھی ہے اور عقلاً بھی اس کے سوا عمل کو عام کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی، امت میں عہد صحابہ سے لے کر آج تک بلا اختلاف اسی ضابطہ پر عمل ہوتا آیا ہے، جو تقلید کے منکر ہیں وہ بھی اس تقلید کا انکار نہیں کرتے کہ جو لوگ عالم نہیں وہ علماء سے فتویٰ لے کر عمل کریں۔[1]

(مسئلہ) تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت (فَسْئَلُوا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ) سے معلوم ہوا کہ جاہل آدمی جس کو احکام شریعت معلوم نہ ہوں اس پر عالم کی تقلید واجب ہے کہ عالم سے دریافت کر کے اس کے مطابق عمل کرے۔[2]

دلائل کی حاجت نہیں

اور یہ ظاہر ہے کہ ناواقف عوام کو علماء اگر قرآن وحدیث کے دلائل بتلا بھی دیں تو وہ ان دلائل کو بھی انہی علماء کے اعتماد پر قبول کریں گے، ان میں خود دلائل کو

[1] معارف القرآن ج۵ ص۳۳۳ سورہ نحل پ۱۴ [2] معارف القرآن سورہ انبیاء پ۱۷ ج۶ ص۱۵۹

سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت تو ہے نہیں اور تقلید اسی کا نام ہے کہ نہ جاننے والا کسی جاننے والے کے اعتماد پر کسی حکم کو شریعت کا حکم قرار دے کر عمل کرے، یہ تقلید وہ ہے جس کے جواز بلکہ وجوب میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔[1]

بلاضرورت سوال کرنے کی ممانعت

یا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَاءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ۔(مائدہ پ۷)

ان آیات میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بعض لوگوں کو احکام الٰہیہ میں بلا ضرورت تدقیق اور بال کی کھال نکالنے کا شوق ہوتا ہے اور جو احکام نہیں دیئے گئے ان کے متعلق بغیر کسی داعیۂ ضرورت کے سوالات کیا کرتے ہیں، اس آیت میں ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ ایسے سوالات نہ کیا کریں جن کے نتیجہ میں ان پر کوئی مشقت پڑ جائے یا ان کو خفیہ رازوں کے اظہار سے رسوائی ہو۔[2]

فتویٰ لینے اور مسئلہ پوچھنے سے پہلے مستفتی کی ذمہ داری

سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ۔(مائدہ پ۶)

اس میں مسلمانوں کے لیے ایک اہم اصولی ہدایت یہ ہے کہ اگرچہ جاہل عوام کے لیے دین پر عمل کرنے کا راستہ صرف یہی ہے کہ علماء کے فتوے اور تعلیم پر عمل کریں لیکن اس ذمہ داری سے عوام بھی بری نہیں کہ فتویٰ لینے اور عمل کرنے سے پہلے اپنے مقتداؤں کے متعلق اتنی تحقیق تو کرلیں جتنی کوئی بیمار کسی ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کرنے سے پہلے کیا کرتا ہے کہ جاننے والوں سے تحقیق کرتا ہے کہ اس مرض کے لیے کون سا ڈاکٹر ماہر ہے، کون سا حکیم اچھا ہے اس کی ڈگریاں کیا کیا ہیں؟ اپنی مقامی تحقیق

---

[1] معارف القرآن ج۵ص۳۳۳ سورہ نحل پ۱۴ [2] معارف القرآن ، مائدہ ص:۲۴۵ جلد۳۔

کے بعد بھی اگر وہ کسی غلط ڈاکٹر یا حکیم کے جال میں پھنس گیا یا اس نے کوئی غلطی کر دی تو عقلاء کے نزدیک وہ قابل ملامت نہیں ہوتا لیکن جو شخص بلا تحقیق کسی عطائی کے جال میں جا پھنسا اور پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہوا تو وہ عقلاء کے نزدیک خود اپنی خودکشی کا ذمہ دار ہے۔

یہی حال عوام کے لیے دینی امور کے بارے میں ہے کہ اگر انہوں نے اپنی بستی کے اہل علم وفن اور تجربہ کار لوگوں سے تحقیق حال کرنے کے بعد کسی عالم کو اپنا مقتدیٰ بنایا اور اس کے فتویٰ پر عمل کیا تو وہ عندالناس بھی معذور سمجھا جائے گا اور عند اللہ بھی۔

ایسے ہی معاملہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **فان اثمہ علی من افتی** یعنی ایسی صورت میں اگر عالم اور مفتی نے غلطی کر لی اور کسی مسلمان نے ان کے غلط فتوے پر عمل کر لیا تو اس کا گناہ اس پر نہیں بلکہ اس عالم اور مفتی پر ہے اور وہ بھی اس وقت جب کہ اس عالم نے جان بوجھ کر ایسی غلطی کی ہو، یا امکانی غور وخوض میں کمی کی ہو، یا یہ کہ وہ عالم ہی نہ تھا اور لوگوں کو فریب دے کر اس منصب پر مسلط ہو گیا۔

لیکن اگر کوئی شخص بلا تحقیق محض اپنے خیال سے کسی کو عالم یا مقتداء قرار دے کر اس کے قول پر عمل کرے اور وہ فی الواقع اس کا اہل نہیں تو اس کا وبال تنہا اس مفتی وعالم پر نہیں ہے بلکہ یہ شخص بھی برابر کا مجرم ہے جس نے تحقیق کئے بغیر اپنے ایمان کی باگ ڈور کسی ایسے شخص کے حوالے کر دی، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ ارشاد خداوندی ہے: سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ ، یعنی یہ لوگ جھوٹی باتیں سننے کے عادی ہیں، اپنے مقتداؤں کے علم وعمل اور امانت ودیانت کی تحقیق کئے بغیر ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور ان سے موضوع اور غلط روایات سننے اور ماننے کے عادی ہو گئے ہیں۔[1]

---

[1] معارف القرآن، سورۂ مائدہ ۱۴۹/۳۔

علماء ومشائخ اور مفتیان کرام کا ادب واحترام ضروری ہے کیونکہ وہ نائب رسول اور نبی کے جانشین ہیں

یَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوْلا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ،

''بین الیدین'' کے اصل معنی دو ہاتھوں کے درمیان کے ہیں، مراد اس سے سامنے کی جہت ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تقدّم اور پیش قدمی نہ کرو، کس چیز میں پیش قدمی کو منع فرمایا ہے قرآن کریم نے اس کو ذکر نہیں کیا جس میں اشارہ عموم کی طرف ہے کہ کسی قول یا فعل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیش قدمی نہ کرو ، بلکہ انتظار کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا جواب دیتے ہیں، ہاں آپ ہی کسی کو جواب کے لئے مامور فرمادیں تو وہ جواب دے سکتا ہے۔

اسی طرح اگر آپ چل رہے ہیں تو کوئی آپ سے آگے نہ بڑھے، کھانے کی مجلس ہے تو آپ سے پہلے کھانا شروع نہ کرے مگر یہ کہ آپ کی تصریح یا قرائن قویہ سے یہ ثابت ہوجائے کہ آپ خود ہی کسی کو آگے بھیجنا چاہتے ہیں جیسے سفر اور جنگ میں کچھ لوگوں کو آگے چلنے پر مامور کیا جاتا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ علماء ومشائخِ دین کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ وہ وارث انبیاء ہیں اور دلیل اس کی یہ واقعہ ہے کہ ایک دن حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آگے چل رہے ہیں تو آپ نے تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ کیا تم ایسے شخص کے آگے چلتے ہو جو دنیا وآخرت میں تم سے بہتر ہے اور فرمایا کہ دنیا میں آفتاب کا طلوع وغروب کسی ایسے شخص پر نہیں ہوا جو انبیاء کے بعد ابوبکر سے بہتر وافضل ہو۔ (روح البیان از کشف الاسرار)

اس لئے علماء نے فرمایا کہ اپنے استاد اور مرشد کے ساتھ بھی یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہئے۔

عالم اپنی قوم میں مثل نبی کے ہوتا ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرَاتِ اَکْثَرُھُمْ لاَ یَعْقِلُوْنَ۔

اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک تیسرا ادب سکھلایا گیا ہے کہ جس وقت آپ اپنے مکان اور آرام گاہ میں تشریف فرما ہوں اس وقت باہر کھڑے ہو کر آپ کو پکارنا خصوصاً گنوار پن کے ساتھ کہ نام لے کر پکارا جائے یہ بے ادبی ہے، عقل والوں کے یہ کام نہیں۔

امام بغوی نے بروایت قتادہ رضی اللہ عنہ ذکر کیا ہے کہ قبیلہ بنو تمیم کے لوگ جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے جن کا ذکر اوپر آیا ہے، یہ دوپہر کے وقت مدینہ میں پہنچے جب کہ آپ کسی حجرہ میں آرام فرما رہے تھے، یہ لوگ اعراب (دیہات کے لوگ) آدابِ معاشرت سے ناواقف تھے انہوں نے حجرات کے باہر ہی سے پکارنا شروع کردیا، اخرج الینا یامحمد اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس طرح پکارنے کی ممانعت اور انتظار کرنے کا حکم دیا گیا، مسند احمد، ترمذی وغیرہ میں بھی یہ روایت مختلف الفاظ سے آئی ہے (مظہری)۔

صحابہ وتابعین نے اپنے علماء ومشائخ کے ساتھ بھی اسی ادب کا استعمال کیا ہے صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب میں کسی عالم صحابی سے کوئی حدیث دریافت کرنا چاہتا تھا تو ان کے مکان پر پہنچ کر ان کو آواز یا دروازہ پر دستک دینے سے پرہیز کرتا اور دروازہ کے باہر بیٹھ جاتا تھا کہ جب وہ خود ہی باہر تشریف لاویں گے اس وقت ان سے دریافت کروں گا، وہ مجھے دیکھ کر فرماتے کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی، آپ نے دروازہ پر دستک دے کر کیوں نہ اطلاع کردی تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عالم اپنی قوم میں مثل نبی

کے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے نبی کی شان میں یہ ہدایت فرمائی ہے کہ ان کے باہر آنے کا انتظار کیا جائے، حضرت ابوعبیدہ نے فرمایا کہ میں نے کبھی کسی عالم کے دروازہ پر جا کر دستک نہیں دی بلکہ اس کا انتظار کیا کہ وہ خود ہی جب باہر تشریف لاویں گے اس وقت ملاقات کروں گا۔ (روح المعانی)[1]

بغیر علم کے فتویٰ دینا حرام ہے

سوال (۹۱) اگر کوئی شخص جو عالم نہیں ہے کسی شرعی مسئلہ جواز یا عدم جواز کا فتویٰ دے اس کی نسبت کیا حکم ہے؟

الجواب: بغیر علم کے فتویٰ دینا حرام ہے اور جو شخص اس کے غلط فتوے پر عمل کرے گا اس کا گناہ بھی اس مفتی کے سر رہے گا، اور کفارہ اس گناہ یہ ہے کہ اپنے فتوے کے غلط ہونے کا اعلان کرے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے۔[2]

---

[1] معارف القرآن سورۃ حجرات پ۲۶ ص۱۰۲ ج۸ [2] امداد المفتین، کتاب العلم ص۱۹۷

اہل علم اور مفتیوں میں اختلاف ہوتو عوام کیا کریں

بہت سے لوگ جو اس حقیقت سے واقف نہیں وہ مذاہب فقہاء اور علماء حق کے فتووں میں اختلاف کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کو یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ علماء میں اختلاف ہوتو ہم کدھر جائیں حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ جس طرح کسی بیمار کے سلسلہ میں ڈاکٹروں، طبیبوں کا اختلاف رائے ہوتا ہے تو ہر شخص یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان میں سے فنی اعتبار سے زیادہ ماہر اور تجربہ کار کون ہے بس اس کا علاج کرتے ہیں۔

دوسرے ڈاکٹروں کو برا نہیں کہتے، مقدمہ کے وکیلوں میں اختلاف ہوجاتا ہے تو جس وکیل کو زیادہ قابل اور تجربہ کار جانتے ہیں اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں، دوسروں کی بدگوئی کرتے نہیں پھرتے، یہی اصول یہاں ہونا چاہئے، جب کسی مسئلہ میں علماء کے فتوے مختلف ہوجائیں تو مقدور بھر کوشش کرنے کے بعد جس عالم کو علم اور تقویٰ میں دوسروں سے زیادہ افضل سمجھیں اس کی اتباع کریں اور دوسرے علماء کو برا بھلا کہتے نہ پھریں۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے کہ ماہر مفتی کا انتخاب اور درصورت اختلاف ان میں سے اس شخص کے فتوے کو ترجیح دینا جو اس کے نزدیک علم اور تقویٰ میں سب سے زیادہ ہو، یہ کام ہر صاحب معاملہ مسلمان کے ذمہ خود لازم ہے، اس کا کام یہ تو نہیں کہ علماء کے فتووں میں کسی فتوے کو ترجیح دے، لیکن یہ اسی کا کام ہے کہ مفتیوں اور علماء میں سے جس کو اپنے نزدیک علم اور دیانت کے اعتبار سے زیادہ افضل جانتا ہے اس کے فتوے پر عمل کرے مگر دوسرے علماء اور مفتیوں کو برا کہتا نہ پھرے، ایسا عمل کرنے کے بعد اللہ کے نزدیک وہ بالکل بری ہے اگر حقیقۃً کوئی غلطی فتویٰ دینے والے سے ہو بھی گئی تو اس کا وہی ذمہ دار ہے۔[1]

[1] معارف القرآن، سورۂ انعام ۳/۳۶۶۔

مآخذ ومراجع

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی جن تصانیف اور مجموعۂ ملفوظات ومواعظ ومکاتیب سے اس کتاب کے مضامین ماخوذ ہیں ان کی فہرست

اتباع المنیب
(۲)احکام المال
(۳) آداب انسانیت
(۴) آداب التبلیغ
(۵) آداب المعاشرت
(۶)الارتیاب والاغتیاب
(۷)ارضاء الحق
(۸)ازالۃ الفتنہ
(۹)اسباب الفتنہ
(۱۰)الاسلام الحقیقی
(۱۱)اشرف الجواب
(۱۲)اشرف
(۱۳)اشرف المعمولات
(۱۴)اصلاح اعمال
(۱۵)اصلاح ذات البین
(۱۶)اصلاح انقلاب
(۱۷)الافاضات الیومیہ
(۱۸)الغاء المجازفۃ
(۱۹)امداد الفتاویٰ
(۲۰)بدائع
(۲۱)برکات رمضان
(۲۲)بوادر النوادر
(۲۳)التبلیغ
(۲۴)تجدید تعلیم وتبلیغ
(۲۵)تسلیم ورضا
(۲۶)تعظیم العلم
(۲۷)تعلیم الدین
(۲۸)تقلیل الاختلاط
(۲۹)التکشف عن مہمات التصوف
(۳۰)جزاء وسزا

(۳۱)جزل الکلام فی عزل الامام
(۳۲)جمال الجلیل
(۳۳)حسن العزیز
(۳۴)حق الطاعت
(۳۵)حقوق الزوجین
(۳۶)حقوق العلم
(۳۷)حقوق وفرائض
(۳۸)حکیم الامت نقوش وتاثرات
(۳۹)الحیلۃ الناجزۃ
(۴۰)دعوات عبدیت
(۴۱)الدوام علی الاسلام
(۴۲)ذکر وفکر
(۴۳)ذم المکرُ وہات
(۴۴)زوال السِنۃ عن اعمال السَنۃ
(۴۵)سنت ابراہیم
(۴۶)السوال
(۴۷)الصالحون
(۴۸)الصبر والصلوٰۃ
(۴۹)عضل الجاہلیۃ
(۵۰)فضائل صوم وصلوٰۃ
(۵۱)الفضل العظیم
(۵۲)فیوض الخالق
(۵۳)القول الجلیل
(۵۴)الکلام الحسن
(۵۵)کلمۃ الحق
(۵۶)کمالات اشرفیہ
(۵۷)الکمال فی الدین
(۵۸)مجالس حکیم الامت
(۵۹)مجالس الحکمت
(۶۰)محاسن اسلام
(۶۱)المرابطہ
(۶۲)مزید المجید
(۶۳)معمولات اشرفیہ
(۶۴)ملفوظات حکیم الامت
(۶۵)ملفوظات دعوات عبدیت
(۶۶)نظام شریعت
(۶۷)ومضان فی رمضان

(۱) ابن ماجہ
(۲) بخاری شریف
(۳) البلاغ مفتی اعظم نمبر
(۴) بیان القرآن
(۵) تذکرۃ الخلیل
(۶) تذکرۃ الرشید
(۷) تلاش راہِ حق
(۸) جواہر الفقہ
(۹) خوان خلیل
(۱۰) درمختار
(۱۱) ردالمحتار (شامی)
(۱۲) فتاویٰ ابن تیمیہ
(۱۳) فتاویٰ خلیلیہ
(۱۴) مشکوٰۃ شریف
(۱۵) معارف القرآن